فقہائے ہند

جلد دوم

نویں صدی ہجری

محمد اسحاق بھٹی

اِدارۂ ثقافتِ اسلامیہ

"فقہائے ہند" کی اس جلد میں نویں صدی ہجری کے ایک سو پانچ ہندی علما و فقہا کے علمی اور فقہی کارناموں کو پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ان علمائے کرام کی تصنیفی، تدریسی اور تبلیغی مساعی کو مستند مراجع و مصادر کے حوالے سے بالتفصیل بیان کیا گیا ہے اور اس امر کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ مسلمان امرا و سلاطین اپنے دور کے علما و فقہا کو کس عقیدت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ مصنف نے کتاب کے مقدمے میں نویں صدی ہجری کے ہندی سلاطین کی زندگی کے علمی اور دینی پہلوؤں کو بھی بطور خاص اجاگر کیا ہے۔

فقہائے ہند

جلد دوم

نویں صدی ہجری

محمد اسحاق بھٹی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

بار اوّل .. .. جون ۱۹۷۵

تعداد ۱۱۰۰

محمد اشرف ڈار (اعزازی افسر انتظامی) نے اشرف پریس ۷ ایبک روڈ، لاہور سے چھپوا کر
ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ، لاہور سے شائع کیا

فہرستِ مضامین

ض

ع

غ

ف

ق

ک

م

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ہ

مقدّمہ

یہ سلسلۂ فقہائے ہند کی دوسری جلد ہے جو بتوفیقِ الٰہی معزز قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ جلد نویں صدی ہجری کے ان لائقِ احترام فقہا و محدثین کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے جو برِصغیر پاک و ہند میں پیدا ہوئے، یا اس سرزمین میں کسی اور ملک سے تشریف لائے اور پھر یہیں اقامت گزین ہو گئے۔

قدیم مؤرخین کے نزدیک "ہند" سے مراد وہ خطۂ ارض ہے جو آج پاکستان ہندوستان اور بنگلہ دیش کے نام سے موسوم ہے اور اس کتاب میں اپنی محدود معلومات کے مطابق ان ہی تینوں ملکوں سے تعلق رکھنے والے فقہائے کرام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کو "فقہائے ہند" کے نام سے اس لیے موسوم کیا گیا ہے کہ اس خطے کو اسلامی تاریخ میں ہند سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ فقہائے کرام متعدد والیانِ ہند کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ سو سال کے اس طویل عہد میں بہت سے ملوک و امرا، تختِ ہند پر متمکن ہوئے۔ اس پر طوائف الملوکی کا دور بھی آیا، جس میں یکے بعد دیگرے کئی حکمران آئے اور اپنی مدتِ حکمرانی ختم کر کے اپنے کارناموں کے نقوش تاریخ کے حوالے کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان میں سے بعض نقوش بہت دھندلے دکھائی دیتے ہیں اور بعض بڑے نمایاں نظر آتے ہیں اور تاریخ کا ایک مستقل باب بن گئے ہیں۔ ایک ہی وقت میں ملک کے مختلف حصوں میں، مختلف حکمرانوں نے بھی دادِ حکومت دی، لیکن ہمیں اس موقع پر تاریخ برصغیر کی اس سرگزشت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب باتیں ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ یہاں ہم اختصار کے ساتھ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کن کن حکمرانوں کے عہد میں کون کون علما و فقہا پیدا ہوئے۔ انھوں نے کیا فقہی اور علمی خدمات انجام دیں، ان فقہا و ملوک کے باہمی تعلقات کی کیا نوعیت

تھی۔ یہ حکمران ان کو کس درجہ عزت و احترام کی نظر دیکھتے تھے۔ ان کی باتوں پر کہاں تک عمل پیرا ہوتے تھے، ان سے ان کی عقیدت و مودّت کے حدود کتنے وسیع تھے۔ ان کے زمانے میں علم فقہ کو کس قدر ترقی ہوئی اور تحریری یا تدریسی طور پر یہ علم کہاں تک آگے بڑھا۔ پھر اس ضمن میں دیگر اسلامی علوم و فنون کے ارتقا کی کیا کیا صورتیں ظہور میں آئیں، تصنیف و تالیف کے دائرے کہاں تک پھیلے، مشکل و پیچیدہ مسائل کے حل و کشود کی کیا کیا شکلیں نظر و بصر کے سامنے آئیں اور دقیق علمی و فنی مباحث کو علما و فقہا نے کس اسلوب سے سلجھانے کی کوششیں کیں۔

امیر تیمور لنگ

اس ضمن میں ہم سب سے پہلے امیر تیمور لنگ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں اور بتانا چاہتے ہیں کہ یہ مغل حکمران علما و فقہا سے کس قسم کے تعلقات و روابط رکھتا تھا اور اس کے دل میں ان کی کیا قدر و منزلت تھی۔ تیمور اگرچہ ہندوستان کا باقاعدہ بادشاہ اور حکمران نہ تھا مگر اس نے اس ملک پر حملہ کر کے اس کے بہت سے حصے کو اپنے زیرنگین کر لیا تھا۔ اور بعض ہندی علما و فقہا سے اس کی ملاقات اور گفتگو بھی ہوئی تھی، لہٰذا مقدمۂ کتاب میں اس کے بارے میں چند باتیں بیان کرنا ضروری ہے۔

تیمور، ترکی لفظ ہے جس کے معنی فولاد کے ہیں۔ اس کو لنگ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی صحرائی زندگی کے زمانے میں ایک چرواہے نے تیر مار کر اس کی ٹانگ کو زخمی کر دیا تھا اور یہ لنگڑا ہو گیا تھا۔ یہ ۲۵ شعبان ۷۳۲ھ کو ”خواجہ ایلغار“ نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوا جو اعمال کش یا کس میں واقع ہے اور ماوراالنہر کا ایک سرسبز و شاداب مقام ہے۔ وہ ماں کی طرف سے چنگیز خاں کی اولاد سے تھا۔ اس زمانے میں بلخ اور بلادِ خراسان پر سلطان حسین دادِ حکومت دیتا تھا۔ تیمور کا باپ ترغائی خاں اس بادشاہ کی فوج میں ملازم تھا۔ بعد میں خود تیمور بھی اس کے مقربین و وزرا میں شامل ہو گیا۔ آہستہ آہستہ اس نے سلطان حسین کے دربار میں اس درجہ اثر و رسوخ حاصل

کرلیا کہ حسین نے اپنی بیٹی اس کے عقد میں دے دی، جس کی وجہ سے اس کو تیمور گورگان کہا جانے لگا۔ ترکی زبان میں لفظ گورگان کے معنی داماد کے ہیں اور اس کا یہ لقب اس لیے پڑا کہ یہ شاہی خاندان کا داماد تھا۔

تیمور کی بادشاہت

چالیس آدمی اس کے ابتدائی دور کے دوست اور ساتھی تھے جو بڑے بہادر چالاک اور سازشی تھے، ان میں عباس شاہ جہان، قماری، جاکو اور سیف الدین بھی شامل تھے۔ انھوں نے حسین کی بادشاہت ختم کرنے اور تیمور کو اس کی جگہ بادشاہ بنانے کا خفیہ طور سے ایک منصوبہ بنایا۔ چنانچہ ان لوگوں نے دریائے جیحون عبور کرکے تخشب اور بدخشاں پر قبضہ کرلیا۔ سلطان کو پتا چلا تو جیحون کے کنارے اس کا لشکر مزاحمت کے لیے آگے بڑھا لیکن ان کی سازش کا سلسلہ بڑا مضبوط اور وسیع تھا، انھوں نے کچھ لوگوں کی مدد سے سلطان کی فوج کا باقاعدہ مقابلہ کیا اور اس کو شکست دی۔ پھر بلخ پر حملہ کرکے سلطان حسین کو قتل کردیا اور سمرقند کو دارالسلطنت بنا کر تیمور کی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ اب ماوراالنہر کے تمام شہروں خوارزم، ہرات، بلادِ خراسان، عراق اور ملک شام کی سرحدوں تک پھیلے ہوئے عجم کے سارے علاقوں پر چند ہی روز میں تیمور کا پرچم اقتدار لہرانے لگا۔ اس کے علاوہ اس نے اور بھی بہت سے علاقے اپنے قبضے میں کرلیے۔ مگر ہمیں اس کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس نے اپنی عنانِ توجہ ہندوستان کی طرف بھی مبذول کی۔

ہندوستان پر حملہ

یہ دور ہندوستان میں طوائف الملوکی کا دور تھا اور فیروز شاہ تغلق (متوفی ۷۹۰ھ) کی وفات کے بعد اس ملک میں کوئی مضبوط حکومت قائم نہ ہوسکی تھی۔ آج ایک حکمران ہے تو کل دوسرا اس کی جگہ لے لیتا تھا۔ اس صورتِ حال سے اگرچہ تیمور بے خبر نہ تھا، تاہم وہ واقعات کی صحیح تصویر سے مطلع ہونا چاہتا تھا۔ اسی اثنا میں اس نے اپنے وزرا و مصاحبین سے مشورہ کیا کہ اسے چین پر حملہ کرنا چاہیے یا ہندوستان پر؟۔ انھوں نے

اس کو ہندوستان کی طرف رخ کرنے سے روکا اور اس کے چار سبب بیان کیے۔

اول۔ پنجاب کے دشوار گزار دریا۔

دوم۔ جنگلوں کی کثرت۔

سوم۔ صحرائی باشندوں کی لوٹ مار۔

چہارم۔ جنگلی ہاتھیوں سے مقابلہ۔

مشیروں نے کہا کہ ہندوستان پر حملہ کرنا آسان نہیں ہے۔ یہ چار موانع قدم قدم پر بادشاہ کے لیے پریشانی کا موجب بنیں گے۔ لیکن شاہزادہ شاہ رخ مرزا اس مشورے پر عمل کرنے کا حامی نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر صورت میں ہندوستان پر چڑھائی کی جائے۔ اب تیمور نے فوج سے مشورہ کیا تو وہ بھی اس پر آمادہ نہ تھی۔ تیمور چونکہ فتح ہند کا مصمم عزم کر چکا تھا اور اس ضمن میں مشیروں اور شہزادوں کا اختلاف اس کے لیے ذہنی پریشانی کا موجب تھا، اس لیے اس نے قرآن مجید کی طرف رجوع کیا اور فال نکالی تو یہ آیت سامنے آئی۔ یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ ـــــ (کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو۔) یہ آیت سنتے ہی سب نے سر جھکا لیا اور چپ ہو گئے۔ اس کا مطلب ان کی رضامندی اور تیمور کی تائید تھا۔ دوبارہ صلاح و مشورہ کے بعد قرار پایا کہ امیرزادہ پیر محمد جہاں گیر کو جو کہ کابل کا حکمران اور تیمور کا پوتا تھا، تیس ہزار سواروں کے ساتھ کوہ سلیمان کے راستے ہندوستان بھیجا جائے اور وہ صوبہ ملتان پر حملہ کر کے اس کو فتح کرے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

کچھ عرصہ بعد تیمور کو پیر محمد کا خط ملا، جس نے ربیع الاول ۸۰۰ھ میں ہندوستان پر حملہ کیا تھا اور دریائے سندھ عبور کر کے قلعہ اوچ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اس نے تفصیل سے لکھا کہ ہندوستان کے حالات بادشاہ کے لیے نہایت سازگار ہیں۔ یہاں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی ہے اور میں اوچ، تلمبہ اور ملتان کو فتح کر چکا ہوں، آپ بلا تاخیر اس پر حملہ بول دیں۔

یہ خط دیکھتے ہی اس نے ہندوستان پر چڑھائی کر دی اور ۸۰۰ھ کے موسم بہار کے

آغاز میں وہ کوہ ہندوکش سے اُتر کر کابل آیا۔ وہاں سے سرکنڈوں کا پل بنا کر دریائے اٹک اور جہلم کو عبور کیا اور تمام علاقوں کو روندتا اور کچلتا ہوا انتہائی تیزی کے ساتھ دریائے بیاس کے کنارے آپہنچا۔ پھر ملتان، اجودھن (پاک پٹن) اور مختلف شہروں اور قلعوں کو فتح کر کے سمانہ کے راستے دہلی کی طرف متوجہ ہوا۔ دہلی کا حکمران اس زمانے میں سلطان محمود تھا۔ وہ اس کی آمد کی خبر سن کر وہاں سے فرار ہو گیا۔

دہلی پر قبضہ اور قتل عام

اب دہلی کا تخت تیمور کا منتظر تھا اور وہ بغیر کسی مزاحمت کے جمادی الاولیٰ ۸۰۱ھ میں دہلی پر قابض ہو گیا۔ وہاں اس نے قتلِ عام شروع کر دیا اور لوگوں کی بہت بڑی تعداد کو قید میں ڈال دیا جن میں علما و فقہا، امرا، زعما اور متعدد سرکردہ لوگ شامل تھے۔ اس کے بعد وہ جامع مسجد میں گیا اور علما و مشائخ کو جمع کر کے معذرت کی کہ میں تو درحقیقت جہاد کی غرض سے آیا تھا، لوگوں کو قتل کرنا میرا مقصد نہ تھا، مجبور ہو کر یہ اقدام کرنا پڑا۔ بس خدا کو یہی منظور تھا۔ کہتے ہیں یہ معذرت اس کو اس لیے کرنا پڑی کہ جب وہ دہلی میں داخل ہوا تو باشندگانِ شہر سے بہت سا مال و دولت لے کر ان کو امان دے دی تھی اور امرا و زعما سے بڑے بڑے نذرانے بھی وصول کر لیے تھے۔ اس اثنا میں لشکرِ تیمور کے چند سپاہیوں کو شہر والوں نے قتل کر دیا۔ یہ چیز تیمور کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ چنانچہ اس نے قتل عام کا حکم دے دیا اور بہت سے لوگوں کو گرفتار کر کے حوالۂ زنداں کر دیا اور ایک بڑی تعداد کو ماوراء النہر بھیج دیا۔

شیخ احمد تھانیسری تیمور کے دربار میں

ان گرفتار ہونے والوں میں مشہور عالم و فقیہ شیخ احمد تھانیسری بھی تھے، ان کے ساتھ اور بھی بہت سے علما و فقہا کو جیل میں محبوس کر دیا گیا تھا۔ رہائی کے بعد تیمور سے ان کی ملاقات ہوئی تو تیمور ان کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا۔ ماوراء النہر سے جو علمائے کرام تیمور کے ساتھ آئے تھے، ان میں صاحبِ ہدایہ شیخ برہان الدین مرغینانی کے پوتے بھی شامل تھے جو سلطنتِ تیمور میں ماوراء النہر کے شیخ الاسلام تھے۔ دربارِ تیمور میں ان سے

اور ماوراءالنہر کے دیگر علما سے بعض فقہی مسائل پر شیخ احمد تھانیسری کی گفتگو ہوئی تو شیخ نے ان سب کو علم اور دلائل کے زور سے لاجواب کر دیا۔ تیمور ان کی گفتگو اور علمیت و فقاہت سے اس درجہ اثر پذیر ہوا کہ اس نے ان سے اپنے ساتھ ماوراءالنہر تشریف لے جانے کی استدعا کی، مگر انھوں نے انکار کر دیا اور تیمور سے باقی لوگوں کی رہائی کے لیے درخواست کی، جو اس نے منظور کر لی اور سب قیدیوں کو رہا کر دیا۔ بلاشبہ اہلِ ہند پر شیخ احمد تھانیسری کا یہ بہت بڑا احسان تھا۔ آئندہ اوراق میں ان کے حالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

دہلی سے ہردوار تک

تیمور پندرہ روز دہلی میں مقیم رہا۔ اس کے بعد اس نے میرٹھ کا قصد کیا، پھر مختلف قلعوں اور شہروں کو مسخر کرتا ہوا دریائے گنگا کے کنارے جا کر خیمہ زن ہوا۔ وہ ہردوار پہنچ چکا تھا اور ہندوستان کے مشرقی علاقوں کی طرف بڑھنے کا عزم کر رہا تھا کہ وہاں قیصر روم یعنی قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ کا ایلچی اس کا ایک خط لے کر اس کے پاس آیا۔ وہ خط اس مضمون پر مشتمل تھا کہ عثمانی حکمران سلطان بایزید یلدرم ہمارے شہر قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والا ہے اور قسطنطنیہ ہماری ایک پرانی سلطنت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی قائم تھی۔ پھر خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی قائم رہی اور کسی نے اس پر حملہ نہیں کیا۔ اس کے بعد بنو اُمیہ اور بنو عباس کے عہد میں بھی اس کو اہلِ اسلام کی طرف سے کوئی گزند نہیں پہنچا اور سب سے ہماری صلح رہی۔ اب عثمانی بادشاہ سلطان بایزید یلدرم نے اس کو فتح کرنے کا ارادہ کر لیا ہے، وہ ہمارے بہت سے علاقے اپنے زیرِ نگین کر چکا ہے۔ ان علاقوں پر اس کو صبر نہیں آیا تو اب قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی ٹھان لی ہے۔ سلطان احمد جلائر اور قرا یوسف ترکمان بھی اس کے ساتھ ہیں جو آپ کے مفرور باغی ہیں اور بایزید نے ان باغیوں کو بڑی عزت و احترام کے ساتھ اپنے پاس مہمان رکھ چھوڑا ہے۔ قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے بعد وہ آپ کی سلطنت پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اگر قسطنطنیہ کی طرف اس کی پیش قدمی کو نہ روکا گیا تو آئندہ یہ آپ کے لیے شدید خطرے کا باعث ثابت ہوگا۔

سمرقند کو واپسی اور بایزید یلدرم سے جنگ

قیصر قسطنطنیہ کا یہ خط پڑھ کر بظاہر اس کو کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا اور قاصد کو فوراً ہی رخصت کر دیا لیکن، اس کے مندرجات نے اندر ہی اندر اس کو بہت متاثر کیا۔ اور وہ ہندوستان کے اس نو مفتوحہ ملک کو بلا کسی معقول انتظام کے اسی حالت میں چھوڑ کر ہردوار سے روانہ ہوا اور جلد جلد منزلیں طے کرتا ہوا پنجاب میں داخل ہوا، اور لاہور پہنچا۔ لاہور فتح کیا اور اپنے معمول کے مطابق اس میں لوٹ مار کی اور جلد ہی سمرقند کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس وقت ایک لاکھ ہندوستانی اس کے قبضے میں تھے، جن کو وہ قیدی کی حیثیت سے اپنے ساتھ سمرقند لے جا رہا تھا۔ ان قیدیوں کو اس نے اس طویل سفر میں گراں باری کا موجب گردانا اور راستے ہی میں ان کو قتل کرا دیا اور بہت جلد سمرقند پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک طرف تو بایزید یلدرم کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ دوسری جانب بایزید کی حلیف سلطنتوں شام اور مصر وغیرہ پر یلغار کر دی اور حلب، دمشق، شام اور مصر پر قبضہ کر لیا۔ بایزید یلدرم اس سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا کیوں کہ اس کا مقصد کسی مسلمان حکومت سے پنجہ آزمائی کرنا نہ تھا بلکہ اس کی نظریں قسطنطنیہ پر لگی ہوئی تھیں اور دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ کم سے کم مدت میں اپنے گھوڑے قسطنطنیہ میں باندھے گا۔ مگر تیمور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ قسطنطنیہ پر حملہ کرنے سے پیشتر میرے اور تمہارے درمیان یہ فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ دنیا کے فاتح تم بننا چاہتے ہو یا میں۔ بایزید اب بھی درگزر سے کام لے رہا تھا اور اس کے ساتھ جنگ سے گریزاں تھا مگر تیمور قابو سے باہر ہو چکا تھا۔ اس نے بایزید کو مشتعل کرنے کے لیے ایک سرحدی شہر سیواس پر حملہ کر دیا، جہاں اس کا بیٹا ارطغرل خاں بطور والی شہر موجود تھا۔ اس نے ارطغرل خاں اور بہت سے ترک اہل کاروں اور فوجیوں کو نہایت بے دردی سے قتل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بایزید اشتعال میں آ گیا اور نتیجتاً ۱۹ ذی الحجہ ۸۰۴ھ کو تیمور اور بایزید کے درمیان انگورہ کے مقام پر نہایت ہولناک جنگ ہوئی اور تیمور نے بایزید کو گرفتار کر کے آہنی پنجرے

میں بند کر دیا۔ تیمور اس کو ساتھ ساتھ لیے پھرتا رہا۔ وہ آٹھ مہینے تک پنجرے میں بند رہا اور اسی حالت میں انتقال کر گیا۔ اور جو کام وہ ۸۰۴ھ میں خود کرنا چاہتا تھا وہ اس کی موت سے ترپین ۵۳ سال بعد ۸۵۷ھ میں اس کے پوتے محمد خاں ثانی نے کیا اور وہ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد تاریخ میں سلطان محمد خاں ثانی فاتح قسطنطنیہ کے نام سے معروف ہوا۔

ہندوستان پر حملے کے دو مقصد

تیمور اپنے ملفوظات میں ہندوستان پر فوج کشی کے دو مقصد بیان کرتا ہے۔ ایک بت پرست دشمنانِ اسلام سے جنگ، دوسرے ان کے مال و دولت کو لوٹ کر سپاہِ اسلام کے لیے اسبابِ معیشت کی فراہمی۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ اس کا عمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ کیونکہ جس زمانے میں یہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا، اس زمانے میں اس ملک پر مسلمانوں کی حکومت تھی اور اس نے ان ہی سے جنگ لڑی، ان ہی کو قتل کیا ان ہی کو قید میں ڈالا، ان ہی کے مال و دولت کو لوٹا۔ اس کے بعد مصر، شام، حلب ... س، بغداد وغیرہ میں بھی مسلمان حکومتوں پر یلغار کی اور وہاں کے باشندوں کو تہ تیغ کیا۔ انگورہ کے میدان میں بھی عثمانی حکمران کو نشقِ ستم بنایا۔ یعنی یہ جہاں گیا مسلمانوں کے خلاف لڑا۔

تیمور کی زندگی کا ایک اور پہلو

بہر حال اس موقع پر ہم ان واقعات کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ یہاں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ ہے علما و فقہا سے اس کے تعلقات و روابط اور علم اور اصحابِ علم سے محبت نوازی کا پہلو۔ اور اس موقع پر ہم اس کے اسی پہلو کو اپنے معزز قارئین کے علم میں لانا چاہتے ہیں، کیونکہ ہمارا اصل موضوع یہی ہے۔

تیموری سلاطین کی علم پروری اور ادب نوازی

تیموری سلاطین بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ فاتح اور کشور کشا بھی تھے۔

اور علم پرور اور ادب نواز بھی۔ ان کا دربار ہر فن کے اصحابِ کمال اور علما و شعرا کا مرکز تھا۔ اس خاندان کا پہلا حکمران تیمور تھا، جس نے ہندوستان پر بھی حملہ کیا، اس کی زندگی کا ایک رُخ اگر ظلم و ستم اور قتل و غارت گری کا آئینہ دار ہے تو دوسرا رُخ اس کی علم پروری، علما سے مراسم، فقہا سے روابط، بزرگانِ دین سے محبت اور مشائخ کرام سے الفت کا اظہار بھی کرتا ہے۔

علوم دینیہ کی ترویج

وہ اپنی تزک میں خود لکھتا ہے:

مَیں نے اپنی سلطنت کی بنیاد، دینِ اسلام کے آئین اور قوانین پر رکھی، کیوں کہ مَیں جانتا تھا کہ جس قوم کی بنیاد کسی قسم کی تنظیم، نظم و ضبط اور آئین و قوانین پر مبنی نہ ہو وہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ مَیں نے دینِ حق کے پھیلانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ تمام مسلمانوں کا ایک صدر مقرر کر دیا جو ان سے اوقات کی پابندی کراتا، متولیانِ مساجد اور امورِ دین کا تقرر عمل میں لاتا، قاضیوں، مفتیوں اور محتسبوں کا تعین کرتا اور علما و مشائخ کے لیے جاگیریں اور وظیفے مقرر کرتا تھا۔ فوج، رعایا، نیز ہر ملک اور ہر صوبے کے لیے ایک الگ صدر مقرر تھا، جو کہ مسلمانوں کو گناہ سے بچنے اور نیکی اختیار کرنے کی دعوت دیتا تھا۔ مَیں نے تمام شہروں میں مسجدیں اور عبادت گاہیں تعمیر کرائیں، اس کے علاوہ ہر شہر میں مدارس کھولے جن میں قابل اور نامور اساتذہ مسلمانوں کو علوم دینیہ کا درس دیتے تھے۔[1]

علما و مشائخ کی قدردانی

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ میری سلطنت کے مضبوط و مستحکم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مَیں نے اس میں بارہ قسم کے لوگ شامل کیے، جن میں پہلا گروہ علمائے کرام کا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"اوّل گروہ سادات، علما، مشائخ اور فضلا کا تھا جو اکثر میرے پاس آتے رہتے تھے، مَیں نے ان کو اپنی مجلس کی زینت بنایا، جہاں وہ ہر قسم کے علوم کی

---

[1] تزکِ تیموری، ص ۷۷، ۷۸

تبلیغ کرتے تھے اور میں ان سے مسائل وغیرہ پوچھا کرتا تھا[۵۲]

علما و فضلا کا مرتبہ

تیمور کے دربار میں علما و فضلا کو ان کے مرتبے کے مطابق جگہ ملتی تھی۔ اس ضمن میں وہ خود رقم طراز ہے:

"انعقادِ دربار کا طریقہ یہ تھا کہ میرے بیٹے، پوتے اور اعزہ و اقارب تختِ سلطنت کے اردگرد صف بستہ بیٹھے تھے۔ علما و فضلا، مشائخ و اکابر دائیں طرف اور امرا، سردار، قشونات، تومانات، بیگ باشی، یوزباشی اور اون باشی بائیں طرف مسند نشین ہوتے تھے"[۵۳]

باد شاہوں کے فرائض

وہ قانونِ ملک گیری کی بھی وضاحت کرتا ہے اور اس باب میں بادشاہوں کو اپنے فرائض کی طرف ان الفاظ میں متوجہ کرتا ہے:

"ملک گیری کے لیے بادشاہوں کو لازم ہے کہ وہ ہر ایسے ملک کو فتح کریں جس میں ظلم و ستم عام ہو، مظلوموں کی داد رسی کرنے والا کوئی نہ ہو، عادل کوئی نہ ہو اور حکام ناانصاف ہوں، فسق و فجور کا دور دورہ ہو، خداوند کریم کا دین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کمزور پڑ چکی ہو، جہاں نیک و بد کا امتیاز نہ رہا ہو، رعایا اپنے عمّال سے بے زار اور تکلیف میں ہو اور ان سے مطمئن نہ ہو۔ اور جس طرح اللہ کے اپنے بندوں پر کچھ حقوق ہیں۔ اسی طرح بندوں کے بھی بندوں پر کچھ حقوق ہیں۔ لہٰذا یہ چیز حقوق العباد میں داخل ہے، اور ایک بادشاہ پر حقوق العباد کی حیثیت میں جو حقوق فرض ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ جہاں کہیں بھی خدا کی اس سرزمین میں ظلم و ستم ہوتا دیکھے، یا شر اور فساد کو عام پائے تو ان کا قلع قمع کرکے وہاں کے حالات کو پُرامن بنائے اور لوگوں کو تکلیفوں سے نجات دلائے"[۵۴]

---

۵۲ تزکِ تیموری، ص ۸۲ ۔ ۵۳ ایضاً، ص ۱۱۶

۵۴ ایضاً، ص ۱۱۶، ۱۱۷

اس سے آگے وہ بادشاہوں کے فرائض کی روشنی میں مختلف ممالک پر اپنے حملوں کی وجہ جواز پیش کرتا ہے اور ہندوستان پر حملے کے بارے میں لکھتا ہے :

"ہندوستان میں وہاں کے حکام سلطان محمود، ملو خاں اور سارنگ کے ہاتھوں بت خانے عام ہو چکے تھے، کفر و شرک کا دور دورہ تھا اور شریعتِ محمدیؐ بالکل کمزور ہو چکی تھی، میں نے ہندوستان پر حملہ کر کے اس کو نااہل حکمرانوں کے قبضے سے نجات دلائی اور کفر و شرک اور بدعت کو ختم کر کے شریعتِ محمدیؐ کو فروغ دیا۔"[۵]

علما و صلحا کی توقیر

وہ قواعد و قوانینِ ملک داری کے تحت، علما و مشائخ کی عزت و توقیر کے بارے میں تحریر کرتا ہے :

"میں جس ملک کو فتح کرتا، وہاں کے معزز لوگوں مثلاً علما و فضلا اور صلحا وغیرہ کی عزت و توقیر کرتا۔۔ ان کے بڑوں کو اپنا بھائی اور چھوٹوں کو اپنا فرزند سمجھتا اور ان کے لیے جاگیریں اور وظیفے مقرر کرتا۔"[۶]

مشائخ اور درویشوں کے لیے وظائف

رعایا سے وہ کس قسم کا سلوک روا رکھتا تھا، اس کے بارے میں وہ کہتا ہے :

"اپنے کسی مفتوحہ ملک سے جو لوگ میرے پاس امداد یا پناہ کی غرض سے آتے تھے، ان سب کے لیے میں نے ملازمت اور روزگار کا انتظام کیا۔ ان کو لوٹ مار اور قتل و غارت سے بچایا۔ ان ہی کے ملک سے حاصل شدہ مالِ غنیمت کو ضبطِ تحریر میں لا کر اس میں سے ان کی امداد کی۔ ان کے سادات و مشائخ اور علما و فضلا کی قدر دانی اور عزت افزائی کی۔ نیز ان میں سے جو لوگ ٹیکس وغیرہ دینے کی استطاعت رکھتے تھے، ان سے ان کی مالی حیثیت کے مطابق ٹیکس وصول کیا اور اس ٹیکس کی جمع شدہ آمدنی میں سے ان کے غربا، مساکین، مشائخ، فضلا اور درویشوں کے لیے وظائف مقرر کیے تاکہ وہ تنگ دستی

۵۔ تزکِ تیموری، ص ۱۱۷

۶۔ ایضاً، ص ۱۲۰، ۱۲۱

اور در در کی ٹھوکریں کھانے سے محفوظ رہ سکیں"۵۴

محدثین اور ارباب اخبار و قصص

اصحاب علم و فضل اور ارباب فن و کمال خلوت و خلوت میں بھی اس کے ساتھ رہتے اور میدان جنگ میں بھی۔ اس ضمن میں وہ خود لکھتا ہے :

"محدثین اور ارباب اخبار و قصص کو میں اپنے پاس بلاتا، ان سے انبیا، اولیا اور سلاطین کے واقعات سنتا، حکمرانوں کے عروج و زوال کی داستانیں معلوم کرتا، ان کے قصوں اور ان کی گفتار و کردار سے تجربے حاصل کرتا اور دنیا کی تواریخ و آثار سے مطلع ہوتا۔ صوفیا و مشائخ اور عارفانِ خدا سے بھی ملتا اور ان کی صحبت سے فوائدِ اخروی حاصل کرتا، معرفت کی باتیں سنتا، ان کے خوارق عادات و کرامات کا مشاہدہ کرتا اور ان کی مجلس سے سرور حاصل کرتا ..... میرا حکم تھا کہ جو لوگ سادات و علما میں سے ہیں ان کا اعزاز و احترام کیا جائے، ان کی ہر ضرورت کو پورا کیا جائے اور ان کے ساتھ پوری رعایت کی جائے"۵۵

سادات و علما کی تعظیم

اس ضمن میں ملفوظاتِ تیموری کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ وہ کہتا ہے :

"جب میں تلمنبہ پہنچا تو دریا کے ساحل پر خیمہ زن ہوا۔ تلمنبہ ملتان سے تقریباً ستر میل کے فاصلے پر واقع ہے ..... میرے وزرا نے تلمنبہ کے باشندوں پر دو لاکھ روپے کا تاوان عائد کیا تھا۔ اس کی وصولی کے لیے عمال بھی مقرر ہو گئے تھے۔ ان باشندوں میں سادات بھی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے تھے، علمائے اسلام بھی تھے جو وارث پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کہلاتے ہیں۔ سادات و علما میرے دربار میں ہمیشہ تعظیم و اکرام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں، اس لیے میں نے حکم جاری کیا کہ ان سے

---

۵۴ تزکِ تیموری، ص ۱۲۴۔

۵۵ تزکِ تیموری۔ مطبع فتح الکریم بمبئی، ص ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴۔

تاوان نہ لیا جائے بلکہ میں نے ان کو بلا کر خلعت اور عربی گھوڑے عطا کیے"۔ ۵۹

مذکورہ بالا سطور میں دو کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں، جن میں سے ایک کا نام تزکِ تیموری ہے اور دوسری کا ملفوظاتِ تیموری! تزکِ تیموری میں ملکی اور جنگی نظم و نسق کے ضوابط و قوانین درج کیے گئے ہیں، جو خود تیمور کی زبان سے بیان ہوئے ہیں۔ ملفوظاتِ تیموری میں، تیمور کی بہادری و کشور کشائی اور جہان بانی و حکمرانی کی داستان خود اس کی زبانی معرفتِ تحریر میں لائی گئی ہے اور اس کے دربار کے اہلِ علم و اربابِ دانش نے قلم بند کی ہے۔ عین ممکن ہے، ان اقتباسات کو دربارِ تیمور کے اصحابِ قلم کی حاشیہ آرائی سمجھا جائے۔ لیکن اس سلسلے کی ایک کتاب اور ہے جو ظفر نامۂ تیمور کے نام سے موسوم ہے اور شرف الدین یزدی کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب تیمور کی وفات سے تیس سال بعد لکھی گئی، جب کہ نہ تیمور کا رعب و دبدبہ باقی رہا تھا اور نہ اس سے کسی نوع کے لالچ اور حرص کی توقع! اس میں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ امیر تیمور کو علما و فضلا سے بہت تعلق خاطر تھا اور سفر و حضر میں وہ ان سے استفادہ کرتا تھا۔

سفر و حضر میں علما و فقہا کی صحبت

ظفر نامۂ تیمور کے فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

"صاحب قران کے ساتھ سفر و حضر میں برابر سادات، علما، فقہا، اہلِ فضل و دانش نجشیان الفور اور دبیرانِ فارس رہتے تھے۔ فرمانِ شاہی کے مطابق وہ روزمرہ کے واقعات قلم بند کرتے، صاحب قران کے افعال و اقوال، ملک و ملت کے احوال اور ارکان دولت کے کوائف بڑی تحقیق کے ساتھ حیطہ تحریر میں لائے جاتے۔ سخت حکم تھا کہ ہر واقعہ بغیر کسی تصرف اور اضافہ کے لکھا جائے۔ خصوصاً ذاتی اصابت و نجابت کے بیان میں کسی قسم کی رعایت یا مداہنت نہ ہو۔ حتیٰ کہ صاحب قران کی شہامت و شجاعت کے ذکر میں بھی مبالغہ نہ ہو، چنانچہ اس

---

۵۹ بزم تیموریہ، ص ۲۔ ملفوظات تیموری ایلیٹ، ج ۲، ص ۴۲۱

حکم کو سامنے رکھ کر، اصحابِ قلم و بلاغت، واقعات کو نظم و نثر میں مرتب کرتے یہ تحریریں صاحبِ قران کے سامنے پڑھی جاتیں اور وثوق کے ساتھ ان کی تصحیح ہوتی۔ اسی طرح ترکی اور فارسی میں واقعات، نثر اور نظم میں تالیف ہوتے اور بعض وابستگانِ دربار واقعات کی تحقیق و تفتیش میں پوری کوشش کرتے۔۔۔۔۔۔[10]

اصحاب علم میدانِ جنگ میں بھی ساتھ تھے

شرف الدین یزدی کا بیان ہے کہ تیمور جب ہندوستان میں وارد ہوا اور محمود تغلق کے خلاف معرکہ آرا ہوا تو اربابِ کمال اور اصحابِ علم میدانِ جنگ میں بھی اس کے ہمراہ تھے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

درو قتِ تعیین مواضع سروران و اعیان مرحمت حضرت صاحب قران کہ در ہمہ حال شامل احوال اہلِ علم و کمال بودی از جمع علمار فیع مقدار کہ ظفر کردار ملازم رکاب ہمایوں آثار بودند۔ مثل خواجہ افضل پسر مولانا شیخ الاسلام سعید جلال الحق والدین کشی و مولانا عبدالجبار پسر اقضی القضاۃ مولانا نعمان الدین خوارزمی۔۔۔۔۔۔[11]

یعنی تیمور صاحب قران نے جب (ہند) جانے کا قصد کیا تو وہ سربراہانِ علم و فضل اور معاونینِ سلطنت، جو اپنے فضل و کمال میں بے مثل و یکتا تھے، اس کے ہم رکاب تھے اور ان رفیع المرتبت علما کی معیت اس کے لیے باعثِ سعادت تھی۔ مثلاً خواجہ افضل فرزند مولانا سعید جلال الحق والدین کشیؒ اور مولانا عبدالجبارؒ فرزند قاضی القضاۃ مولانا نعمان الدین خوارزمی۔۔۔۔

علما و سادات کے لیے انعامات

تیمور کا معمول تھا کہ وہ ہر لڑائی کے بعد فتح و نصرت کی خوشی میں علما و سادات کو انعام و اکرام سے مالا مال کرتا تھا۔[12]

---

[10] ظفر نامہ ج ۱، ص ۲۴، ۲۵ [11] ایضاً، ج ۲، ص ۱۰۱
[12] بزم تیموریہ ص ۳ بحوالہ ملفوظات تیموری ایلیٹ ج ۳، ص ۴۷۵

پابندیٔ نماز

تزکِ تیموری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نماز کا سخت پابند تھا اور باجماعت نماز ادا کرنے کا عادی تھا۔ اس کا وہ اپنی تزک میں بار بار ذکر کرتا ہے۔

قرآن مجید سے شغف

قرآن مجید سے بھی اس کو بہت شغف تھا اور تزکِ تیموری سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس کی باقاعدہ تلاوت کرتا تھا اور کوئی اہم اور مشکل معاملہ پیش آتا تو وہ فوراً قرآن مجید کی طرف رجوع کرتا اور اس سے فال نکالتا۔ چنانچہ اس نے ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو قرآن مجید سے فال نکالی اور یہ آیت کریمہ اس کے سامنے آئی: یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ ۝[۱۳] (یعنی اے نبیؐ کافروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کرو)

عہدِ تیمور کے علمائے کرام

تیمور ۸۰۰ھ میں سمرقند سے عازمِ ہند ہوا اور ۱۲ محرم ۸۰۱ھ کو آبِ جہلم عبور کر کے اس ملک میں داخل ہوا۔ اس وقت دہلی اور ملک کے دوسرے علاقوں میں بہت سے علما و فقہا موجود تھے۔ تیمور کے مظالم کی داستانیں چونکہ پورے ملک میں پھیل چکی تھیں اس لیے علمائے کرام کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ دہلی کی طرف بڑھ رہا ہے تو بہت سے حضرات اس کی آمد سے قبل ہی جون پور اور کالپی وغیرہ چلے گئے تھے جن میں شیخ احمد بن محمد تھانیسری، شیخ حسام الدین فتح پوری، مولانا خواجگی دہلوی اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ کچھ علمائے کرام سے دہلی میں اس کی ملاقات بھی ہوئی اور وہ ان کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا، ان میں شیخ احمد کھٹو کا اسمِ گرامی لائقِ تذکرہ ہے۔ بعض ہندی علما سے اس کی ملاقات اس زمانے میں ہوئی، جب یہ واپس سمرقند جا چکا تھا۔ ان میں شیخ تقی الدین محمد شیرازی اور مولانا لطف اللہ سبزواری کے اسمائے گرامی کتبِ تاریخ میں مرقوم ہیں۔ شیخ اشرف جہانگیر سمنانی سے

---

[۱۳] تزکِ تیموری، ص ۶۶

بھی اس کی ملاقات ہوئی اور وہ ان سے بے حد ادب و احترام سے پیش آیا اور بہت ہی عقیدت مندی کا اظہار کیا۔ یہ ملاقات حضرت علی رضا کے مرقد پر ہوئی تھی۔

وفات

جنگِ انگورہ کے بعد تیمور چین پر حملہ کرنا چاہتا تھا، لیکن موت نے اس کا موقع نہ دیا۔ اس نے ۷ شعبان ۸۰۷ھ کو وفات پائی۔

شرقی سلاطین

ملک الشرق سرور خواجہ جہاں

فیروز شاہ تغلق ہندوستان کا وہ بادشاہ تھا، جس کے اقتدار کا شامیانہ سارے ملک پر تنا ہوا تھا۔ اس کے عہد حکومت کے آخری دور کی یہ بات شمس عفیف نے افسوس کے ساتھ بیان کی ہے کہ نماز فجر کے لیے ایک درویش جمنا کے کنارے بیٹھا وضو کر رہا تھا ناگہاں اس کی نظر شاہی محل پر پڑی، اس کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھی سے کہا،

میدانی دریں کوشک کیست؟ ..... بلاہائے جملہ عالم زیر پائے اوست۔ آن روز کہ او ازین جہان برود، معلوم جہانیاں شود[۱]

تو جانتا ہے کہ اس کوشک کے اندر کون ہے؟ ..... دنیا کی تمام بلاؤں کو اس نے اپنے پاؤں کے نیچے دبا رکھا ہے، جس دن وہ اس جہان سے چلا جائے گا۔ دنیا والوں کو معلوم ہو جائے گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ فیروز شاہ تغلق کے دربار میں ایک شخص ملک سرور کے نام سے موسوم تھا۔ یہ شخص خواجہ سرا تھا، بعد میں اس کو خواجہ سراؤں کا سردار بنا دیا گیا۔ یہ اس زمانے میں بہت بڑا عہدہ تھا جو دربار کے حاکم سے بھی زیادہ اہم تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس کو داروغہ فیل خانہ مقرر کیا گیا۔ ناصر الدین محمود شاہ بن فیروز شاہ تغلق تختِ حکومت پر متمکن ہوا تو

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی۔ از شمس عفیف ص ۳۸۲، ۳۸۳

اس نے اس کو اپنا وزیر مقرر کر لیا۔ یہ شخص بڑا عقل مند، سمجھدار، سیاست دان، صاحبِ تدبیر، ذہین و فطین اور وفادار تھا، اور ان تمام صلاحیتوں سے بہرہ ور تھا جن کا ایک حکمران میں پایا جانا ضروری ہے۔ محمود شاہ چوں کہ ملک سرور جہاں ہی کی کوششوں سے تختِ دہلی کا وارث بنا تھا، اس لیے وہ اس کی بہت قدر و منزلت کرتا تھا۔ اس نے اس کو متبنّیٰ بنا کر ملک الشرق کا خطاب دیا اور قنوج سے لے کر بہار تک کا سارا علاقہ اس کے سپرد کر دیا۔ وہ ماہِ رجب ۷۹۶ھ میں کول، کھرہ، اٹاوہ، کنبیلہ اور مضافاتِ قنوج سے ہوتا ہوا جون پور میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ اس وقت اچھی خاصی فوج اور بیس ہاتھی تھے۔ وہ انتظام ملکی کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔ اس نے ان بغاوتوں اور شورشوں کو بھی دانشمندی کے ساتھ ختم کر دیا، جن کا سلسلہ ان علاقوں میں مختلف شرارت پسند افراد کی وجہ سے زوروں پر تھا۔ اس نے اپنے علاقے کا نظم و نسق بہترین طریقے سے چلانا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغیر کسی لڑائی جھگڑے اور فوج کشی کے بہت جلد قنوج، کڑہ، سندیلہ، ڈلمئو، بہرائچ، بہار اور ترہٹ وغیرہ اس کے قبضے میں آگئے۔

اس نے اپنا دارالحکومت جون پور کو بنایا اور اس کی حکومت شرقی سلطنت کے نام سے موسوم ہوئی۔ جون پور میں بیٹھ کر اس نے ہندوستان کے اس گوشے میں ایک مثالی حکومت قائم کر دی۔ لکھنوتی، سنار پور اور جاج نگر کے حاکم اور راجے اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ اس کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے جون پور کی شرقی سلطنت سے اپنا الحاق کر لیا اور شاہی رسم و رواج کے مطابق ہر سال جو تحائف اور ہاتھی وہ دہلی بھیجتے تھے، اب جون پور بھیجنے لگے۔

ملک الشرق ملک سرور خواجہ جہاں کی یہ سلطنت بالکل آزاد اور خود مختار سلطنت تھی۔ اس کو "اتابکِ اعظم" کا خطاب بھی ملا تھا، جو بہت بڑا خطاب تھا اور ایران کے ان بادشاہوں کا خطاب تھا، جن کا پایۂ تخت شیراز تھا۔

جون پور کی اس شرقی سلطنت کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے، جس نے آگے

چل کر بڑی شہرت حاصل کی اور جس میں بے شمار مشائخ و صلحا، علما و فقہا اور مصنفین و مدرسین نے سکونت اختیار کی اور جس کو بزرگانِ دین نے اپنے لیے ایک مامن اور قلبی و ذہنی اعتبار سے جائے اطمینان قرار دیا۔ ہماری اس کتاب میں جون پور کے بہت سے علما و فقہا کے اسمائے گرامی قارئین کرام کے مطالعہ میں آئیں گے۔

ملک الشرق سرور خواجہ جہاں نے ایک عقل مندی یہ کی کہ ان لوگوں کو اپنے وزیر و مشیر اور معاون مقرر کیا، جو فہم و تدبر کے ساتھ ساتھ مخلص اور خیر خواہ بھی تھے، اور وہ تھے سید مبارک شاہ اور سید ابراہیم شاہ۔ یہ دونوں حقیقی بھائی تھے اور ان کو خواجہ جہاں نے اپنے متبنّٰی اور منہ بولے بیٹے بنا لیا تھا۔ پھر اس کی وفات کے بعد یہی سلطنتِ شرقی کے حکمران بنے ۔ یہ سید خضر خان کے بھتیجے تھے، جس کو ہندوستان سے سمرقند واپس جاتے وقت امیر تیمور نے دیپال پور اور ملتان وغیرہ علاقوں کا حاکم مقرر کر دیا تھا۔ سید خضر اپنے ان بھتیجوں کا اور ان کی وجہ سے سلطنت جون پور کا بہت بڑا حامی اور مددگار تھا۔

ملک سرور خواجہ جہاں بہت سے اوصاف کا حامل تھا وہ نیک اور دیندار بھی تھا۔ بزرگانِ دین اور علمائے کرام سے اس کو خاص عقیدت اور محبت تھی۔ منقول ہے کہ علمائے قنوج کے جو خطوط علمائے جون پور کے نام آتے تھے، ان میں والی جون پور خواجہ جہاں کا تذکرہ بہترین الفاظ میں ہوتا تھا اور وہ اس کے تدین و صالحیت اور علما سے تعلق و انسلاک پر بہت خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ اس کے زمانے میں سید جلال الدین بخاری اوچی مخدوم جہانیاں جہاں گشت بھی جون تشریف لے گئے تھے۔ خواجہ جہاں ان کا بے حد معتقد تھا اور اس کے وزیر ابراہیم شرقی نے جو بعد میں جون پور کا حکمران ہوا، ان سے بیعت کا شرف حاصل کیا۔

خواجہ جہاں نے جون پور کو علمی اعتبار سے ایک مثالی شہر بنانے کی کوشش کی، اس کو علما و فضلا کے مرکز کی حیثیت دینے کی طرح ڈالی، علم دین کی سرپرستی کو اپنے لیے ضروری قرار دیا، صوفیا و اتقیا کو اس میں آباد کرنے کی سعی کی۔ نیکی کی تبلیغ کے لیے خانقاہیں قائم کیں اور علوم دینی کی تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے مدرسے جاری کیے۔

ان مدارس میں فوجی تعلیم کا بھی ایک شعبہ قائم کیا گیا تھا۔

خواجہ جہاں نے ۸۰۲ھ کو وفات پائی اور اسے جون پور میں دفن کیا گیا۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس نے اپنی زندگی ہی میں ابراہیم شرقی اور اس کے بڑے بھائی سید مبارک شاہ کو متبنیٰ قرار دے لیا تھا اور اپنے بعد مبارک شاہ کو جون پور کا وارث تخت مقرر کیا۔ وہ اس کو اس کی قابلیت و صلاحیت اور فراست و تدبر کی وجہ سے، اس اعزاز کا مستحق گردانتا تھا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال سطح ذہن پر ابھرتا ہے کہ یہ مبارک شاہ شرقی اور ابراہیم کون تھے اور کس علاقے اور خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جنھوں نے شمالی ہند میں ایک عظیم سلطنت کو مستحکم بنیادوں پر چلایا، اس کو علم و فضل کا گہوارہ، علما و فضلا کا مسکن اور مشائخ دہلی کا مرکز بنا دیا۔؟

مورخین نے اس سوال کے مختلف جواب دیے ہیں۔ ایک جواب یہ ہے کہ یہ دراصل ایران کے رہنے والے تھے، خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت سید زین العابدین سے ملتا ہے۔ یہ لوگ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ۷۸۰ ہجری میں ہندوستان آئے اور دہلی میں اقامت گزین ہوئے۔ خواجہ جہاں ملک سرور بھی ان کے ساتھ آیا، جو ان کا غلام تھا، لیکن چوں کہ وہ بہت عقل مند، فہیم اور مدبر و فرس تھا، اس لیے اس کو دربار شاہی میں جگہ مل گئی اور پھر فیروز شاہ تغلق کی موت کے بعد طوائف الملوکی کا ایسا دور آیا اور انقلاب و تغیر کی ایسی لہریں اٹھیں کہ خواجہ جہاں نے جون پور میں اپنی حکومت قائم کر لی، جو اس کی موت کے بعد مبارک شاہ اور پھر ابراہیم شرقی کے قبضے میں چلی گئی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ خواجہ جہاں اور مبارک شاہ وغیرہ کا آپس میں کوئی تعلق نہ تھا، خواجہ جہاں جون پور کا حکمران ہوا تو اس نے مبارک شاہ اور ابراہیم شاہ کو اپنے وزیر و مشیر مقرر کیا۔ ایک روز اس نے مبارک شاہ سے اس کے خاندان اور وطن

کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دینے سے گریز کیا۔ پھر اس نے سختی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ دراصل ملکِ ایران کے شہر ہویزا کے حکمران کا بیٹا ہے اور سادات موسوی سے تعلق رکھتا ہے۔ باپ سے کسی معاملے میں ناچاقی ہو گئی اور یہ اپنے بھائی ابراہیم کو ساتھ لے کر ہندوستان آ گیا۔ کچھ روز دونوں بھائی دہلی میں مقیم رہے، وہیں خواجہ جہاں سے ملاقات ہوئی، وہ ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہوا اور اپنے قصبے سرور پور میں لے گیا، جہاں کا وہ پہلے سے حاکم تھا۔ اس نے ان کو اپنے منہ بولے بیٹے بنا لیا۔

جب یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ اس نے خواجہ جہاں کو سنایا تو وہ بڑا حیران ہوا اور واقعہ کی تحقیق کے لیے ایک شخص کو بادشاہ ہویزا کے پاس ایران بھیجا، تو بات صحیح ثابت ہوئی اور ان کا باپ اپنے بیٹوں کی خوش حالی اور ترقی کے بارے میں سن کر بہت خوش ہوا۔

اس طرح ان کے سلسلے میں اور بھی کئی باتیں بیان کی جاتی ہیں مگر ہمیں ان سے کوئی بحث نہیں ہے۔ ہمارا مقصد اختصار کے ساتھ صرف یہ بتانا ہے کہ ان شرقی حکمرانوں کے دور میں کون کون علما و فقہا جون پور گئے، انھوں نے ان سے کیا سلوک کیا اور علوم و فنون میں کیا ارتقا ہوا۔ اس ضمن میں ہم پہلے سلطان مبارک شاہ کا، اس کے بعد سلطان ابراہیم شرقی کا، پھر اس خاندان کے دیگر حکمرانوں کے عہد کے علمی عروج کا تذکرہ کریں گے۔

مبارک شاہ شرقی

شرقی سلطنت کے بانی ملک الشرق ملک سرور خواجہ جہاں کی وفات کے بعد ۸۰۲ھ میں اس کا متبنّٰی اور منہ بولا بیٹا سیّد مبارک شاہ جون پور کا تخت نشین ہوا۔ یہ پڑھا لکھا، سمجھدار، ذہین، متدیّن، علم پرور، علما کا قدردان، قوی ہیکل جوان، امورِ سلطنت کا ماہر اور بہادر بادشاہ تھا۔ اس کی تخت نشینی کے موقع پر جون پور شہر اور پوری سلطنت میں مسرت کا اظہار کیا گیا اور خوشیاں منائی گئیں۔

ارکانِ حکومت اور مصاحبینِ دولت نے مبارک باد دی اور شعرا نے تہنیتی قصائد لکھے۔
اس دَور کے درباری شاعر فراہی نے حسب ذیل قطعہ پیش کیا:

گشت چوں بادشہ مبارک شاہ — شادی آمادہ گشت بر پا جشن
سالِ تاریخ ایں خجستہ جلوس — شد نگہبان "عالم آرا جشن" ۸۰۲ھ

یعنی جب مبارک شاہ بادشاہ ہوا تو خوشیاں منائی گئیں اور جشن برپا کیے گئے۔ اور اس مبارک جلوس کی تاریخ یہ ہے۔ دنیا کا سنوارنے والا اس جشن کا نگہبان ہے۔

جب اس نے جون پور کی عنانِ حکومت ہاتھ میں لی تو سلطان دہلی محمود کو سخت ذہنی کوفت ہوئی اور اس نے اس کے استیصال کے لیے فوج کشی کی اور دیگر حاسدین بھی اس سلسلے میں محمود کی مدد کو آئے، مگر مبارک شاہ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔ وہ نہ صرف اپنی سلطنت کو بچانے میں کامیاب رہا بلکہ اس کے سامنے برابر ترقی کی نئی سے نئی راہیں کھلتی رہیں۔

خواجہ جہاں اپنے نام کا سکہ جاری نہیں کر سکا تھا لیکن مبارک شاہ نے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کیا اور خطبے میں بھی اپنا نام شامل کیا۔

جس زمانے میں تیمور ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا اور علما و فقہا نے اس کے حملے کی خبریں سن کر جون پور کا قصد کیا تھا، اس وقت جون پور میں ملک خواجہ جہاں کی حکومت تھی اور مبارک شاہ اور ابراہیم شاہ شرقی اس کے وزیر اور مشیر تھے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رہنے والے علمائے کرام نے ان تینوں حکمرانوں کے دَور میں اپنے لیے جون پور کو منتخب کیا اور بہترین خدمات انجام دیں۔

مبارک شاہ نے ایک سال کچھ مہینے حکومت کر کے ۸۰۴ھ میں وفات پائی اور مسندِ حکومت اس کے چھوٹے بھائی ابراہیم شرقی کے سپرد ہوئی۔

سلطان ابراہیم شرقی

سلطان مبارک شاہ شرقی کی وفات کے بعد ۸۰۴ھ میں اس کا چھوٹا بھائی ابراہیم شرقی جون پور کے تختِ حکومت پر بیٹھا۔ یہ بادشاہ حسنِ اخلاق، شرافتِ نفس، عزم و ہمت

جودت وکرم، عدل و احسان، عقل و تدبیر، علم و فضل اور دین داری کے اوصاف سے متصف تھا۔ علما و فضلا اور اولیا و مشائخ سے اس کو قلبی لگاؤ تھا۔ سلطنتِ شرقی کے درباری شاعر فراہی نے اس کی تقریبِ جلوس کے موقع پر حسب ذیل قطعہ کہا:

زہے شاہِ بحرِ سخا عدل گستر | باو تاج و تخت و نگین شد مسلّم
برون آر سالِ جلوسِ ہمایوں | ز سلطان اہلِ صفا شاہ عالم

سریر آرائے سلطنت ہوتے ہی اس نے علما و فقہا کی طرف عنانِ توجہ مرتکز کی اور قاضی نصیر الدین گنبدی کو جو علم و فقاہت میں ممتاز اور سلطان مبارک شاہ کے عہد میں عہدۂ قضا پر مامور رہتے، مشیرِ حکومت مقرر کیا، قاضی نظام الدین کیکانی (مصنفِ فتاویٰ ابراہیم شاہیہ) کو منصبِ قضا پر فائز کیا اور ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی کو قاضی القضاۃ کی مسندِ جلیلہ پر متمکن کیا۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے بعض حکمرانوں نے اس کو پریشان کرنے کی کوشش کی اور کئی مرتبہ اس کے مقابلے کو نکلے مگر یہ ہر موقع پر ثابت قدم رہا اور اس کی حکومت ہر اعتبار سے مضبوط و مستحکم رہی۔ اس سلسلے کے متعدد واقعات کتبِ تاریخ میں مسطور ہیں مگر ہمیں ان سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ ہمارے دائرۂ موضوع سے باہر ہیں۔ ان سطور میں ہم فقط اس کی زندگی کے اسی پہلو سے تعرض کریں گے جو اس کی علم پروری، علما و مشائخ سے عقیدت اور اصحابِ علم سے ربط و انسلاک سے متعلق ہے۔

جون پور، مرکزِ اصحاب۔

سلطان ابراہیم شرقی کی نیک شہرت سے متاثر ہو کر اس کے زمانے میں علمائے کرام، فقہائے عظام اور مشائخ وقت، دہلی وغیرہ سے ترکِ وطن کر کے بہت بڑی تعداد میں جون پور میں آکر آباد ہو گئے تھے اور یہ شہر مرکزِ علما کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ منقول ہے کہ اس کے عہد میں بیک وقت نو سو چوراسی (۹۸۴) علمائے کرام کی پالکیاں نمازِ جمعہ اور عیدین کے لیے نکلتی تھیں۔ بعض مورخین نے چودہ سو (۱۴۰۰) پالکیوں کی تعداد رقم کی ہے، جن میں شیخ

وجیہ الدین، قاضی نصیر الدین گنبدی، قاضی شہاب الدین دولت آبادی، قاضی نظام الدین کیکانی (یا گیلانی) شیخ شمس الحق، عیسیٰ بن تاج، شیخ حسن طاہر، شیخ اشرف جہاں گیر، سید علاء الدین کے اسمائے گرامی لائقِ تذکرہ ہیں۔ اس زمانے میں جونپور کو شیراز ہند کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اور ارباب کمال اور اصحاب فن کی کثیر تعداد نے اس کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا۔ اس کا دربار علمی بحثوں اور فقہی مسائل پر تبادلۂ خیال کے لیے مشہور تھا۔ یہ اپنے آپ کو علما کا خادم ظاہر کرتا اور ان سے نہایت عقیدت کے ساتھ پیش آتا تھا۔

قاضی شہاب الدین سے عقیدت

قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے تو سلطان ابراہیم شرقی کو انتہائی عقیدت تھی اور وہ ہر اہم معاملے میں ان سے مشورہ کرتا تھا۔ متبرک دنوں میں ان کو اپنے دربار میں نقرئی کرسی پر بٹھاتا تھا اور ان کی تکلیف سے اس کو بے حد تکلیف ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک مرتبہ وہ کسی مرض میں مبتلا ہوئے تو اُن کی عیادت کے لیے گیا اور مزاج پرسی اور اظہارِ شفقت کے بعد ایک کٹورہ میں پانی بھر کر ان کے سر کے گرد گھمایا، پانی خود پیا اور بانداز دعا اللہ سے ملتجی ہوا کہ اے خداوند! جس بلا اور بیماری میں یہ گرفتار ہیں اس کو ان سے دور فرما اور مجھے دے دے انھیں کامل صحت اور مکمل شفا عطا کر۔

حصولِ علم کا شوق

حصولِ علم کا اس بادشاہ کو بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے عہد کے دو مشہور علماؤں، صدرِ جہاں اجمل اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے حلقۂ تلمذ میں باقاعدہ شرکت کی اور ان سے حدیث، فقہ اور منطق کی بعض کتابیں پڑھیں۔ مسائل فقہی میں تو اس درجہ دسترس حاصل کر لی تھی کہ اس کے دربار میں اگر کوئی فقہی مسئلہ زیر بحث آجاتا تو اس میں دلچسپی لیتا اور اس سے متعلق علما سے گفتگو کرتا۔ دینی معاملات میں علما کی طرف سے جو فتوے جاری ہوتے، ان کو نشر اور نافذ کرنے سے

پہلے خود پڑھتا اور ان میں ترمیم و اضافہ کے بارے میں رائے دیتا اور مسئلہ زیر بحث کے تمام پہلوؤں کو غور و فکر کے زاویوں میں لاتا۔

عدل و انصاف

معدلت گستری اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا اس کے نزدیک سب سے مقدم فرض تھا، اس ضمن میں تمام شہروں کے قضات کو باقاعدہ ہدایات جاری کر دی گئی تھیں کہ عدل کے متعینہ حدود سے کسی صورت میں بھی باہر قدم نہ رکھا جائے اور اس معاملے میں کسی کو کسی پر ترجیح نہ دی جائے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ اس کے پاس ایک ہندو فریاد لے کر حاضر ہوا کہ مسلمان اس کے گاؤں میں اس کی جگہ پر جبراً قبضہ کر کے مسجد تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے فوراً اس معاملے میں مداخلت کی اور مسلمانوں کو ہندو کی جگہ پر مسجد تعمیر کرنے سے منع کیا اور کہا کہ پہلے وہ جائز طریق سے جگہ حاصل کریں پھر اس پر مسجد بنائیں۔

راتوں کو گشت

ابراہیم شرقی رعایا کا انتہائی خیر خواہ تھا، وہ ہر ممکن طریق سے لوگوں کی تکلیفوں سے آگاہ ہونے کی کوشش کرتا اور پھر انھیں رفع کرنے کی تدبیریں سوچتا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے عمال اور کارندوں کی اطلاع کو کافی نہ سمجھتا بلکہ بھیس بدل کر خود شب کو نکلتا، اور شہر کی گشت لگاتا، اور رعایا کے حالات معلوم کرتا، نیز یہ پتا چلاتا کہ کہاں کیا جرائم ہو رہے ہیں اور مجرم ملک کے کس حصے میں چھپے ہوئے ہیں۔ پھر ان جرائم کا سدباب کرتا۔ یہ اطلاعات چوں کہ اس کے ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہوتی تھیں، اس لیے ان کے غلط ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس سے بعض لوگ یہ سمجھتے کہ بادشاہ نے جنات قابو کر رکھے ہیں جو اس کو ایسی صحیح صحیح خبریں پہنچاتے اور خفیہ باتیں بتاتے ہیں کہ جن سے اس کے جاسوس بھی مطلع نہیں ہو سکتے۔

رحم دلی

وہ بہت رحم دل بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے اہل کاروں اور پہرہ داروں کو تاکید

کر رکھی تھی کہ کوئی شخص کسی وقت بھی فریادی کی حیثیت سے آئے، اس کو فوراً اس کے پاس پہنچایا جائے۔ اس ضمن میں غریب امیر اور بڑے چھوٹے کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہ کیا جائے۔ چنانچہ بادشاہ کا دروازہ فریادیوں اور ضرورت مندوں کے لیے ہر آن کھلا رہتا اور ہر شخص بغیر کسی ادنیٰ تکلیف اور رکاوٹ کے بادشاہ تک رسائی حاصل کر لیتا اور اپنی بات اس کے کانوں تک پہنچا دیتا تھا۔

ملک کے قاضیوں کو اس کا حکم تھا کہ مقدمات کے فیصلے کرنے میں زیادہ تاخیر سے کام نہ لیا جائے۔ جہاں تک ہو سکے شہادتیں لے کر اور ثبوت مہیا کر کے جلد فیصلے کیے جائیں۔ باہر سے آنے والے لوگوں کے مقدمات میں بالخصوص دلچسپی لی جائے اور انھیں بلا تاخیر نمٹایا جائے۔ علاوہ ازیں دوران مقدمہ میں ان کے قیام اور ضروریات کی طرف بھی دھیان دیا جائے۔ اور کام کو طول دے کر ان کو پریشان نہ کیا جائے۔

دینی مدارس

دینی تعلیم کے لیے ہر شہر میں مدرسے قائم تھے جن میں لائق اساتذہ مقرر کیے گئے تھے۔ ان کو سرکاری خزانے سے تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ طلبا کے مصارف بھی حکومت ادا کرتی تھی۔ صرف دارالسلطنت جون پور میں ڈیڑھ سو دینی مدارس قائم تھے۔ ملک کے باقی شہروں کے مدارس اس کے علاوہ تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس بادشاہ کو دینی تعلیم کے فروغ و اشاعت کا کس درجہ شوق تھا۔

انتظام مساجد

مساجد کا انتظام نہایت شاندار تھا اور اس کے تمام اخراجات کی ذمہ دار حکومت تھی۔ ہر مسجد میں حکومت کی طرف سے ایک پہرہ دار متعین ہوتا، جو مسجد کے سامان کی نگرانی کرتا تھا، مسجد کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی، وہ مہیا کرتا۔ مسافروں کی حفاظت کرتا، قیام و طعام کی ذمہ داری اسی کے سپرد تھی۔

چہرہ نویسی

ہر شاہی ملازم کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی چہرہ نویسی کرائے۔ یعنی اس کا

پورا حلیہ اور جسم کے داغ دھبے، آنکھوں اور جسم کا رنگ وغیرہ لکھ لیا جاتا تھا۔ اسی طرح ہر گھوڑے کے خاص نشان اور داغ وغیرہ کو بھی ضبطِ تحریر میں لایا جاتا تھا۔

شیخ اشرف جہاں گیر سے عقیدت

سلطان ابراہیم شرقی، علما و مشائخ کا ازحد معتقد تھا۔ شیخ اشرف جہاں گیر سمنانی سے بھی اس کو بہت عقیدت تھی۔ وہ جون پور تشریف لائے تو اس نے نہایت خوشی کا اظہار کیا۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی معیت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اپنے اعیانِ حکومت کو بھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی تاکید کی۔ اپنے بیٹوں کو ساتھ لے کر ان کی زیارت کو گیا اور دعا کی درخواست کی۔ نیز ان سے عرض کناں ہوا کہ وہ مستقل طور پر جون پور میں اقامت اختیار فرمائیں۔ شیخ اشرف جہاں گیر بھی اس سے مل کر بہت خوش ہوئے اور اس کے لیے خاص طور سے دعا کی۔

وفات

غرض ابراہیم شرقی بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ وہ نویں صدی ہجری کے دیارِ ہند کا نیک اطوار، علم پرور، مدبر اور علما و فقہا کا قدردان بادشاہ تھا۔ اس نے جون پور کو ہم رنگ دہلی بنا دیا۔ دہلی کی تہذیبی و ثقافتی رونقیں اور علمی و تصنیفی محفلیں جون پور میں منتقل ہو گئی تھیں، یہاں کے علما، مرجع خلائق، فقہا مرکز تحقیق، مدرسین ماویٰ طلبا اور مشائخ منبع فیوض تھے۔ اس کے زمانے میں جون پور میں مختلف علوم و فنون سے متعلق متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں۔ بعض علمائے کرام نے اس کے نام سے بھی کتابیں منسوب کیں، جن میں مسائلِ فقہ سے متعلق ایک مشہور کتاب فتاویٰ ابراہیم شاہیہ خصوصیت سے لائق تذکرہ ہے۔ یہ کتاب شیخ نظام الدین کیکانی (یا گیلانی) کی تصنیف ہے اور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ عربی میں ہے اور ایک فارسی میں۔

ابراہیم شرقی نے ۸۴۰ھ اور ایک روایت کے مطابق ۸۴۴ھ میں وفات پائی۔[۱۵]

---

[۱۵] اس کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: تاریخ فرشتہ ج ۲۔ بضمن ذکر بادشاہانِ شرقی۔

سلطان محمود شاہ شرقی

سلطان ابراہیم شرقی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمود شاہ شرقی جون پور کی مسندِ جہاں داری پر متمکن ہوا۔ یہ اپنے باپ کا صحیح جانشین تھا اور مختلف معرکوں میں اس کے ساتھ رہا تھا۔ باپ ہی کی طرح عقل و فہم سے آراستہ اور نیکی و تدین سے پیراستہ تھا۔ علماء و مشائخ کی جماعت اس کے دربار میں بھی موجود تھی اور وہ ان سے مشورے لیتا اور استفادہ کرتا تھا۔ اس نے بادشاہِ دہلی بہلول لودھی کا مقابلہ بھی کیا اور وقت کے بعض دیگر حکمرانوں کے خلاف بھی صف آرا ہوا۔ شرقی سلطنت میں اس کے عہد میں کسی قسم کی کمزوری کے آثار پیدا نہیں ہوئے اور وہ بہادری و استقلال سے حالات کا مقابلہ کرتا رہا۔ احکامِ شریعت کا پابند تھا۔ بعض فرمان رواؤں کے خلاف صرف اس لیے میدانِ جنگ میں اترا کہ ان کے علاقوں میں اسلامی رسوم و عوائد، شرعی احکام اور دینی فرائض پر عمل نہیں کیا جاتا تھا اور مسلمانوں کو وہ قدر و منزلت حاصل نہ تھی جس کے وہ مستحق ہیں۔ اس کے دورِ حکومت میں بہت سی کتابیں معرضِ تحریر میں آئیں، مدارس جاری ہوئے، اسلامی علوم کے فروغ و ترویج کی نئی نئی راہیں کھلیں اور علما نے مختلف عنوانات پر دادِ تحقیق دی۔ اس کے عہد کے بعض فقہائے کرام کا تذکرہ اس کتاب کے آئندہ صفحات میں موجود ہے۔

سلطان محمود شاہ بن سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے بیس سال چند روز حکومت کرنے کے بعد ۸۶۲ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

سلطان محمد شاہ شرقی

سلطان محمود شاہ شرقی کے بعد اس کے بیٹے سلطان محمد شاہ شرقی نے جون پور کی زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ یہ شہزادہ بھیکن خاں کے عرف سے معروف تھا۔ یہ اس وقت

سلاطینِ جون پور۔ تجلی نور — تاریخ ہند مولوی ذکاء اللہ۔ نزہۃ الخواطر ج ۳۔ تاریخ شیراز ہند جون پور — برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ۔

حکمراں ہوا جب کہ یہ خاندان سلطان بہلول سے برسرِ پیکار تھا۔ یہ شجاع، تیر انداز اور شمشیر زن بادشاہ تھا۔ دورانِ جنگ میں یہ تیر سے زخمی ہوا اور وفات پاگیا۔ اس کی مدتِ حکومت صرف پانچ ماہ ہے۔ اس کے زمانے میں جون پور میں بہت سے علماء فقہا موجود تھے۔

سلطان حسین شاہ شرقی

محمد شاہ شرقی کی موت کے بعد اس کا بھائی حسین شاہ شرقی وارثِ تخت بنا۔ یہ نہایت عقل مند، صاحب تدبیر اور جنگ جو بادشاہ تھا۔ علم و فضل کی نعمت سے بھی بہرہ ور تھا۔ مختلف علوم پہ گہری نظر رکھتا تھا۔ مشہور عالم قاضی سماء الدین جون پوری کا شاگرد تھا۔ یہ موسیقی کا بھی ماہر تھا۔ اس موضوع سے متعلق اس نے ایک کتاب بھی تصنیف کی جس کا نام تحفۃ الہند ہے۔

اس نے بادشاہِ دہلی بہلول لودھی اور اس کے بیٹے سکندر لودھی سے کئی جنگیں لڑیں اور بار بار دہلی پر حملہ آور ہوا۔ ابتدا میں لودھی سلاطین اس سے بہت خوف زدہ تھے اور اس کی فوجی طاقت سے مرعوب تھے۔ انھوں نے کئی بار اس کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا اور امن و آشتی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی، مگر یہ برابر ان کو پریشان کرتا اور ان پر حملہ آور ہوتا رہا۔ بالآخر ۸۸۱ھ میں سکندر لودھی سے شکست کھا گیا۔ سکندر لودھی نے جون پور اور اس نواح کے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا اور شرقی سادات کی یہ حکومت ختم ہو گئی۔ حسین شاہ اس خاندان کا آخری حکمران تھا، اس کی مدتِ حکومت اٹھارہ برس ہے۔ شکست کے بعد یہ بنگال چلا گیا تھا۔ یہ آخری دم تک بنگال میں مقیم رہا اور وہیں موت سے ہم کنار ہوا۔ اس کی آخری وصیت یہ تھی کہ اس کی میت کو جون پور پہنچایا جائے اور اسے وہیں دفن کیا جائے، چناں چہ اس وصیت پر عمل کیا گیا اور اسے سلطان ابراہیم شاہ اور محمود شاہ کی قبر کے قریب دفن کیا گیا۔[1]

---

[1] شرقی سلاطین کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: تاریخ فرشتہ ج ۲ بعنوان ذکر بادشاہانِ شرقی۔ تجلی نور۔ سلاطین جون پور۔ تاریخ شیراز ہند جون پور۔ نزہۃ الخواطر ج ۲۔

سلطان بہلول لودھی

نویں صدی ہجری کے ہندوستان کی اسلامی تاریخ اب ایک اور ورق الٹتی ہے اور اس کی کلاہ سروری لودھی خاندان کے حصے میں آتی ہے۔ اس خاندان کا پہلا فرماں روا بہلول لودھی تھا۔ اس کے متعلق کچھ بیان کرنے سے پہلے ان واقعات کی نشان دہی کرنا ضروری ہے، جو اس کو برصغیر پاک و ہند کے مرتبہ سلطانی پر متمکن کرنے کا باعث ہوئے۔

لودھی افغانوں کی ایک جماعت تجارتی سلسلے میں ہندوستان میں آمد و رفت رکھتی تھی۔ اس جماعت کا ایک رکن ملک بہرام تھا، جو بہلول لودھی کا دادا تھا۔ وہ کسی معاملے میں اپنے بڑے بھائی سے ناراض ہو کر ملتان آ گیا تھا۔ ملتان کا حاکم اس زمانے میں مردان دولت تھا، ملک بہرام نے اس کی ملازمت اختیار کر لی۔ بہرام کے پانچ بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام کالا اور ایک کا سلطان شاہ تھا۔ یہ پانچوں اپنے باپ کی وفات کے بعد ملتان میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ پھر خضر خاں ملتان کا حاکم مقرر ہوا تو سلطان شاہ اس کے ملازموں کی سلک میں منسلک ہو گیا اور خضر خاں نے اس کو افغانوں کا سردار بنا دیا۔ خضر خاں کی اپنے حریفوں سے جنگ ہوئی تو سلطان شاہ نے اس کی مدد کی اور اس کے ایک زبردست حریف اقبال خاں کو قتل کر دیا۔ اس بہادری اور جواں مردی کے صلے میں خضر خاں نے اس کو لائق اعتنا گردانا، اور اسلام خاں کا خطاب دے کر علاقہ سرہند کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس وقت اس کا بھائی کالا بھی اس کے ساتھ تھا، جس کو بہت سے قصبات و دیہات کا والی بنا دیا گیا۔ کالا کی شادی اپنے چچا کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ اس خاتون کے وضع حمل کے دن قریب آئے تو اس پر ایک مکان گرا، وہ اس کے ملبے تلے دب گئی؛ اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس کا پیٹ چاک کر کے بچے کو نکالا گیا، تو وہ زندہ تھا۔ اس بچے کا نام بہلول رکھا گیا، جو آگے چل کر ہندوستان کا بادشاہ بنا اور سلطان بہلول لودھی کے نام سے مشہور ہوا۔

ابتدائی حالات

بہلول ابھی کم سن تھا کہ اس کا باپ (کالا)، نیازی افغانوں کی ایک جنگ میں شامل ہوا اور مارا گیا۔ ان دنوں بہلول کو بلّو کے نام سے پکارا جاتا تھا، باپ کی موت کے بعد اس نے اپنے چچا سلطان شاہ (یعنی اسلام خان) کے ہاں سرہند میں پرورش پائی۔ جوان ہوا تو اس کو اسلام خاں کے ساتھ ایک جنگ میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اسلام خاں نے اس میں شجاعت و بسالت کے جوہر دیکھے تو اپنی بیٹی اس کے عقد میں دے دی۔ دنیوی اعتبار سے اسلام خاں کا مرتبہ بڑا بلند تھا اور اس کے اپنے لڑکے بھی تھے مگر اس نے بہلول ہی کو اپنا قائم مقام بنایا اور وفات کے بعد اس کو اپنا وارث تسلیم کرنے کی وصیت کی۔ اس دارِ فانی سے اسلام خاں کا انتقال ہوا تو جو افغان اس کے ماتحت تھے وہ تین حصوں میں بٹ گئے، مگر اسلام خاں کی وصیت کے مطابق اکثریت نے بہلول کو اپنا سردار بنایا۔

بہلول سے سلطان شاہ کی محبت اور قلبی تعلق کا یہ عالم تھا کہ ایک دن وہ نماز پڑھ رہا تھا اور بہلول گیند سے کھیل رہا تھا، اچانک اس کی گیند سلطان شاہ کے مصلے پر جا پڑی۔ گھر والوں نے اس حرکت پر اس کو تنبیہ کی مگر سلطان نے ان کو روک دیا اور کہا، اس کو کچھ نہ کہو، مجھے اس کی پیشانی پر حشمت و عظمت کے آثار نظر آتے ہیں[1]

ایک بزرگ کی خدمت میں

ایک مرتبہ بہلول اپنے دو دوستوں کے ساتھ سمانہ گیا۔ وہاں ایک مجذوب درویش کی خدمت میں حاضر ہوا اور دو زانو ہو کر ادب کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھا۔ مجذوب نے کہا تم میں کون ایسا شخص ہے، جو دو ہزار تنکے میں دہلی کی بادشاہت خریدنے پر تیار ہو؟ بہلول کے پاس سولہ سو تنکے تھے، اس نے وہ تنکے جیب سے نکالے اور مجذوب کی خدمت میں

---

[1] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۱۴۴ بحوالہ تاریخ شاہی احمد یادگار ص ۲، ۳۔ واقعات مشتاقی (قلمی) ص ۳۔ تاریخ داؤدی ص ۲۔

پیش کردیے اور عرض کیا، میرے پاس کل رقم یہی ہے۔ مجذوب نے وہ رقم قبول کرتے ہوئے کہا:

بادشاہی دہلی مبارک شد۔

دہلی کی بادشاہت مبارک ہو۔

بہلول کے ساتھیوں نے اس حرکت پر اس کا مذاق اڑایا، تو اس نے جواب دیا سولہ سو تنکے سے میری زندگی بسر نہیں ہوسکتی تھی۔ اب یہ چیز دونوں حالتوں سے خالی نہیں۔ اگر سلطنت حاصل ہوگئی تو یہ سودا کیا بُرا ہے اور اگر نہ ہوئی تو مجھے اس مجذوب فقیر کی خدمت کا اللہ سے اجر ملے گا۔[۱۸]

اتفاق ملاحظہ ہو کہ بہلول بن کالا لودھی مختلف مناصب پر فائز رہا۔ اس کو سرہند کا والی بنایا گیا، خان خاناں کا خطاب دیا گیا، افغانوں کا سردار مقرر کیا گیا، اور لاہور، دیپال پور اور سنام وغیرہ کے علاقوں کی تولیت اس کے سپرد کی گئی پنجاب اور سندھ کی ولایت پر مامور کیا گیا اور ان منازل کے طے ہونے کے بعد ۸۵۵ھ میں ہندوستان کی بادشاہت کا تاج اس کے سر پہنا دیا گیا۔

پابندیٔ مذہب

بہلول لودھی بڑا نیک دل، عالم و فاضل اور مذہب کا پابند تھا۔ نماز باقاعدگی سے پڑھنا اور باجماعت ادا کرنا۔ مشتاقی لکھتا ہے:

پنج نماز باجماعت ادا می کرد، و در وقتِ جنگ رسم بود، چوں بر فوج مخالف نظرش افتاد، زود اسپ فرود می آمد و استخارہ و خیریت اسلام و مسلمانی وا فرار عجز می کرد۔[۱۹]

پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتا۔ اس کی عادت تھی کہ جنگ کے وقت دشمن کی فوج پر نظر پڑتی تو فوراً گھوڑے سے اُتر آتا، اور استخارہ کرتا، اسلام اور

۱۸ؔ تاریخ فرشتہ ج ۱، ص ۲۶۸

۱۹ؔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۴۴۰، بحوالہ واقعات مشتاقی (قلمی) ص ۱۔

مسلمانوں کی بھلائی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا اور اپنے عجز و بے بسی کا اظہار و اقرار کرنا۔

جب سلطان حسین شرقی نے بہت بڑی فوج کے ساتھ دہلی پر چڑھائی کی تو بہلول تمام رات خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مرقد پر ننگے سر کھڑے ہو کر اللہ سے دعائیں مانگتا رہا۔ منقول ہے کہ صبح کے وقت ایک مردِ غیب نمودار ہوا اور ایک لکڑی اس کے ہاتھ میں دے کر کامیابی کی بشارت دی۔[۲۰]

ایک بدعت کا خاتمہ

دہلی میں ایک رسم تھی کہ کوئی شخص مر جاتا تو سوئم کے دن شربت، پان، مصری وغیرہ تقسیم کی جاتی تھی۔ بہلول نے اس رسم کو بند کر دیا اور اس بدعت، کا جو عرصے سے جاری تھی، خاتمہ کر دیا۔ کیوں کہ اس میں بے جا طور پر روپیہ صرف ہوتا تھا اور یہ چیز شریعتِ اسلامی کے خلاف تھی۔

حلم اور بردباری

وہ نہایت حلیم الطبع، بردبار اور متحمل مزاج تھا۔ ہر شخص کو احترام کی نظر سے دیکھتا اور عزت سے پیش آتا تھا۔ اس کے حالات میں مرقوم ہے:

با امرا و سپاہی معیشتِ برادرانہ داشت۔

کہ امرائے حکومت اور سپاہیوں کے ساتھ برادرانہ تعلقات رکھتا تھا۔

بہلول نہایت سادہ فطرت بادشاہ تھا۔ اس کا معمول تھا کہ عبادت اور تعزیت کے لیے لوگوں کے گھروں میں جاتا، دسترخوان پر انتہائی بے تکلفی سے چھوٹے بڑے کو بٹھا لیتا۔ اس کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا تھا، کوئی پردہ دار اور حاجب نہ تھا۔ دربار میں آتا تو نیچے دری پر بیٹھتا اور کسی کو اپنے سامنے کھڑا نہ ہونے دیتا۔ سب کی بات اپنے برابر بٹھا کر سنتا۔ تاریخِ داؤدی کے الفاظ ہیں:

---

[۲۰] سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۴۰۴ بحوالہ واقعات مشتاقی (قلمی) ص ۱۰

حلم و کرم جبلی در سرشت داشت، بظاہر آراستہ بشریعت بہ متابعت آں کمال تقید داشت در کل احوال سلوک بر مسالکِ شریعت نمودے و خلاف شریعت ہرگز بکار دست نزدے [۲۱]

یعنی حلم و کرم اس کی سرشت میں داخل تھا۔ ظاہر میں پابندیٔ شریعت سے آراستہ تھا اور اس کے اتباع کی پوری کوشش کرتا تھا۔ ہر حال میں راہِ شریعت پہ گامزن رہتا اور خلافِ شریعت کسی کام پر ہاتھ نہ ڈالتا۔

علما سے عقیدت مندانہ تعلقات

سلطان بہلول لودھی علما کی بدرجہ غایت تکریم کرتا۔ ان سے عقیدت مندانہ تعلقات رکھتا اور زیادہ تر وقت ان کی صحبت و مجلس میں گزارتا تھا۔ فرشتہ کا بیان ہے:

درحضر و سفر با علما و مشائخ صحبت داشتے و اکثر اوقات با ایشاں بسر بردے [۲۲]

سفر و حضر میں علما و مشائخ کی صحبت اختیار کرتا اور اکثر اوقات ان کے ساتھ رہتا تھا

یہ سلطان، علما کی کس درجہ عزت و تکریم کرتا تھا، اس سلسلے میں "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" کے مصنف جناب خلیق احمد صاحب نظامی نے واقعاتِ مشتاقی اور تاریخ داؤدی کے حوالے سے تین دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں، جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ تختِ دہلی پر متمکن ہونے کے بعد جب وہ پہلے دن جامع مسجد میں گیا تو میاں قادن نے خطبہ کے بعد افغانوں کا اس طرح مذاق اڑانا شروع کر دیا۔

سبحان اللہ! عجب قومے پیدا شدند، نمی دانم پیشتر دجّال در ایشاں باشد، زبان ایشان اینست کہ مادر را "مور" می گویند، و برادر را "ادور" می گویند، و دیر را "شور"

---

[۲۱] سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۴۲۰ بحوالہ تاریخ داؤدی ص ۱۰۔

[۲۲] تاریخ فرشتہ ج ۱، ص ۱۷۹۔

می گویند، وسپاد را 'تور' می گویند۔

سبحان اللہ! یہ عجیب قوم پیدا ہوگئی ہے، معلوم نہیں، دجّال کا پیش رَو شاید اسی قوم میں سے ہو۔ ان کی زبان یہ ہے کہ ماں کو 'سور' بھائی کو 'ادر' گاؤں کو 'شور' اور فوج کو 'تور' کہتے ہیں۔

بہلول نے یہ سن کر منہ پر رومال رکھ لیا اور تبسّم کرتے ہوئے کہا:

مُلّا قادن، لبس کن کہ ما ہمہ بندگان خدا ایم۔

مُلّا قادن! بس کرو، ہم سبھی خدا کے بندے ہیں۔

۲۔ ایک مرتبہ سلطان کی ملاقات ایک ایسے عالم دین سے ہوئی جو پستہ قد تھا اور سر پر شرخ بال تھے۔ سلطان نے مذاق میں اس سے کوئی ایسی بات کہہ دی جو اسے ناگوار گزری۔ سلطان کو جب اس کا احساس ہوا تو اس سے اظہار معذرت کیا۔

۳۔ ایک دن، ایک شخص سلطان کے خلوت کدہ میں گھس گیا اور عین اس وقت جب کہ وہ غسل کے لیے جا رہا تھا، اسے روک لیا اور مجبور کیا کہ پہلے اس کا مطالبہ پورا کیا جائے، بعد کو غسل خانے میں قدم رکھا جائے۔ سلطان نے اس کی اس حرکت پر کسی قسم کی ناراضی کا اظہار نہیں کیا، اور اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔

مشائخ سے محبت اور ان کی مدد

اولیا و مشائخ سے سلطان بہلول بڑی محبت رکھتا تھا اور ان کی امداد کرنا اپنے لیے ضروری سمجھتا تھا۔ اس کا ثبوت اس کی زندگی کے بہت سے واقعات سے ملتا ہے، لیکن ہم یہاں صرف ایک واقعہ بیان کریں گے۔

حملۂ تیمور کے بعد پنجاب کا علاقہ بدنظمی اور سیاسی ابتری کا شکار ہوا تو سلسلہ سہروردیہ کے مشائخ بے پناہ سیاسی طاقت کے مالک بن گئے اور ان کی خانقاہیں اس معاملے میں دلچسپی رکھنے والوں کا مرکز قرار پا گئیں۔ مشائخ سہروردیہ پہلے سے حکومتوں کے معاملات میں بہت دخیل تھے، مگر اب تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ لوگوں نے شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کی خانقاہ کے سجادہ نشین شیخ یوسف قریشی کو ملتان

کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس کا ذکر شیخ نظام الدین بخشی نے طبقاتِ اکبری میں ان الفاظ میں کیا ہے:

"چوں بزرگی طبقہ علیہ شیخ الطریقہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی قدس اللہ تعالیٰ در قلوب سکنۂ ملتان وجمہور زمینداران آن صوب بنوعی قرار گرفتہ کہ مزید بر آن متصور نباشد، جمیع اہالی واشراف وعموم سکنہ جمہور متوطنان آں حدود شیخ یوسف قریشی را کہ تولیت خانقاہ وحراست ومجاورت روضہ رضیہ شیخ بہاء الدین زکریا باو متعلق بود بسلطنت وبادشاہی برداشتند، بر منابر ملتان واوچہ وبعضے قصبات خطبہ بنام او خواندند"[۲۳]

یعنی شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے طبقہ عالی کی عزت وبزرگی ساکنانِ ملتان اور اس صوبے کے تمام زمینداروں کے دلوں میں اس درجہ مضبوط اور مستحکم ہو گئی تھی کہ اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس علاقے کے تمام باشندوں، اونچے خاندانوں، معتبر لوگوں اور جمہور عوام نے جو وہاں متوطن تھے، شیخ یوسف قریشی کو ملتان کی سلطنت وبادشاہی کے تخت پر بٹھا دیا۔ ملتان، اوچ اور بعض قصبات کے شہروں پر ان کے نام کا خطبہ بھی پڑھا جانے لگا۔ اور یہ شیخ یوسف وہ تھے جن سے متعلق شیخ بہاء الدین زکریا کی خانقاہ کی تولیت وحفاظت اور اس کی مجاورت تھی۔

لیکن یہ حکومت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی اور ملتان کی لنگاہ برادری نے اس کی طاقت کا خاتمہ کر دیا اور حکومت پر خود قابض ہو گئے۔ اب شیخ یوسف نہایت پریشانی کی حالت میں اپنے چند ساتھیوں کی معیت میں دہلی پہنچے اور شیخ بہلول سے ملے، اس نے ان لوگوں کو پناہ دی اور ان کی بے حد خدمت کی، یہاں تک کہ اپنی لڑکی بھی شیخ یوسف کے بیٹے شیخ عبداللہ کے نکاح میں دے دی۔[۲۴]

---

[۲۳] طبقاتِ اکبری ج ۳، ص ۵۲۲ [۲۴] ایضاً ص ۵۲۳ تا ۵۲۵

یہی وجہ ہے کہ مشائخ کے حلقے میں سلطان بہلول کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور سلسلۂ سہروردیہ کے تذکروں میں اس کا ذکر احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔

شیخ سماء الدین سہروردی سے عقیدت

شیخ سماء الدین سہروردی اس دور کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ ملتان میں لنگا خاندان کی حکومت قائم ہونے کے بعد یہ رنتھنبور اور بیانہ وغیرہ سے ہوتے ہوئے دہلی پہنچے اور پھر وہیں مقیم ہو گئے۔ وہ عام طور پر ملوک و سلاطین سے ملنے اور ان کی مجلسوں میں جانے سے گریز کرتے تھے، لیکن سلطان بہلول کے ساتھ ان کا یہ معاملہ نہ تھا، وہ سلطان کے پاس جاتے، سلطان بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، کیوں کہ مشائخ سہروردیہ پر اس کے بہت سے احسانات تھے۔

ایک دن بہلول نے بڑی عقیدت مندی سے عرض کیا کہ میں آپ کی مہربانیوں کا محتاج ہوں، کچھ نصیحت کیجیے۔ فرمایا:

تین آدمی اللہ کے انعام و اکرام سے محروم رہیں گے۔

ایک وہ بوڑھا جو گناہوں سے باز نہ آئے۔

دوسرے وہ جوان جو اس امید پر دلیری کے ساتھ سرگرم معصیت رہے کہ ایام پیری میں اپنی اصلاح کر لے گا۔

تیسرے وہ سلطان، جس کو تمام دینی اور دنیوی ضروریات و مراعات حاصل ہیں مگر اس کے باوجود وہ اپنی سلطنت کے چراغ کو جھوٹ کی آندھی سے بجھاتا ہے۔ شیخ نے سلطان کو اور بھی بہت سی نصیحتیں کیں۔ شدت تاثر سے سلطان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور عرض گزار ہوا:

حضرت مخدوم، باوجود چندیں تقصیرات، محبت درویشاں در خود، زماں زماں مزید می یابم۔ امید کہ حق تعالیٰ ببرکت محبت ایں قوم مرا نجات ارزانی فرماید۔[۲۵]

---

[۲۵] سیر العارفین ص ۱۷۸، ۱۷۹

حضرت مخدوم، باوجود اتنے گناہوں کے، اپنے دل میں لمحہ بہ لمحہ درویشوں کی محبت زیادہ پاتا ہوں۔ امید ہے، حق تعالیٰ اس جماعت کی برکت محبت کی وجہ سے مجھے نجات عطا فرمائے گا۔

سلطان کے اس اظہارِ عقیدت سے متاثر ہو کر شیخ نے ایک مصلائے خاص عنایت فرمایا۔ جس کو احتراماً سر پہ رکھ کر وہ خانقاہ سے واپس ہوا[26]

سلطان بہلول لودھی، نویں صدی ہجری کے ہندوستان کا ایک نہایت متواضع متبع سنت، احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پابند، نیک اور عادل بادشاہ تھا۔ اس نے اڑتیس[38] سال حکومت کرنے کے بعد ۸۹۴ھ میں وفات پائی[27]

یہاں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ شیخ سماء الدین سہروردی بہلول کی قبر پہ گئے اور کچھ دیر وہاں سر جھکاتے بیٹھے رہے پھر فرمایا:

سبحان اللہ! ایں مرد اگرچہ دریں جہاں در کامرانی و سلطانی گزرانید، از برکت فرطِ محبتے و اعتقادے کہ با دوستانِ خدا داشت، در آں جہان نیز مرتبہ عالی یافت[28]

سبحان اللہ! اس شخص نے اگرچہ اس دنیا میں اپنی زندگی کامرانی اور سلطانی میں بسر کی، لیکن اس محبت اور اعتقاد کی وجہ سے جو وہ دوستانِ خدا سے رکھتا تھا، اس نے اُس جہان میں بھی اعلیٰ مرتبہ پایا۔

بہلول لودھی کے بعد اس کا بیٹا سکندر لودھی تخت نشین ہند ہوا، وہ بھی نیک متبع سنت اور علما سے تعلق رکھتا تھا، مگر اس کا زمانہ دسویں صدی ہجری کا ہے جو اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو اس کا ذکر اس کتاب کی تیسری جلد کے

---

[26] سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۴۳۵

[27] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۷۶

[28] سیر العارفین، ص ۱۷۹

مقدمہ میں کیا جائے گا، جو دسویں صدی ہجری کے علما و فقہا کے حالات پر مشتمل ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

سلاطینِ گجرات

آٹھویں صدی ہجری کے اواخر میں حکومت ہند کی مرکزی حیثیت مضمحل ہوگئی تھی، دارالسلطنت دہلی کا استحکام متزلزل ہوگیا تھا اور اس میں ضعف و کمزوری کے آثار نمایاں ہوگئے تھے، جس کے نتیجے میں اس برصغیر میں کئی علاقائی حکومتیں قائم ہوگئی تھیں، جن میں شمالی ہند کی سلطنت جون پور، دکن کی بہمنی حکومت، علاقہ مالوہ کی حکومت اور گجرات کی حکومت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ حکومتیں مرکزی حکومت سے زیادہ مضبوط اور مستحکم تھیں۔ ان کے بعض سلاطین کا عہد تو بڑا ہی قابلِ رشک تھا۔ ان کے زمانے میں اسلامی علوم وفنون کی بے حد نشر و اشاعت ہوئی اور علما و فقہا نے بڑی علمی خدمات انجام دیں۔ ان کے کارنامے تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ ثبت رہیں گے۔

سلطنتِ گجرات

بادشاہِ دہلی سلطان فیروز شاہ نے ایک شخص فرحت الملک کو، جسے نظام شاہ مفرح کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا تھا، گجرات (کاٹھیاواڑ) کا سپہ سالار اور والی بنا کر بھیجا۔ فیروز شاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے سلطان محمد شاہ نے بھی گجرات کی ولایت اسی کے سپرد کیے رکھی، لیکن اس شخص نے وہاں جو طریق حکومت اختیار کیا، وہ مذہبی اعتبار سے وہاں کے مسلمانوں کے لیے نہایت نقصان رساں اور ذہنی کوفت کا باعث تھا۔ وہ اس طرح کہ اس نے اس نہج سے ہندوؤں سے تعلقات استوار کیے کہ جس کی وجہ سے اسلامی احکام پر عمل درآمد کا سلسلہ قطعی طور سے رک گیا اور پورے علاقے میں شعارِ کفر اور بت پرستی کی وسیع پیمانے پر ترویج ہونے لگی۔ اس سے گجرات کے علما و فضلا انتہائی مشوش ہوئے، انھوں نے ۷۹۳ھ میں سلطان محمد شاہ کو ایک مکتوب ارسال کیا، جو اس مضمون پر مشتمل تھا کہ والی گجرات فرحت الملک اعمالِ

ناشائستہ کا مرتکب ہو رہا ہے، وہ رواج اصنام اور رونق اوثان ہیں اس قدر جری ہو گیا ہے کہ بلدۂ سومنات قبلۂ ضلال قرار پا گیا ہے، اس نواح میں شعارِ اسلام کی اہانت کا دور دورہ ہے، منبر و محراب کو عزت و حرمت سے کچھ حصہ اور مسجد کو صوم و صلوٰۃ سے کوئی نصیبہ باقی نہیں رہا۔ لہٰذا فوری طور پر اس تشویش ناک صورتِ حال کو زیرِ غور لایا جائے اور ایسا اقدام کیا جائے، جو موجبِ تقویتِ دین اور باعثِ ترویجِ اسلام ہو[۲۹]۔

علمائے گجرات کا یہ خط سلطان کے ملاحظہ میں آیا تو وہ نہایت غمگین ہوا اور ربیع الثانی ۷۹۳ھ میں فرحت الملک کو الگ کر کے اس کی جگہ ظفر خاں کو گجرات کا والی مقرر کیا۔ ظفر خاں حسنِ سلوک، پرہیزگاری، شرعِ محمدی کی پابندی اور دیانت و امانت میں بہت مشہور تھا۔ سلطان نے علمائے گجرات کی عرض داشت دیکھتے ہی اس کا لقب بڑھا اور صوبہ گجرات کی حکومت اس کے سپرد کی۔ ظفر خاں علم و علما کا قدر دان تھا، اس نے وہاں پہنچتے ہی علما سے رابطہ پیدا کیا، ان سے مراسم بڑھائے اور انھیں یقین دلایا کہ اس ملک میں احکامِ اسلام کا نفاذ ہوگا اور رسومِ کفر کو ختم کر دیا جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ سومنات گیا، وہاں جامع مسجد تعمیر کی، اس میں مؤذن، امام و خطیب اور خدام مقرر کیے اور امورِ شرعیہ کی تنفیذ کے لیے کوشاں ہوا۔ اس کے طرزِ حکومت اور خدمتِ اسلام سے علاقۂ گجرات کے اہلِ اسلام بھی خوش تھے اور غیر مسلم بھی اس کے عدل و انصاف سے متاثر تھے۔ وہ رعایا کا محافظ، کریم النفس، حلیم الطبع، جرأت مند، مجاہد فی سبیل اللہ، عادل اور فاضل حکمران تھا۔ وہ ۷۹۳ھ میں سلطانِ دہلی محمد شاہ کی طرف سے والیِ گجرات کی حیثیت سے یہاں آیا تھا، لیکن جب دہلی کی مرکزیت ختم ہو گئی تو ۸۱۰ھ میں مظفر شاہ کے لقب سے ملقب ہو کر علاقۂ گجرات کا مستقل حکمران بن گیا اور سلطان مظفر شاہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے ۸ ربیع الثانی ۸۱۴ھ کو وفات پائی۔ اس وقت اس کی عمر اکتر برس سے زائد تھی۔

---

[۲۹] تاریخ فرشتہ ج ۲، ص ۲۶۵ (بعنوان سلاطین گجرات)

سلطان احمد شاہ گجراتی

مظفر شاہ کے بعد ۸۱۴ھ میں اس کی وصیت کے مطابق گجرات کے اورنگِ سلطنت پر اس کا پوتا احمد شاہ متمکن ہوا۔ یہ ۷۹۳ھ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے والد کا نام تاتار خاں تھا۔ مظفر شاہ کو اس کی ولادت کی اطلاع اُن دنوں دورانِ سفر میں ملی تھی جب کہ وہ دہلی سے روانہ ہو کر والی و مختار کی حیثیت سے گجرات جا رہا تھا، اور اس نے اس خوش خبری کو اپنے لیے نیک فال قرار دیا تھا۔

احمد شاہ عادل و منصف، رعیت پرور، عوام کا بہی خواہ، مظلوموں کا حامی، فریادیوں کا دادرس، شجاع و غازی، حوصلہ مند، علما کا قدردان، ترقیِ علم کا خواہاں اور نیک اطوار حکمران تھا۔ اس کا دل مذہبی جوش سے لبریز تھا اور وہ خلافِ شرع امور سے سخت تنفر کا اظہار کرتا تھا۔ اس نے بڑی فتوحات حاصل کیں، کئی شہروں اور قلعوں کو مسخر کیا، اور اپنی قلمرو کو امن و امان اور عدل و انصاف سے بھر دیا۔

اس کی تعمیرات کا سلسلہ بھی وسیع تھا۔ ۸۱۵ھ میں علاقۂ گجرات میں دریا کے کنارے اس نے ایک نیا شہر تعمیر کیا، جس کا نام احمد آباد رکھا اور اس کو اس نے اپنا دارالسلطنت بنایا۔

احمد آباد کی تعمیر کا آغاز چار آدمیوں سے ہوا، اور چاروں کے نام احمد تھے۔ ایک شیخ احمد کھٹو، دوسرے سلطان احمد، تیسرے شیخ احمد، اور چوتھے قاضی ملا احمد۔ جب اس کی زمین کی پیمائش کی گئی تو اس کا ایک سرا سلطان احمد کے ہاتھ میں اور دوسرا شیخ احمد کھٹو کے ہاتھ میں تھا۔ شیخ احمد کھٹو ارضِ ہند کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ دوسرے شیخ احمد اور قاضی ملا احمد بھی وقت کے بزرگ اور صاحب کمال تھے۔ سلطان احمد بھی صلاحِ ظاہری و باطنی سے آراستہ تھا۔ احمد آباد اس دور کے خطۂ ہند کا، وہ شہر تھا جس کا دنیا میں جواب نہ تھا، اور ان ہی بزرگوں کی دعا اور اخلاصِ نیت سے ایسا پُر رونق شہر آباد ہوا۔[۴۰]

---

[۴۰] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے ص ۱۱۳۔ بحوالہ خلاصۃ التواریخ ذکر صوبہ گجرات و مرآتِ سکندری۔

یہ شہر اب بھی قائم ہے اور اس کا شمار ہندوستان کے مشہور اور بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔ اس کی تعمیر کا تمام خرچ شاہی خزانہ سے ادا کیا گیا اور لوگوں کو بلا کسی معاوضے کے مکان دیے گئے۔ یہ ایک بڑا شہر تھا جس میں شاندار مسجدیں بنائیں اور مدرسے قائم کیے۔ اس کے بعد دریائے سابرمتی کے کنارے گجرات کی سرحد پر ایک اور شہر احمد نگر کے نام سے ۸۲۳ھ میں آباد کیا۔

سلطان احمد شاہ گجراتی کے عدل و انصاف کے کئی واقعات کتب تاریخ میں مرقوم ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ ایک مرتبہ اس کے داماد نے ایک شخص کو بلا وجہ قتل کر ڈالا۔ قاضی کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا تو اس نے مقتول کے وارثوں کو قاتل سے چالیس اونٹ بطور دیت دلا کر معاملہ ختم کرا دیا۔ لیکن جب بادشاہ کے سامنے آخری رائے کے لیے مقدمہ کے کاغذات پیش ہوئے تو اس نے اس سے اختلاف کیا اور قاتل سے تمام تعلقات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا کہ اس سے مقتول کے ورثا تو مطمئن ہو سکتے ہیں لیکن میں مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ جن لوگوں کو میری عنایات اور قرب کا شرف حاصل ہے، وہ اس فیصلے سے جری اور بے باک ہو جائیں گے اور خطرہ ہے کہ بے گناہوں کو بغیر کسی وجہ کے قتل کرنا شروع کر دیں گے۔ سلطان نے قاضی کا فیصلہ مسترد کر دیا اور حکم دیا کہ قاتل کو سر بازار پھانسی دی جائے اور ساتھ ہی ہدایت کی کہ اس کی نعش ایک دن اور ایک رات تختۂ دار پر لٹکتی رہے تاکہ لوگ اس سے عبرت پکڑیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور دوسرے روز اس کی لاش کو وہاں سے اٹھا کر دفن کیا گیا۔

اسی طرح ایک دوسرا واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے جس سے معلوم ہو گا کہ وہ جرائم کی تفتیش اور واقعہ کی تہ تک پہنچنے میں کس قدر مستعد تھا۔

ایک روز وہ دریا کی سیر کو نکلا اور اس کی نظر ایک مٹکے پر پڑی جس کا منہ بند تھا اور اس کو دریا کی موجیں بہائے لے جا رہی تھیں، اس نے مٹکے کو دریا سے باہر نکلوایا، کھولا تو اندر ایک نعش تھی، جس کو کسی نے مٹکے میں بند کر کے دریا کی موجوں کے سپرد کر دیا تھا۔

سلطان نے احمد آباد کے کمہاروں کو اکٹھا کیا اور پوچھا کہ یہ مٹکی کس نے بنایا، کس نے بیچا اور کس کے پاس بیچا۔ ایک کمہار نے نشاندہی کی اور قاتل پکڑا گیا جو ایک سرکاری ملازم تھا۔ بادشاہ نے اس کو قتل کیا اور اس کی نعش سرِ بازار رکھی گئی کہ لوگوں کو عبرت ہو۔

یہ ایک مبلغِ اسلام بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے ملک میں وسیع پیمانے پر اسلام کی تبلیغ کی، لوگوں کو اسلامی احکام سے آشنا کیا، بتوں کو توڑا، مسجدیں تعمیر کیں، تبلیغِ اسلام کے مراکز قائم کیے اور دینی تعلیم کے لیے مدارس کھولے۔

اس کو حسن آشامی اور ذاتی انتقام لینے سے سخت نفرت تھی۔ اس نے کئی حکمرانوں کو جو اس کے خلاف صف آرا تھے، پکڑا اور رہا کر دیا۔ معاف کرنا اس کے عادت میں داخل تھا۔ چھوٹے پر رحم اور کمزور کی مدد اس کا شیوہ تھا۔

اس کے زمانے میں بہت سے علمائے کرام اور فقہائے عظام برِ صغیر کے مختلف حصوں سے آکر گجرات میں مقیم ہو گئے تھے، ان کا ذکر اس کتاب کے آئندہ صفحات میں کیا گیا ہے۔

سلطان احمد شاہ کے عہد کے علما نے اس کے لیے کئی کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں شیخ بدرالدین محمد بن ابوبکر دمامینی لائقِ تذکرہ ہیں۔ انھوں نے اس کے لیے ابنِ مالک کی التسہیل کی شرح لکھی، مصابیح الجامع کے نام سے صحیح بخاری کی شرح سپردِ قلم کی۔ عین الحیوۃ کے نام سے دمیری کی حیوۃ الحیوان الکبریٰ کا اختصار کیا، مغنی اللبیب کی شرح لکھی، جس کو تحفۃ الغریب کے نام سے موسوم کیا، اس کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔

سلطان احمد شاہ گجراتی کو علما سے بے حد عقیدت اور محبت تھی، یہ شیخ رکن الدین کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا۔ نماز کا پابند، شریعت کا متبع اور زاہد و عابد تھا۔ اس کی جس لڑائی کا تعلق مذہبی معاملے سے ہوتا، اس میں اس کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ اس نے چوّن ۵۴ برس عمر پائی۔ تینتیس ۳۳ سال حکومت کی اور ۸۴۶ھ میں فوت ہوا۔

نویں صدی ہجری میں تختِ گجرات پر اور بھی کئی حکمران متمکن ہوئے اور ان کے عہد میں علماء و فقہانے بھی علمی و تصنیفی خدمات انجام دیں، مگر یہاں ان کے تذکرہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ دسویں صدی ہجری میں جن سلاطین نے گجرات کی زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی، ان میں سلطان محمود بیکرہ ہر اعتبار سے اونچے درجے کا حکمران تھا۔ اگر اللہ نے مدد کی حالات سازگار رہے اور قلم و قرطاس سے رابطہ قائم رہا تو اس کتاب کی تیسری جلد کے مقدمہ میں گجرات کے اس عظیم حکمران کی زندگی کے بعض اسلامی اور دینی گوشوں کی وضاحت کی جائے گی، اور اس کے عہدِ حکومت کے علمائے کرام کا تذکرہ کیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

سلطنتِ بہمنیہ

برِصغیر پاک و ہند کی علاقائی سلطنتوں میں ایک سلطنت دکن کی بہمنیہ سلطنت تھی، جو اس دور کی مضبوط سلطنت تھی اس میں کئی نامور سلطان پیدا ہوئے۔ آگے پڑھنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں مختصر طور پر چند ضروری باتیں بیان کی جائیں۔

حسن بہمنی

سلطنتِ بہمنیہ کا پہلا حکمران حسن بہمنی تھا، جو علاء الدین بہمنی کے نام سے دکن کے تختِ حکومت پر متمکن ہوا۔ سوال یہ ہے کہ یہ کون تھا اور اس کے نام کے ساتھ بہمنی کی نسبت کیوں قائم ہوئی؟ تاریخ کی کتابوں میں اس کے متعدد وجوہ بیان کیے گئے ہیں، جن میں ایک یہ ہے کہ علاء الدین خلجی کے امرا میں سے ایک شخص ظفر خاں علائی تھا۔ وہ صوبہ پنجاب کا والی تھا، اس کا مستقر ملتان تھا، اس کی موت کے بعد اس کا خاندان مالی اعتبار سے پریشانی کا شکار ہو گیا اور وہ خاندان ملتان میں آباد تھا۔ اس خاندان کے ایک فرد کا نام حسن تھا، جو ظفر خاں علائی کا بھانجا ہوتا تھا۔ تلاشِ روزگار کے لیے یہ ملتان سے چلا اور دہلی پہنچا۔ رات کے آخری حصے میں یہ جمنا کے کنارے آکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد نمازِ فجر کا وقت ہوا تو نماز میں مشغول ہو گیا، طویل سفر کی وجہ سے تھکا

چُور ہو چکا تھا، نماز ادا کر کے وہیں سو گیا، گرمی کا موسم تھا۔ آفتاب طلوع ہوا، اس کی شعاعیں کے چہرے پر پڑنے لگیں اور یہ عرق آلود ہو گیا مگر اس کو کچھ پتا نہ تھا۔ اب ایک سانپ بل سے نکلا۔ اس نے اپنا پھن اس کے چہرے پر پھیلایا اور سایہ کر دیا۔ اتنے میں جمنا کے کنارے اشنان کی غرض سے ایک ہندو آیا، جس کا نام گانگو پنڈت تھا اور وہ نجومی تھا۔ لوگ اس کو گانگو پنڈت منجم کے نام سے پکارتے تھے۔ پنڈت نے اس کو دیکھا تو خیال کیا کہ یہ نوجوان اونچے بخت اور بلند قسمت کا مالک ہے، وہ اس کی طرف بڑھنے لگا تو سانپ وہاں سے ہٹ کر بل میں داخل ہو گیا۔ پنڈت نے اس کو جگایا۔ حال دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک غریب الدیار اور بے سروسامان مسافر ہے پنڈت کو اس پر رحم آیا، اپنے مکان پر لے گیا اور مہمان ٹھہرایا، چند روز بعد حسن نے پنڈت سے کہا کہ میں آپ پر بوجھ بنا ہوا ہوں، مجھے کسی کام پر لگایا جائے، پنڈت نے اس کو اپنے باغ میں بھیج دیا اور کاشتکاروں کی نگرانی اس کے سپرد کر دی۔ ایک روز حسن باغ میں بیٹھا تھا کہ چند مزدور شور کرتے ہوئے آئے اور کہا کہ ہم باغ میں ہل چلا رہے تھے کہ اس کا پایہ زمین میں دھنس گیا ہے اور کوشش کے باوجود باہر نہیں آتا۔ حسن نے جا کر دیکھا تو واقعی ہل کا سرا زمین میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے پایہ کے اطراف سے زمین کھودنے کا حکم دیا۔ زمین کھودی گئی تو معلوم ہوا کہ ہل کا پایہ ایک آہنی زنجیر میں پھنسا ہوا ہے اور زنجیر دیگ کے منہ پر بندھی ہوئی ہے۔ اب زمین کھود کر دیگ نکالی گئی تو وہ طلائی اشرفیوں سے بھری ہوئی تھی۔ حسن نے تمام اشرفیاں مزدوروں کے سر پر رکھیں اور پنڈت کے گھر پہنچا دیں۔ پنڈت کو واقعہ سے مطلع کیا گیا تو وہ اس کی دیانت داری سے نہایت متاثر ہوا۔ اس نے یہ بات شہزادہ محمد تغلق کو بتائی، تو اس نے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ شہزادہ نے اس کو دیکھا اور اس سے باتیں کیں تو اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ شریف زادہ گردشِ زمانہ کا ستم رسیدہ ہے۔ اس کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس نے اپنے باپ سلطان غیاث الدین تغلق سے بات کی، جو اس زمانے میں ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ بادشاہ نے اس کو حاضرِ خدمت ہونے کا حکم دیا۔ وہ بادشاہ کے پاس گیا تو اس نے

پوچھا تم کون ہو؛ کہاں کے رہنے والے ہو اور کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟ اس نے بتایا کہ میرا نام حسن ہے، ملتان سے آیا ہوں اور ظفر خاں علائی کا ہمشیر زادہ ہوں۔ سلطان غیاث الدین تغلق ظفر خاں سے نہ صرف واقف تھا بلکہ اس کے دوستوں میں سے تھا۔ بادشاہ بننے سے پہلے جب وہ ملک غازی تغلق کے لقب سے ملقب تھا، تو سلطان علاء الدین خلجی نے ظفر خاں کے قتل ہونے کے بعد اسی کو اس کی جگہ مقرر کیا تھا اور ملتان، دیپال پور اور سمانہ وغیرہ کا جو علاقہ ظفر خاں کے سپرد تھا وہ اس کی حکمرانی میں دے دیا گیا تھا۔ ظفر خان کا نام سنتے ہی سلطان نے اس کو تسلی دی، اور ایک صدی منصب سے سرفراز کیا۔

دوران قیام دہلی کے اس کے بارے میں بعض ایسے واقعات بھی مشہور ہیں جو تقریباً ہر بادشاہ کے متعلق کتب تاریخ میں مذکور ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک تقریب میں بہت سے لوگ شیخ نظام الدین اولیا کی خدمت میں حاضر ہوتے، جن میں بادشاہ دہلی بھی موجود تھا۔ بادشاہ تو شیخ کی دعوت میں شرکت کے بعد واپس آگیا مگر حسن اس خیال سے باہر کھڑا ہو گیا کہ شاید شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملے اتنے میں شیخ نے فرمایا: پادشاہے رفت و دیگر بادشاہ آمد۔ یہ الفاظ انھوں نے بار بار فرمائے، اور خادم سے کہا۔ باہر ایک شخص لوگوں کے ہجوم میں کھڑا ہے، جو بادشاہ ہے اس کو اندر بلا لاؤ۔ خادم آیا اور واپس چلا گیا۔ عرض کیا، حضور! باہر تو کوئی بادشاہ نہیں ہے، صرف ایک شخص کھڑا ہے جو پتا نہیں، کون ہے اور اس پر بادشاہی کے آثار نہیں ہیں۔ فرمایا۔ وہی بادشاہ ہے، اس کو یہاں لے آؤ۔ خادم نے اس کو اندر بلایا اور شیخ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس نے ادب سے سلام کیا۔ شیخ نے اس کے لیے دعا کی اور ایک نان عطا فرمایا اور کہا۔ یہ تاج سلطنت ہے اور یہ رباعی پڑھی:

عالم زتست خیز و قدم نہ کہ مدتیست — در انتظار دولت تو بودہ روزگار
اسفندیار ملکی و دارائے دین و داد — زنیساں ہزار سال بمانی تو یادگار

دکن کو روانگی

تاریخ میں مرقوم ہے کہ جب سلطان غیاث الدین تغلق سے حسن کو منصب یک صدی عطا کیا تو گانگو پنڈت منجم نے اس کا زائچہ بنایا اور اس کو خوش خبری سنائی کہ آثارِ نجوم سے معلوم ہوتا ہے، تم سلطنت کے مرتبے کو پہنچو گے۔ میری خواہش ہے کہ تیرے نام کے ساتھ میرا نام بھی آنا چاہیے۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ اس نے یہ بھی بتایا، تم دکن کی سلطنت کے مالک بنوگے۔ اب حسن نے ایک مُہر بنوائی، جس پر "حسن گانگوئے بہمنی" کے لفظ کندہ کرائے اور دکن جانے کے لیے بے تاب ہوا۔ اسی اثنا میں سلطان نے قتلغ خان کو دکن کا صوبہ دار مقرر کیا اور حکم دیا کہ امیرانِ یک صدی میں سے کوئی امیر قتلغ خاں کے ساتھ دکن جانے پر آمادہ ہو تو بڑے شوق سے جا سکتا ہے، ان کے لیے وہاں منصب اور جاگیریں مقرر ہیں، جو مع اضافے کے عطا کی جائیں گی۔ حسن جو پہلے ہی دکن جانے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا، فوراً تیار ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کو وہاں ہگری، گنجی اور رائے باغ وغیرہ مواضع بطور جاگیر مرحمت کیے۔

دکن میں وہ بادشاہت کے خواب دیکھنے لگا اور [illegible] اس کے حصول کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ اس زمانے میں وہ بزرگانِ دین کی خدمت میں بھی حاضر ہوتا اور ان سے دعا کی درخواست کرتا۔ ایک روز موضع گنجی گیا، وہاں اس دور کے معروف بزرگ شیخ سراج جنیدیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ مسجد کی تعمیر میں مشغول تھے اور مزدوروں کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ حسن نے مؤدب ہو کر سلام کیا اور ان کے ساتھ کام میں شریک ہو گیا۔ اس نے چونے سے بھری ہوئی ٹوکری سر پر اٹھائی۔ شیخ نے دیکھا تو مسکرانے۔ فرمایا [illegible] سن، سلطنت کا بوجھ سر پہ اٹھانے ہوتے ہے۔ اتنے میں ظہر کا وقت ہوا، شیخ نے نماز کی تیاری کی اور وضو کے لیے پانی لینے لگے، تو حسن فوراً آگے بڑھا، لوٹا ہاتھ میں پکڑا اور شیخ کو وضو کرانے لگا۔ اس وقت شیخ دھوپ میں بیٹھے تھے اور سورج کی تیز شعاعیں ان کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ حسن شیخ کے آگے آ گیا اور ان کو دھوپ سے بچاتا رہا۔ شیخ نے فرمایا حسن ہم سے چترِ شاہی چاہتا ہے۔

حسن کی بادشاہت

سلطان غیاث الدین تغلق کے بعد اس کا بیٹا محمد خان تغلق تخت نشینِ ہند ہوا تو اکثر مقامات کے لوگوں کو اس سے کچھ شکایات پیدا ہوئیں اور معاملہ بغاوت تک پہنچ گیا۔ دکن کے امیرانِ صدہ نے بھی باہم مشورہ کر کے بادشاہ سے ٹکر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے اسماعیل فخ کو اپنا بادشاہ بنایا اور ناصر الدین شاہ کا خطاب دیا۔ حسن گانگوے بہمنی کو اس کا امیر الامرا مقرر کیا گیا اور اس کو ظفر خان کا خطاب عطا ہوا۔ اسماعیل فخ اگرچہ بہت تجربہ کار تھا، مگر بوڑھا ہو چکا تھا، اس لیے دکن کی بادشاہت سے دست بردار ہو گیا۔ اور سب نے مل کر حسن بہمنی کو بادشاہ بنا لیا۔ حسن ان سب سے لائق، عقل مند، بہادر اور معاملہ فہم تھا۔ سلطان محمد تغلق نے دکن پر فوج کشی کی، مگر وہ اس سلطنت کو ختم نہ کر سکا۔ حسن گنگوے بہمنی ۲۴ ربیع الاول ۷۴۸ھ کو جمعہ کے روز دکن کے تختِ حکومت پر متمکن ہوا۔ اس کو سلطان علاء الدین کا خطاب دیا گیا شیخ سراج جنیدی نے اس کو تخت نشین کیا۔ اور اس نے اپنی مہر پر "بندۂ کمترین درگاہ بجائی علاء الدین حسن گنگوئے بہمنی" کے الفاظ کندہ کرائے۔

حکومت میں علمائے کرام کی شمولیت

سلطان علاء الدین حسن بہمنی، بزرگانِ دین اور علمائے کرام کا بہت احترام کرتا تھا اور ان سے اس کی بڑی عقیدت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے وزرا و امرا میں علما کو بھی شامل کیا۔ جن میں سید صدر الشریف سمرقندی، سید محمد بدخشی، مولانا محمد اسحاق سرہندی، سید محمد ہروی، سید نور الدین، ملک سیف الدین غوری، شیخ سراج الدین جنیدی، میر زین العابدین اور سید تقی الدین اصفہانی قابلِ ذکر ہیں۔

اس نے گانگو پنڈت منجم کو بھی شریکِ حکومت کیا اور اسے صدر محاسب بنایا۔

رسالہ نصائح الملوک

ملک سیف الدین غوری نے جو وقت کے عالم اور سلطان حسن بہمنی کے وکیل السلطنت تھے، سلطان کے لیے ایک رسالہ قلم بند کیا، جس کا نام رسالہ نصائح الملوک رکھا۔ یہ

رسالہ اوصافِ سلطان، آدابِ شاہی، طریقِ حکومت اور قوانینِ ملک کے موضوع سے متعلق ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ بادشاہ کے لیے لازم ہے، وہ مخلوقِ خدا کو ہمیشہ فیض پہنچاتا رہے۔ اہلِ ہنر، اہلِ علم، اہل اللہ، فقرا، شعرا اور مورخین کے ساتھ اعزاز و اکرام کا برتاؤ کرے۔ دین دار افراد کو دوسروں پر ترجیح دے اور صلاح و مشورہ اور تفویضِ امور میں انھیں مقدم رکھے۔ وہ یہ کبھی نہ بھولے کہ جو لوگ سلطنت و عدالت کے منصب پر فائز ہوں، ان کا دین سے بہرہ مند ہونا ضروری ہے۔ وہ اہلِ دنیا کی گفتگو اور ان کے طرزِ عمل سے متاثر ہو کر دین کو ترک نہ کرے۔

انھوں نے اس کتاب میں بادشاہ کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی رقم فرمایا ہے کہ بادشاہ کو بُردبار ہونا چاہیے۔ اربابِ حاجت اور غربا و فقرا، اگر اپنی ضرورتیں لے کر اس کے پاس آئیں اور بات چیت میں سخت کلامی و نافرمانی پہ اتر آئیں تو رنجیدہ خاطر نہ ہو، بلکہ تحمل اور غور سے ان کی بات سنے۔ بادشاہ کسی کو ظلم و تعدی کا ہدف نہ ٹھہرائے ہمیشہ خدا کے قہر و غضب سے ڈرتا رہے، اللہ سے استعانت کرے، اس کی نصرت کے لیے ملتجی ہو اور اس کی بندگی و عبادت بجالائے۔ اپنے ملک میں اسلام کی ترقی کے لیے کوشاں ہو اور ایسے اقدامات کرے جو مسلمانوں اور اسلام کے لیے بالخصوص اور عام رعایا کے لیے بالعموم سود مند ہوں۔ اسے چاہیے کہ ہر اہم کام کا آغاز مشورے سے کرے، جس کام میں اہلِ علم اور اصحابِ فہم کا مشورہ شامل ہوگا وہ بہتر نتائج کا حامل ہوگا۔ لیکن اگر مشورے کے بعد کام کا نتیجہ حسبِ منشا نہ نکلے تو مجلسِ شوریٰ کو کوتاہ فہم اور بدطینت نہ قرار دیا جائے۔ مشورہ ان لوگوں سے کیا جائے جو مخلص، اصحابِ فہم، تجربہ کار، دیندار، دُور اندیش، اہلِ علم اربابِ دانش، نیک نیت اور راز دار ہوں۔ سلطنت کے تمام محکموں پہ ان ہی لوگوں کو متعین کیا جائے جو عادل، وفادار، مستعد، خدا ترس، حق شناس، صداقت شعار، باصلاحیت، خدمت گزار، متدین، حلیم الطبع، بلند اخلاق، خوش گفتار، اچھی سیرت کے مالک، باہمت، محنتی اور رعایا کے لیے مہربان ہوں۔

عدالت

سلطان علاء الدین حسن بہمنی کے زمانے میں محکمۂ قضا پر متبحر علما اور بلند مرتبہ فقہا متعین تھے۔ کوئی فیصلہ خلافِ شرع نہ ہوتا تھا۔ مولانا صدر الشریف صدر عدلیہ تھے اور ان کے ماتحت مفتی، محتسب، فوج دار اور داروغہ تھے۔ ہر علاقے میں محکمۂ قضا، محکمۂ احتساب قائم تھا۔ قصبات و دیہات میں بھی قاضی اور محتسب متعین تھے، تمام فیصلے صدر عدلیہ کے ملاحظہ میں لائے جاتے تھے، صدر کے مقرر کردہ فقہا و علما ان کو اچھی طرح پڑھتے اور پھر اس کو ان کی صواب و خطا سے مطلع کرتے۔ کسی مقدمے کا فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہ لگتی تھی شہادتوں اور فریقین کے بیان کے بعد فوراً فیصلہ کر دیا جاتا۔ فیصلے کے بعد مدعا علیہ کو مرافعہ کے لیے ایک مہینے کی مہلت دی جاتی تھی۔

اگر حکام و عمال کسی پر زیادتی کرتے اور یہ معاملہ مقدمہ کی صورت میں قاضی کی عدالت میں آتا تو مسل مقدمہ سلطان کی خدمت میں پیش کی جاتی۔ وہ اس کا مطالعہ کرتا اور کبھی کبھی خود سلطان بھی صدر الشریف کی عدالت میں جاتا، مقدمہ مرجوعہ کی روداد اور گواہوں کے بیانات سنتا اور صدر الشریف کے طریق سماعت اور فیصلے سے خوش ہوتا۔

اشاعتِ علم کا اہتمام

سلطان حسن بہمنی نے مملکتِ دکن میں اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ اشاعت علم کا بھی اہتمام کیا تھا۔ اس کے لیے دینی مدارس قائم کیے اور ان میں تدریس کے لیے جید علمائے کرام کی خدمات حاصل کیں۔ مسجدیں تعمیر کیں اور خطیب و امام مقرر کیے، جن کو تاکید کی تھی کہ وہ دین محمدی کی تبلیغ کریں۔ اس نے لوگوں کو عربی اور فارسی کی تعلیم دینے کی طرف خصوصیت سے اعتنا کیا، تاکہ وہ اس کے ذریعے مکارمِ اخلاق اور مسائلِ دینی سیکھ سکیں۔ چوں کہ وہ خود بھی علم و ادب کے زیور سے آراستہ تھا، لہٰذا اس نے علما و فضلا کی قدر و منزلت اور فروغِ علم میں کوئی کسر اٹھا

نہ رکھی۔ جو علما اس کے دربار میں جمع تھے اور جن سے وہ بہت متاثر بھی تھا، ان میں مولانا لطف اللہ سبزواری، ملا معین الدین ہروی، مفتی احمد ہروی، مولانا محمد اسحاق سرہندی، ملا فضل اللہ انجوی، ملا حکیم علیم الدین تبریزی، حکیم نصیر الدین شیرازی، صدر الشریف سمرقندی، ملک رکن الدین غوری، ملک سیف الدین غوری اور سید رضی الدین جگاجوت کے نام خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔

سلطان حسن بہمنی نے اپنے تینوں لڑکوں یعنی شہزادہ محمد، محمود اور داؤد کی تعلیم کے لیے علمائے کرام کو مقرر کیا اور یہ خدمت مولانا فضل اللہ انجوی کے سپرد کی۔ اس نے علما کے لیے معقول مشاہروں اور طلبا کے لیے وظیفوں کا انتظام کیا۔ ایک مدرسہ ایلچ پور برار میں جاری کیا، جس میں مولانا محمد ابراہیم سندھی اور مولانا محمد یحییٰ سندھی کو فرائض تدریس انجام دینے پر مقرر کیا۔

قدردانی علم و ہنر

حسن بہمنی علم و ہنر کا بہت قدردان تھا۔ اس سلسلے کے متعدد واقعات میں سے چند واقعات یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ ایک مرتبہ ایک قاری عرب سے دکن آیا۔ سلطان سے ملا، وہ اس کے علم و فضل سے متاثر ہوا۔ قرآن سنا تو بہت خوش ہوا۔ قاری کی بڑی تکریم کی۔ شہزادوں کی تعلیم کے لیے اس کو مقرر کیا۔ قاری کو بھی بادشاہ کی قدردانی اور عزت افزائی سے مسرت ہوئی اور وہ دکن ہی میں سکونت پذیر ہوگیا۔ اس نے بادشاہ کے لیے ہفت قرأت میں ایک قرآن مجید لکھا۔ حاشیے پر سنہری بیل بوٹے بنائے، شاندار جدولیں تیار کیں اور اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ قرآن مجید کو دیکھ کر بہت محظوظ ہوا اور قاری و کاتب کو انعام و اکرام سے نوازا۔ کہتے ہیں، یہ قرآن مجید سلطان ٹیپو شہید کے مدراس کے کتب خانے میں موجود تھا، قاضی القضات مولانا صبغت اللہ نے اس کی نقل کرائی تھی اور اب یہ منقول قرآن مجید حیدرآباد (دکن) میں مولوی عطاء اللہ حسین مرحوم کے کتب خانے کی زینت ہے۔ رہا اصل اور منقول عنہ قرآن مجید کا نسخہ تو وہ

سلطان ٹیپو کی شہادت اور مدراس کی تباہی کے بعد مفقود ہو گیا۔[۳۱]

۲- ایک نودارد سپاہی نے سلطان کی خدمت میں ملازمت کی درخواست پیش کی۔ سلطان نے اس کو بلایا اور پوچھا، تمہارا حسب نسب کیا ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟ سپاہی نے عرض کیا۔ جہاں پناہ! میرا حسب نسب شمشیر و علم اور تیر و کمند ہے۔ سلطان اس جواب سے بہت خوش ہوا اور اس کو اسی وقت فوج میں ملازمت دے دی۔

۳- ایک روز ایک سپاہی دربار عام میں آیا اور نوکری کے لیے التجا کی۔ سلطان نے کہا، کوئی ہنر جانتے ہو؟ کہا میں یہ ہنر جانتا ہوں کہ مالک کے سامنے جان نثار کر دی جائے، اور ساتھ ہی اپنے آپ پر وار کرنے کے لیے تلوار میان سے نکال لی۔ درباریوں نے اس سے تلوار پکڑ لی اور اسے سمجھایا کہ جاں نثاری کا یہ موقع نہیں۔ سلطان نے اس کی جواں مردی سے خوش ہو کر اسی وقت اس کو اپنے محافظوں کی جماعت میں شامل کر لیا۔

حسن بہمنی سرزمین دکن کا وہ سلطان تھا، جو ہندوؤں کے ساتھ گہرے تعلقات قائم رکھنے کا حامی تھا۔ اس نے ان کو سلطنت کے اہم عہدوں پر فائز کیا اور ہمیشہ ان کی مدد کرتا رہا۔

دکن کے اس پہلے بہمنی سلطان نے جو تاریخ میں علاءالدین حسن بہمنی کے نام سے مشہور ہے، گیارہ سال دو ماہ سات روز حکومت کرنے کے بعد سرسٹھ ۶۷ سال کی عمر پا کر یکم ربیع الاول ۷۵۹ھ کو اس دار فانی سے عالم جاودانی کا سفر کیا۔[۳۲]

سلطان محمد شاہ بہمنی

محمد شاہ بہمنی اپنے والد سلطان حسن شاہ بہمنی کے بعد ۳ ربیع الاول ۷۵۹ھ کو دکن کے

---

[۳۱] محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن ص ۲۱۶، ۲۱۷۔

[۳۲] اس کے مفصل حالات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ ج ۱، در ذکر سلاطین بہمنیہ و سلاطین دکن ص ۴۲۰ تا ۴۲۳۔ نیز دیکھیے محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن ص ۲۶ تا ۲۲۰۔

اورنگِ حکومت پر فائز ہوا۔ اس کو شوبزنگ شیخ سراج جنیدی نے مسندِ بادشاہت پر بٹھایا۔ یہ ایک اولوالعزم، عقیل و فہیم، صاحبِ شان و شوکت اور دبدبہ و طنطنہ کا بادشاہ تھا۔ اپنے پیشرو کی طرح علم اور علما سے اس کو خاص تعلق تھا اور اولیا و مشائخ کا بہت قدردان تھا۔ اس کے ارکانِ سلطنت میں ملک سیف الدین غوری سید شریف سمرقندی اور ملا محمد بن مولانا عین الدین بیجاپوری ایسے یگانۂ روزگار علمائے کرام شامل تھے۔

شیخ زین الدین کا بیعت سے انکار

شیخ زین الدین دولت آبادی، دکن کے نامور عالم دین اور شیخ تھے اور ان کی مشیخت و تدین کا پورے ہندوستان میں شہرہ تھا۔ تمام مشائخِ دکن سلطان محمد شاہ بہمنی کی بیعتِ سلطنت میں داخل ہو گئے تھے مگر شیخ زین الدین نے اس سے انکار کر دیا۔ ان سے سلطان کی بیعت کے لیے بہت اصرار کیا گیا مگر انھوں نے کسی کی ایک نہ مانی اور اپنی رائے پر قائم رہے۔ شیخ سے انکار کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا۔ بادشاہ شراب پیتا اور منہیات کا ارتکاب کرتا ہے۔ جب تک وہ اس سے تائب نہیں ہوتا اور منہیات کو ترک نہیں کرتا، میں اس کی بیعت نہیں کروں گا۔

کچھ عرصہ بعد سلطان دولت آباد گیا تو وہاں بھی بیعت کے لیے کوشش کی گئی اور چند معتمد علیہ اشخاص کو شیخ کی خدمت میں یہ پیغام دے کر بھیجا گیا کہ یا تو وہ اس کی بیعت کر لیں یا اس کے دربار میں تشریف لائیں۔ شیخ نے اس پیغام کے جواب میں سلطان کو ایک رقعہ لکھا جس میں یہ تحریر فرمایا کہ ایک مرتبہ تین آدمی کافروں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ ان میں ایک عالم، ایک سیّد اور ایک مخنث تھا۔ کافروں نے آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ ان تینوں کو بت کدے میں لے جایا جائے اور کہا جائے کہ وہ بت کو سجدہ کریں۔ جو سجدہ کرے اس کو رہا کر دیا جائے اور جو انکار کرے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے وہ عالم کو بت خانے میں لے کر گئے۔ اس نے سجدہ کر دیا اور رہا ہو گیا۔ پھر سیّد کو لے گئے، اس نے بھی عالم کا طریقہ

اختیار کیا اور جان بچالی۔ اب مخنث کی باری آئی تو اس نے کہا۔ میں تمام عمر ناشائستہ افعال اور غیر شرعی امور میں مبتلا رہا ہوں۔ نہ عالم ہوں نہ سید۔ میری نجات کیوں کر ہوگی۔؟ میں کس برتے پر بت کو سجدہ کروں؟ میرے نزدیک قتل ہو جانا غیر اللہ کو سجدہ کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔ آخر اس سے نجات کی کوئی صورت تو پیدا ہوگی، یا کم از کم یہی ہوگا کہ قتل ہونے کے بعد، آئندہ ان برائیوں کے ارتکاب سے بچ جائیں گا، جن کے ارتکاب کا امکان ہے۔ اس سے آگے شیخ نے لکھا، لہٰذا اے بادشاہ! اس فقیر کی مثال اس مخنث کی سی ہے۔ میں آپ کے ظلم سہتا رہوں گا، نہ آپ کی بیعت کروں گا نہ آپ کی مجلس میں آؤں گا، تاوقتیکہ آپ منہیات سے توبہ نہ کریں اور شہر سے شراب خانے نہ اٹھائیں۔

بادشاہ کو یہ خط پہنچا تو پڑھ کر سخت غصہ آیا اور ان کو شہر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ شیخ نے اسی وقت مصلیٰ اٹھایا، عصا ہاتھ میں پکڑا اور شیخ برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کے قریب جا کر بیٹھ گئے اور کہا، میں یہاں بیٹھا ہوں کون ہے جو مجھ کو اٹھانے کی جرأت کرے۔ شیخ کی اس ثابت قدمی سے بادشاہ اپنے دل میں سخت نادم ہوا، اور خیال کیا کہ فقیروں کو ستانا درست نہیں۔ اب اس نے صدر الشریف کے ہاتھ یہ مصرع لکھ کر شیخ کی خدمت میں بھیجا: ؏

من زانِ تو ام تو زانِ من باش

شیخ زین الدین نے صدر الشریف سے کہا۔ اگر سلطان محمد شاہ غازی شریعتِ محمدی کا احترام کرے، ممالکِ محروسہ میں شراب خانوں کو بند کر دے اور قضات و صدور کو حکم دے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغ کے لیے کوشاں ہوں تو بادشاہ کا، زین الدین فقیر سے زیادہ کوئی دوست نہ ہوگا۔ ساتھ ہی یہ رباعی پڑھی:

تا من بزیم بجز نیکوئی نہ کنم — جز نیک دلی و نیک خوئی نہ کنم
آنہا کہ بجائے ما بدیہا کردند — تا دست رسد بجز نیکوئی نہ کنم

بادشاہ کو اپنے بارے میں جب شیخ کے ان خیالات کی اطلاع ہوئی اور لفظ "غازی" کا پتا چلا جو شیخ نے اس کے نام کے ساتھ استعمال کیا تھا تو بہت خوش ہوا، اسے نیک شگون سمجھا اور حکم دیا کہ اس کے نام کے ساتھ آئندہ یہ لفظ لاحق کیا جائے۔ پھر فوری طور پر گلبرگہ گیا، جو اس کا دارالخلافہ تھا، وہاں جا کر حکم جاری کیا کہ شراب کی تمام دکانیں جو ممالکِ محروسہ میں کھلی ہوئی ہیں، بند کر دی جائیں۔ اور ہر معاملے میں شرعِ محمدی کا رواج عمل میں لایا جائے۔

اس کے بعد اس نے شیخ سے باقاعدہ سلسلہ مراسلت شروع کر دیا اور ان کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہو گیا۔ شیخ بھی اس کے خطوط کا جواب دیتے اور اس کے لیے دعا فرماتے۔

سلطان محمد شاہ بہمنی کا فوجی اور عسکری نظام بہت اچھا تھا اور یہ دکن کا مجاہد و غازی بادشاہ تھا۔ اس نے کافروں کے ساتھ کئی جنگیں لڑیں اور کامیاب رہا۔ نواحِ دکن کے ہندو حکمران اس کا اصل ہدف تھے۔

علما کی قدر و منزلت

سلطان علمائے کرام کا بہت قدردان تھا۔ امورِ سلطنت کے بارے میں ان سے مشورے کرتا اور ان پر عمل پیرا ہوتا۔ اس کے زمانے میں مندرجہ ذیل علما و مشائخ دکن میں موجود تھے، ان میں سے بعض تو باقاعدہ رکنِ حکومت تھے اور بلند مناصب پر فائز تھے اور بعض تدریس و افتا کی خدمات انجام دیتے تھے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

شیخ زین الدین دولت آبادی، شیخ محمد سراج جنیدی، مولانا عین الدین بیجاپوری، صدر الشریف سمرقندی، شیخ بہاء الدین انصاری مانڈوی، مولانا عبدالغنی صدر برار، مولانا نظام الدین برنی، مولانا غوث الدین سمانوی، مولانا حکیم ظہیر الدین تبریزی، مولانا نجم الدین مفتی برار، مولانا سید ابراہیم سندھی اور مولانا سید یحییٰ سندھی۔

وفات

آخر عمر میں سلطان نے لشکر کشی کا سلسلہ بند کر دیا تھا اور عیش و عشرت میں مشغول

ہوگیا تھا۔ اس نے ۹ ذی قعدہ ۷۷۶ھ کو وفات پائی۔ سترہ سال نو مہینے پانچ روز حکومت کی۔ اس کی عمر سینتالیس[۴۵] سال بنتی ہے[۵۳]

سلطان مجاہد شاہ بہمنی

سلطان محمد شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مجاہد شاہ بہمنی وارثِ تخت بنا۔ یہ شجاع، دانشمند، رعایا پرور، دیندار، علما کا قدردان اور علم دوست بادشاہ تھا اس کا نام بھی مجاہد تھا اور عملاً بھی مجاہد تھا۔ اس نے مخالفین اسلام کے ساتھ نہ صرف جنگیں لڑیں اور انھیں شکست دی بلکہ ان کے بُت مسمار کیے اور دکن اور اس کے گردونواح میں اسلام کو پھیلانے اور مسلمانوں کے وقار کو بلند کرنے کی کوشش کی۔ مجاہد شاہ کو اس کے چچا داؤد بن سلطان علاء الدین حسن بہمنی نے قتل کر دیا تھا۔ یہ حادثہ ۱۷ ذی الحج ۷۷۹ھ کو رونما ہوا۔ مجاہد شاہ کی مدتِ سلطنت تین سال ایک مہینہ آٹھ دن ہے۔ یہ عین عالمِ جوانی میں صرف بائیس سال کی عمر میں اس دنیائے دوں سے رخصت ہوگیا۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔

داؤد شاہ بن حسن شاہ بہمنی

اپنے برادر زادہ سلطان مجاہد شاہ کو قتل کر کے، داؤد شاہ بن سلطان علاء الدین حسن شاہ بہمنی نے اس کی جگہ لی۔ داؤد شاہ کی تخت نشینی کے موقع پر بہمنی خاندان اور امرائے سلطنت میں شدید اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ ایک گروہ اس کی تخت نشینی کا حامی تھا، ایک سخت مخالف اور ایک اعتدال پسند اور صلح جو تھا۔ مجاہد شاہ کی بہن جس کا نام روح پرور تھا، داؤد شاہ کی شدید مخالف تھی اور خاندان بہمنیہ میں یہ خاتون بڑے اثر و رسوخ کی مالک تھی۔ یہ اپنے نوجوان اور لائق بھائی کے قتل پر بدرجہ غایت حزن و ملال میں مبتلا تھی اور داؤد شاہ سے اس کا انتقام لینے کے درپے تھی۔ اس کی رائے

---

[۵۳] مفصل حالات کے لیے دیکھیے تاریخ فرشتہ ج ۱، ذکر سلاطین بہمنیہ ص ۲۲۳ تا ۲۵۵۔ محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن، ص۔ ۲۲ تا ۲۷۔

یہ تھی کہ سلطنت کا وارث قاتل کو نہ بنایا جائے۔ بلکہ سلطان علاء الدین حسن شاہ بہمنی کے چھوٹے بیٹے محمود شاہ کو بنایا جائے۔ اس میں تو یہ کامیاب نہ ہو سکی مگر اس نے داؤد شاہ کو بہت جلد قتل کرا دیا اور چند روز میں بھائی کے قتل کا بدلہ لے لیا۔ داؤد شاہ کو ۲۱ محرم ۷۸۰ھ کو اس وقت قتل کیا گیا جبکہ وہ جامع مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا اور حالتِ سجدہ میں تھا۔ اس کو مجاہد شاہ کی بہن روح پرور نے باگہ نامی ایک شخص سے قتل کرایا تھا جو کہ داؤد شاہ کے مصاحبوں میں سے تھا ــــــ

ــــــ داؤد شاہ نے صرف ایک مہینہ پچیس دن حکومت۔

کہتے ہیں یہ دلیر اور بہتر اوصاف کا حامل سلطان تھا۔ آثار بتاتے ہیں کہ اگر اس کو موقع ملتا تو امور مملکت کو بڑے عمدہ طریق سے چلاتا۔

محمود شاہ بہمنی

داؤد شاہ نے اپنے قتل کے بعد چھوٹے بھائی محمود شاہ کے لیے تختِ حکومت خالی کیا۔ اس کے ارکانِ حکومت میں علمائے دین بھی شامل تھے، جن میں وکیل السلطنت ملک سیف الدین غوری، مشہور فاضل و مصنف علامہ سعد الدین تفتازانی کے شاگرد میر فضل اللہ انجو اور ملا محمد قاسم مشہدی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے حالاتِ زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے دین اور اولیا و مشائخ کی عزت اس کے دل میں جاگزین تھی اور اہم معاملات ملکی کو ملک سیف الدین غوری کے مشورہ سے انجام دیتا تھا، جو وکیل السلطنت کے منصب پر فائز تھے اور عالم دین مخلص عقل و فہم کی دولت سے مالا مال، مملکت کے خیر خواہ اور متدین بزرگ تھے

محمود شاہ کے تذکرہ میں مورخین لکھتے ہیں کہ وہ سلیم النفس، خوش اخلاق، شرع محمدی کا پابند، حلیم الطبع، منصف مزاج، رعایا پرور، عالم دین اور مسائلِ فقہ سے دلچسپی رکھنے والا بادشاہ تھا۔

مسائلِ فقہ پر نظر

عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کی طرف وہ بہت توجہ دیتا تھا۔ قاضی

محتسب اور صدر عدالت احکام شرع کے اجرا میں تاخیر نہ کرتے تھے اور معاملاتِ فقہیہ کے اِمضا میں کسی نوع کا توقف نہ ہوتا تھا۔ خود بادشاہ گاہے گاہے عدالت میں جاتا۔ مدعی اور مدعا علیہ کے اظہارات اور شہادتوں سے مطلع ہوتا، قاضی کے فیصلے کو غور سے سنتا اور اس کو خالص شرعی اور فقہی نقطہ نظر سے ہدفِ فکر ٹھہراتا۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔

ایک عورت، ارتکابِ زنا کے جرم میں گرفتار ہوئی۔ وہ بیک وقت چار آدمیوں سے تعلق رکھتی تھی۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو قاضی کے سوال کرنے پر اس نے بتایا کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ فعل حرام ہے۔ میرا گمان تھا کہ جس طرح ایک مرد چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے، اسی طرح ایک عورت کو بھی شرعاً بیک وقت چار مردوں کے عقد میں رہنے کی اجازت ہوگی۔ میں اس غلط فہمی اور شبہ کی وجہ سے اس فعل کا ارتکاب کرتی رہی۔ اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ حرام ہے میری پچھلی خطا معاف کی جائے، آئندہ کبھی اس کی مرتکب نہ ہوں گی۔ قاضی، عورت کی یہ بات سن کر متحیر ہوا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ سلطان محمد شاہ نے قاضی کو پریشان دیکھا تو بولا:

الحدود تندرء بالشبہات۔

شبہات کی وجہ سے حدود ساقط ہو جاتی ہیں۔

لہٰذا عورت کو رہا کر دینا چاہیے۔ چنانچہ قاضی نے اس عورت کو بری کر دیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ تعجب ہے، ایک مسلمان عورت جو مسلمان حکومت میں رہ رہی ہے، اتنی بنیادی اور ضروری بات سے بھی واقف نہیں کہ ایک عورت بیک وقت چار مردوں سے شادی نہیں کر سکتی۔ بات یہ ہے کہ ملکِ ہند کے کئی سو سال پیشتر کے دور کو اس دور پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ پورا علاقہ غیر مسلموں سے بھرا ہوا تھا، نہ تعلیم عام تھی، نہ اخلاق و کردار کو سنوارنے اور اسلام کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوئی ہمہ گیر اور موثر صورت کسی کے سامنے تھی۔ اس ماحول میں اگر دُور دراز کے کسی علاقے کی

کوئی عورت غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ہے تو کون سی تعجب کی بات ہے۔ سلطان یا قاضی کا فرض تھا کہ معاملہ کے تمام گوشوں کو سامنے رکھتا اور سزا کے بجائے عفو کے پہلو کو ترجیح دیتا اور اس نے یہی کیا۔

عالم و شاعر بادشاہ

سلطان محمود شاہ بہمنی، دکن کا وہ بادشاہ تھا، جو علوم متداولہ کا عالم اور عربی و فارسی کا ماہر تھا۔ اہلِ زبان کے ساتھ دونوں زبانوں میں بے تکلفی سے انہی لب و لہجہ میں گفتگو کرتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ شاعر بھی تھا اس کے یہ شعر تذکروں میں مرقوم ہیں:

آنجا کہ لطف دوست دہد منصب مراد　　　بخت سیاہ و طالع میمون برابر است

عاقبت در سینہ کار خون فاسد می کنند　　　رخصتے اے دل کہ از الماس نشتر می خورم

خضر پرسود است در بیع متاع عافیت　　　می روم ایں جنس را از جائے دیگر می خرم

اس کی ایک خوبی یہ تھی کہ عربی لہجہ میں نہایت عمدہ قرآن مجید پڑھتا تھا۔

حافظ شیرازی کا قصد ہند

محمود شاہ بہمنی کی قدر دانیٔ علما اور علم دوستی کے چرچے اتنے عام ہوئے کہ عرب و عجم تک پہنچ گئے اور علما و فضلا دکن کا رُخ کرنے لگے۔ ان حضرات میں حافظ شیرازی کا نام بھی تاریخ میں مسطور ہے۔ حافظ نے دکن کا قصد کیا، لیکن بعض ایسے موانع پیش آئے کہ وہ ہندوستان نہ آسکا۔ اس کا پتا ایک رکنِ حکومت فضل اللہ انجو کو چلا تو اس نے حافظ کو زادِ راہ بھیجا اور تشریف لانے کی درخواست کی۔ حافظ اس سے نہایت خوش ہوا، سامانِ سفر تیار کیا، فضل اللہ انجو کی طرف سے موصولہ رقم میں سے کچھ رقم اپنے بھانجوں کو دی، کچھ بیواؤں میں تقسیم کی اور کچھ قرض خواہوں کے حوالے کی اور ہندوستان کو روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک دوست ملا جس کا سامان ڈاکوؤں نے لوٹ لیا تھا، اس کی داستان سُنی تو بقیہ رقم از راہِ ہمدردی اس کو دے دی اور خود خالی ہاتھ ہو گیا۔ اتفاق سے خواجہ زین العابدین ہمدانی اور خواجہ محمد گازرونی سے

ملاقات ہوئی تو ان کو سارا واقعہ سنایا۔ انھوں نے اخراجات کی ذمہ داری خود قبول کی اور ہندوستان کو چل پڑے۔ اب ایک مقام پر محمود شاہی کشتی میں سوار ہوئے تو طوفانی ہوائیں چلنے لگیں اور دریا کی موجوں نے ایک دوسرے سے ٹکرانا شروع کیا۔ حافظ اس سے گھبرا کر اور خوف زدہ ہو کر بعض احباب کو ملنے کے بہانے کشتی سے اتر گیا۔ ایک غزل فضل اللہ انجو کے نام لکھ بھیجی اور خود واپس شیراز کی راہ لی۔ غزل یہ ہے:

دمے با غم بسر بردن جہان یکسر نمی ارزد ۔۔۔ بے فروش دلق ما کزین بہتر نمی ارزد
بکوئے می فروشانش بجامی برنمی گیرند ۔۔۔ زہے سجادۂ تقویٰ کہ یک ساغر نمی ارزد
رقیبم سرزنش ہا کرد کزین خاک در بگذر ۔۔۔ چہ افتاد این سر ما را کہ خاک در نمی ارزد
بسے آسان می نمود اول غم دریا بوئے زر ۔۔۔ غلط کردم کہ یک موجش بصد من زر نمی ارزد
شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جان درو درجست ۔۔۔ کلاہ دل کش ست اما بہ ترک سر نمی ارزد
بشو این نقش دل تنگی کہ در بازار یک رنگی ۔۔۔ بہ نعمتہائے گوناگوں مے احمر نمی ارزد
چو حافظ در قناعت کوش واز دنیائے دون بگزر ۔۔۔ کہ یک جو منت دونان جہان یکسر نمی ارزد

میر فضل اللہ انجو کو یہ غزل پہنچی تو اس نے سلطان محمود شاہ سے سارا واقعہ بیان کیا۔ اس کو حافظ کے دکن نہ آنے کا سخت افسوس ہوا اور ملاّ محمد مشہدی کو جو فضلائے عصر میں سے تھے، اچھی خاصی رقم اور بہت سے تحائف دے کر حافظ کے پاس شیراز بھیجا۔

فقہا و محدثین کا احترام

بہرحال محمود شاہ بہمنی، محدثین و واعظین، علمائے کرام اور شعرائے نامدار کا بہت خیال رکھتا تھا، ان کی مدد کرتا، ان سے دینی و مذہبی مسائل پوچھتا اور درخواست کرتا کہ وہ اس کو اوامر و نواہی کی تعلیم دیتے رہیں۔ وہ نماز روزے کا پابند تھا اور علما و فضلا سے مجالست رکھتا تھا۔ جس مجلس میں مسائل فقہیہ اور احادیثِ نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تذکرہ ہوتا اس میں دیر تک بیٹھتا۔ علامہ سعدالدین تفتازانی کے شاگرد مولانا فضل اللہ انجو، ملاّ محمد بدخشانی، ملاّ محمد قاسم مشہدی، مولانا محمد اسحاق سرہندی اور ملاّ احمد قزوینی سے تو وہ بہت ہی متاثر تھا اور ان سے اکثر مسائل فقہ دریافت کرتا۔ ملکی معاملات

ہیں بھی یہ اس کے مشیر تھے اور ان کے مخلصانہ مشوروں کو وہ بڑی اہمیت دیتا تھا۔

وفات

محمود شاہ بہمنی نے ۷۹۹ھ کے آخر میں وفات پائی۔ انیس سال، نو ماہ، چوبیس روز حکومت کی۔[۳۴۳]

سلطان فیروز شاہ بہمنی

محمود شاہ کی وفات کے بعد جو قابل ذکر بادشاہ دکن کا وارث تاج و تخت بنا اس کو تاریخ ابوالمظفر غازی فیروز شاہ بہمنی کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس نے یکم ربیع الاول ۸۰۰ھ کو زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس کے ارکانِ سلطنت میں علما و فقہا بھی شامل تھے جن میں مولانا امیر فضل اللہ انجو شیرازی، مولانا لطف اللہ سبزواری، امیر فضل اللہ انجو کے داماد مولانا تقی الدین، مولانا غیاث الدین بن مولانا فضل اللہ انجوی، مولانا محمد اسحاق سرہندی ملا داؤد بیدری۔ مولانا حسن گیلانی، مولانا سید محمد گازرونی، محمد منہاج جنیدی، شاہ کمال کشمیری اور سید محمد بن مولانا عین الدین بیجاپوری خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔

یہ بادشاہ بہت سی خوبیوں کا مالک تھا، ہر روز تبرکاً قرآن مجید کا ایک حصہ کتابت کرتا تھا۔ جب پورے قرآن مجید کی کتابت ہو جاتی تو اس کو لوگوں کی تلاوت کی غرض سے مسجد کے لیے وقف کر دیتا۔ علما و فقہا سے بے حد تعلق رکھتا تھا۔ یہ عجیب قسم کی عادات و اطوار کا حامل تھا۔ عالم دین، نماز روزے کا سخت پابند، علما کا بے حد قدر دان، اولیا و مشائخ کی صحبت کا انتہائی مشتاق، قرآن مجید کی باقاعدہ تلاوت کرنے والا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ شعر و نغمہ، رنگ اور مے نوشی کا بھی عادی تھا۔ کہا کرتا تھا کہ مجھ میں یہ دو ایسی برائیاں پائی جاتی ہیں جو نہایت ہی افسوسناک ہیں اور میں ان کی وجہ سے اللہ سے بے حد خوف زدہ ہوں اور بہت توبہ و استغفار کرتا ہوں۔

لوگوں سے ربط و تعلق

وہ رعایا کے ہر فرد سے تعلق و ربط رکھنے اور گفتگو میں بے تکلف ہو جانے کا

---

[۳۴۳] تفصیل کے لیے دیکھیے: تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۴۶۴ تا ۴۶۹۔ محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن، ص ۳۹۶ تا ۴۱۵

عادی تھا۔ وہ ہر شخص سے کہتا تھا کہ جب میں امور بادشاہت اور معاملات عدالت سے فارغ ہو جاؤں تو تمھارے ہی جیسا ایک فرد ہوں، مجھ سے کسی قسم کے حجاب اور تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ میں حاکم ہوں اور نہ تم محکوم ہو۔ مجھ سے اسی طرح بات کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو۔ بس اتنا خیال رہے کہ کسی کی بدگوئی اور غیبت نہیں ہونی چاہیے۔ وہ غیبت اور بدگوئی کو سخت بُرا سمجھتا تھا۔ اس کے اس بے تکلفانہ اندازِ گفتگو اور میل جول سے بعض امرائے سلطنت کو اس سے شکایت بھی تھی اور وہ اس کو اس سے روکتے بھی تھے، مگر وہ اپنی رائے پر قائم تھا۔ ایک زمانے میں وہ عورتوں کا بہت رسیا ہو گیا تھا اور اس باب میں اس نے علما سے گفتگو بھی کی اور متعہ کا مسئلہ بھی سامنے آیا۔ اس کے باوجود وہ بلند مرتبے کا حامل بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں سلطنتِ بہمنیہ کی فتوحات کا دائرہ دور تک پھیل گیا تھا اور اس نے بہت وسعت اختیار کر لی تھی۔ فیروز شاہ منکرین اسلام اور کفار کا شدید دشمن تھا۔ اس نے کفار کے ساتھ چوبیس جنگیں لڑیں، ان کو ہزیمت دی اور ہندوستان میں ان کی طاقت کو کمزور کیا۔ اس کے دربار میں علما و فضلا کی بڑی جماعت موجود تھی اور وہ ان کے مشوروں پر عمل پیرا ہوتا تھا۔ وہ علومِ حکمیہ اور دیگر علوم میں اپنے تمام معاصرین سے فوقیت لے گیا تھا اور مولانا فضل اللہ بن فیض اللہ شیرازی کا شاگرد تھا۔ اس نے علوم دینیہ باقاعدہ پڑھے تھے اور بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گیا تھا۔ وہ سریع الادراک اور قوی الحافظہ حکمران تھا۔

درس و تدریس

وہ علما کی مجلس میں طالب علم کی حیثیت سے بیٹھتا اور ان سے استفادہ کرتا۔ طلبا میں مدرس بن کر جاتا اور انھیں مختلف درسی کتابوں کا درس دیتا۔ وہ اگرچہ گوناگوں مہماتِ ملکی کی وجہ سے نہایت مصروف بادشاہ تھا لیکن اس کے باوجود ہفتے میں تین دن، ہفتہ اتوار اور بدھ کو طلبا کی مجلس میں جاتا اور تدریس کے فرائض انجام دیتا۔ وہ ان کو باقاعدہ زاہدی، شرح تذکرہ، مقاصد، تحریر اقلیدس اور مطول پڑھاتا تھا اور یہ

کتابیں جن موضوعات و عنوانات پر مشتمل ہیں ان میں پوری تیاری کر کے مسند درس پر بیٹھتا اور طلبا سے مخاطب ہوتا تھا۔

اس کو درس و تدریس اور اشاعتِ علوم کا بہت شوق تھا۔ اس میں ایک بڑی سلطنت کا خود مختار اور مطلق العنان بادشاہ ہونے کے باوصف یہ خوبی تھی کہ درویشوں میں درویش، صوفیا میں صوفی، فقرا میں فقیر، طلبا میں طالب علم، دوستوں میں دوست اور علما میں عالم تھا۔ علاوہ ازیں وہ فاتح، کشور کشا، مدبر، معاملہ فہم اور جرأت مند حکمران تھا۔ اور بہت سے معاملات میں سب سے ممتاز تھا۔

کتب خانہ

سلاطین بہمنیہ کو کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ فیروز شاہ چوں کہ علم دوست حکمران تھا لہٰذا یہ بھی جمع کتب کے لیے کوشاں رہتا۔ اس کے عہد میں عرب و عجم سے بہت سی نادر کتابیں منگوائی گئیں اور شاہی کتب خانہ میں رکھی گئیں جس کی وجہ سے یہ ایک بہترین کتب خانہ بن گیا تھا۔ پھر جیسے جیسے سلطنت بہمنیہ میں زوال آتا گیا، یہ کتب خانہ بھی ختم ہوتا گیا۔ اس ضمن میں محبوب الوطن کا مصنف رقم طراز ہے کہ سلاطین بہمنیہ کے کتب خانے میں ایک ایسا قرآن مجید بھی تھا جو نہایت خوش خط، مطلا و مذہّب اور زر افشانی کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔ یہ قرآن مجید شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ کا مکتوبہ تھا۔ سلطنتِ بہمنیہ کے انقراض کے بعد یہ قرآن مجید فتح اللہ عماد الملک صوبہ برار کے ہاتھ آیا اور برار کے قلعہ گاویل گڑھ میں رکھا گیا۔ ربیع الثانی کے مہینے میں لوگ اس کی زیارت کو آتے تھے۔ عماد شاہی سلطنت ختم ہونے کے بعد بھی یہ قرآن وہیں رہا۔ جب گاویل گڑھ کا قلعہ مرہٹوں کے قبضے میں آیا تو مرہٹوں نے بھی اسے ضائع نہیں کیا بلکہ جہاں تھا وہیں پڑا رہا۔ آخر یہ قرآن نواب صلابت خاں صوبہ دار برار ملازم سرکار نظام (دکن) کے قبضے میں آیا۔ پھر نواب ابوالخیر خاں شمس الامرا کو معلوم ہوا تو وہ اس کو ایلچ پور لے گئے۔ مصنف محبوب الوطن کا کہنا ہے کہ وہ قرآن مجید اب تک ان کے کتب خانہ میں موجود ہے[۳۵]

---

۳۵ محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن، ص ۴۲۴، ۴۲۵۔

اسی طرح مصنف محبوب الوطن کا بیان ہے کہ سیبو یہ کی الکتاب جو کتب خانہ بہمنیہ کی ملکیت تھی، خود اس نے لاہور میں سردار ٹھاکر سنگھ سندھا والے کے پاس دیکھی۔ اس نے یہ کتاب حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ سردار ٹھاکر سنگھ کسی صورت میں بھی یہ کتاب اس کو دینے پر رضامند نہ ہوا[۳۶]

کیا مملکت کو ورثا میں تقسیم کرنا جائز ہے۔؟

سلطان فیروز شاہ بہمنی ہر پنجشنبہ کی رات کو ایک خاص مجلس علمی منعقد کرتا تھا، جس میں تمام علما شریک ہوتے اور مختلف مسائل زیر بحث آتے۔ بادشاہ اس میں خود بھی حصہ لیتا۔ ہر مسئلہ میں اپنے دلائل بیان کرتا اور دوسروں کے دلائل سنتا۔ اگر علمی اعتبار سے اس کا موقف کمزور ہوتا تو خاموش ہو جاتا اور بلا جھجک دوسرے کی بات مان لیتا۔

ایک مرتبہ اس نے علما سے ایک فقہی سوال کیا کہ کیا مملکت، فرائض و وراثت کے دائرے میں داخل ہے؟ اس پر ملکیت کا اطلاق ہوتا ہے؟ اور سلاطین کی اولاد میں اسے بطور وراثت کے تقسیم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

ملا محمد گازرونی اور ملا احمد قزوینی نے جواب دیا کہ ممالک کو ورثا میں تقسیم کرنا جائز نہیں ہے اور اس کو ملکیت قرار دینا خلافِ شرع ہے، اس لیے کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مال و متاع کا اطلاق مملکت پر نہیں کیا۔ اور تقسیم میراث مال و متاع ہی میں ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں دلیل دیتے ہوئے کہا کہ ممالک کو ورثا میں تقسیم کرنا اس لیے بھی ناجائز ہے کہ اس سے مملکت میں ضعف آجاتا ہے اور وہ تھوڑے ہی عرصے میں منقرض ہو جاتی ہے۔ بعض دیگر علما نے کہا کہ ورثا میں مملکت و ممالک کی تقسیم کا مسئلہ مختلف فیہ ہے لیکن عدمِ جواز کا پہلو مرجح ہے۔

اسی طرح جاگیر کا مسئلہ بھی سامنے آیا اور علما نے کہا کہ اس کی تقسیم کے بارے میں علما کے مختلف اقوال ہیں مگر معتمد علیہ قول یہ ہے کہ جاگیر کی زمین تو تقسیم نہ کی جائے گی البتہ

---

[۳۶] محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن، ص ۲۲۵۔

اس سے جو آمدنی ہو گی اس کو تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس ضمن میں مملکت اور جاگیر میں فرق یہ ہے کہ مملکت اور اس کی آمدنی میں تقسیم جائز نہیں ہے اور باقی رہی جاگیر، تو اس کی زمین کی تقسیم تو جائز نہیں مگر اس کی آمدنی کو وارثوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جاگیر عطیہ سلطانی ہے۔ یہ سلاطین نے معطی لہ کو اس غرض سے عطا کی کردہ جاگیر کی آمدنی کو اپنی ضروریات پر صرف کرے اور جاگیر میں مالکانہ حق رکھے۔ اگر ورثا جاگیر کی زمین آپس میں تقسیم کر لیں گے تو اس میں کمزوری واقع ہو جائے گی اور پھر تقسیم در تقسیم کا دائرہ اس درجہ وسیع ہو گا کہ چند ہی روز میں اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ عطیۂ جاگیر سے ایک غرض یہ بھی ہوتی ہے کہ جاگیر، مورثِ اعلیٰ کی اولاد میں ہمیشہ تک نسلاً بعد نسل قائم رہے، لیکن تقسیم کی صورت میں یہ غرض فوت ہو جاتی ہے۔ بادشاہ، علما کا یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا۔"[۵۳]

اندازہ کیجیے، مملکت کو ورثا میں بطور وراثت کے تقسیم کرنے کے بارے میں علمائے عدم جواز کا جو موقف اختیار کیا، وہ صدیوں پیشتر کے مطلق العنانی کے دور میں ایک خود مختار بادشاہ کی مجلس میں کس درجہ ان کی حق بیانی پر دلالت کناں ہے۔ علما دراصل بادشاہ کو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مملکت ایک فرد کی ملکیت نہیں ہے کہ وہ اس کا وارث بن جائے اور پھر اس کو اپنی اولاد میں تقسیم کرنا شروع کر دے۔ یہ تمام باشندگانِ ملک کی دولت ہے اور وہی اس کے حق دار ہیں۔ اس کو تو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ تقسیم کا عمل جاری کر کے اس کو کمزور کرنے کی۔

رہا جاگیر کے مسئلہ میں ان کا نقطۂ فکر تو اس زمانے میں اس کا یہی جواب ہو سکتا تھا۔

شفقت و رحم دلی

فیروز شاہ بڑا شفیق اور رحم دل تھا۔ اس کی شفقت و رحم دلی کے بعض واقعات تو اس کو فقرا و صوفیا کے برابر جا کھڑا کرتے ہیں۔ اس سلسلے کے دو واقعے لائق مطالعہ ہیں۔

---

[۵۳] محبوب الوطن، ص ۴۳۱، ۴۳۲

۱۔ ایک دن وہ دریچے میں بیٹھا سب آنے جانے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک فقیر پر نظر پڑی جو ہاتھ میں کشکول پکڑے جا رہا تھا۔ بادشاہ نے فقیر کو بلایا اور دیکھا کہ کشکول میں جوار کی روٹی کے چند ریزے پڑے ہیں، دیکھ کر بہت افسردہ اور غمگین ہوا کہ میری رعایا آسودہ حال نہیں ہے اور گھر میں جوار کی روٹی پکتی ہے، جبھی تو فقیر کے کشکول میں کوئی اور چیز دکھائی نہیں دیتی۔ فوراً حکم دیا کہ جوار کی کاشت کی بجائے گندم بویا جائے۔ ساتھ ہی فقیروں اور مستمندوں کے لیے شہر کے محلوں اور کوچوں میں بہت سے لنگر کھول دیے، جن میں فقرا اور مستحقین کو روزانہ گیہوں کی روٹی اور حلوہ دیا جاتا تھا۔ کبھی حلوے کے بجائے گوشت بھی ملتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے دکن میں گندم کاشت ہونے لگی اور غربا و فقرا بھی آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ پھر ایک دن دیکھا کہ فقیروں کے توشہ دان حلوے اور کلیچے سے معمور ہیں۔ بہت خوش ہوا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ رعایا کے فقیر بھی اچھا کھانا کھاتے ہیں۔

۲۔ رات کو قصرِ شاہی پر چار ہزار سوار، آٹھ ہزار پیادہ اور چار سو ہاتھی حفاظت کے لیے متعین تھے، جو تمام رات جاگتے رہتے تھے۔ سردی، گرمی، بارش ہر موسم میں ان کا یہی معمول تھا۔ ایک رات شدید سردی پڑ رہی تھی کہ بادشاہ کا جذبہ ترحم بیدار ہوا اور دل میں اس پر سخت افسوس کا اظہار کیا کہ مجھ اکیلے کے لیے کتنے لوگ مصیبت میں پھنسے ہیں اور شدید سرد رات میں باہر کھڑے پہرہ دے رہے ہیں۔ خوف خدا سے کانپ اٹھا اور سوچا کہ قیامت کے روز اگر اس جرم میں پکڑا گیا اور اس سنگدلی کے بارے میں بارگاہ الٰہی سے سوال کیا گیا تو کوئی جواب بن نہ آئے گا اور نجات کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی۔ رات بے چینی سے گزری اور صبح کو اپنی حفاظت: صبا نت کا سلسلہ ختم کردیا۔

تیمور کی خدمت میں سفارت

۸۰۱ھ میں امیر تیمور ہندوستان آیا اور قتل و غارت کر کے واپس چلا گیا۔ بعد ازاں ۸۰۴ھ میں پھر یہ بات مشہور ہوئی کہ تیمور دوبارہ ہندوستان پر فوج کشی کر رہا ہے اور اس کا ارادہ یہ ہے کہ وہ اس ملک کو فتح کر کے دہلی کی حکومت پر اپنے بیٹوں میں سے کسی

ایک کو متمکن کر دے گا جو باقی علاقہ خود بزورِ شمشیر مسخر و مفتوح کرے گا۔ فیروز شاہ نے یہ خبر سنی تو ارکانِ مملکت کے مشورہ سے اپنے وزرا میں سے میر نقی الدین محمد اور مولانا لطف اللہ سبزواری کو تحائف و ہدایا دے کر تیمور کے پاس بطور سفیر سمرقند بھیجا اور اس سے اپنے اخلاص و نیازمندی کا اظہار کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تیمور اس سے خوش ہو جائے اور اگر ہندوستان پر حملہ آور ہو تو اسے کچھ نہ کہے۔ چنانچہ یہ دونوں بزرگ، جو گفتگو میں نہایت محتاط اور امورِ سلطنت کی انجام دہی میں بڑی فراست کے مالک تھے، تیمور کے پاس پہنچے اور فیروز شاہ کی طرف سے اس کو سلام و تحائف پیش کیے۔ اس سے وہ بہت خوش ہوا۔ یہ سفیر چھ مہینے اس کے پاس بطور مہمان رہے اور اس نے ان کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ واپسی پر اس نے بھی فیروز شاہ کو تحائف ارسال کیے۔

شعر و شاعری

فیروز شاہ فارسی کا شاعر بھی تھا۔ عروجی اور فیروزی تخلص کرتا تھا۔ یہ غزل اسی کی ہے جو فرشتہ نے نقل کی ہے:

بدان مشابہ ز غمِ دہر بر دلم تنگ ست / کہ دل بلندت سودائے عشق در جنگ ست
گلِ امید شگفت از نسیمِ وعدہ ولے / ز آفتابِ غمِ انتظار بے رنگ ست
بقطعِ راہِ محبت مخور فریبِ امید / کہ غایتِ ایدش ابتدائے فرسنگ ست
بجز سرودِ محبت نگرد زمزمہ نائے / کہ ہرچہ خارج ایں پردہ تنگ آہنگ ست
دلے بسینہ لبالب ز دوستی دارم / کہ پیشِ اہلِ جہان بے بہاتر از سنگ ست
دماغِ طبعِ عروجی چہ دل کشا چمنی ست / چمن مگوئے کہ آں آسمانِ فرہنگ ست

یہ شعر بھی اسی کے ہیں:

کرشمہ جنبشِ آموز ست مژگانِ درازش را / ستم کردست واجب بر زمان تعلیم نازش را
محبت چاک بر دل می زند ہر گہ کہ در بزمی / بخود مخصوص می بینم تغافل ہائے نازش را
مبادا آسیبِ نقصان یابد از سوزِ دلم تا نے / بدل چون رہ دہم اندیشۂ زلفِ درازش را
نیابد لذتے زاہد ز وصلت از متاعِ خلد / ہماں بہتر کہ در دامن کنی اجرِ نمازش را

فروزی قامت و رخسار آن خورشید تابان را   بسرو و لالہ می سنجد کہ بیند امتیازش را

یہ دو شعر بھی ملاحظہ ہوں:

در آتش ہر زہ فکر زائل نکنی   اندیشۂ بہر خیال مائل نکنی

این نقد خزینۂ دماغست بکوش   تا صرف بجنس ہائے باطل نکنی

سیّد محمد حسینی کے بارے میں فیروز شاہ کی رائے

سیّد محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز دہلی سے گلبرگہ (دکن) گئے تو لوگوں میں مشہور ہوا کہ دہلی سے ایک بہت بڑے بزرگ تشریف لائے ہیں۔ فیروز شاہ جو بزرگانِ دین اور علمائے عظام سے ملاقات کا خواہاں رہتا تھا، فیروز آباد سے گلبرگہ آیا اور ارکانِ سلطنت اور شہزادوں کو ان کی خدمت میں بھیجا۔ خود بھی حاضر ہوا اور بڑے احترام سے پیش آیا۔ لیکن ان کے علم و فضل سے متاثر نہیں ہوا، صرف ان کو ایک صوفی اور نیک آدمی سمجھتا رہا۔

وفات

فیروز شاہ بہمنی ۱۵ شوال ۸۲۵ھ کو اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کو سدھارا۔ پچیس سال سات مہینے پندرہ دن حکومت کی۔ بعض کے نزدیک پینسٹھ سال، بعض کے ستّر سال اور بعض کے نزدیک بہتّر سال عمر پائی [۳۸ھ]

سلطان احمد شاہ بہمنی

سلطان احمد بن داؤد بن حسن بہمنی اپنے بھائی سلطان فیروز شاہ کی زندگی ہی میں ۵ شوال ۸۲۵ھ کو دکن کے تختِ حکومت پر فائز ہو گیا تھا۔ اس کے ارکانِ حکومت میں بعض جیّد علما بھی شامل تھے جن میں مولانا نجم الدین، شیخ حبیب اللہ جنیدی، مولانا عبد الغنی اور ملّا شرف الدین بازندرانی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ اپنے پیش رو کی طرح علما و مشائخ کا عقیدت مند اور قدردان تھا۔ خوش اخلاق، نیک، بہادر، بلند کردار اور معاملہ فہم حکمران

۳۸ھ مفصل حالات کے لیے دیکھیے تاریخ فرشتہ، ج ۱، ص ۳۷۴ تا ۳۹۵۔ محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن ج ۱، ص ۱۵۹ تا ۱۶۸۔

تھا۔ اس کی زندگی کے بعض واقعات ایسے ہیں جن کی وجہ سے یہ تمام بہمنی سلاطین سے ممتاز نظر آتا ہے۔

قبولیتِ دعا

ایک مرتبہ دکن میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے شدید قحط پڑا۔ ندی نالے بند اور نہریں اور تالاب خشک ہوگئے۔ نہ پانی میسر آتا تھا، نہ کہیں سے غلّہ ملتا تھا۔ بادشاہ نے خزانے کا منہ کھول دیا اور لوگوں کی بڑی مدد کی مگر حالات روز بروز بگڑتے چلے گئے۔ خود بادشاہ انتہائی پریشان تھا۔ اس نے گھبرا کر علماء و مشائخ کو نمازِ استسقا کے لیے بھیجا۔ مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ لوگ مزید مصیبت میں مبتلا ہوگئے اور احمد شاہ کی حکومت کو منحوس قرار دینے لگے۔ بادشاہ انتہائی پریشانی کے عالم میں ایک روز خود باہر نکلا، نمازِ استسقا کے لیے جنگل میں گیا، ایک بلند ٹیلے پر جا کھڑا ہوا، چند رکعت نماز ادا کی، نہایت عاجزی و انکساری سے زمین پر سر رکھ دیا، زار و قطار رونے لگا، انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ سے بارش کی دعا کی اور قحط سالی دور کرنے کے لیے ملتجی ہوا۔ تھوڑی دیر بعد آسمان پر بادل چھائے اور زور سے مینہ برسنے لگا۔ بادشاہ نے اللہ کا شکر ادا کیا اور سجدے میں پڑا رہا۔ کپڑے بارش سے تر ہوگئے۔ لوگ گھبرائے اور اس سے گھر جانے کی درخواست کی۔ بولا نہیں آبِ رحمت سے نہیں بھاگوں گا۔ لوگوں نے زور زور سے کہنا شروع کیا "اے احمد شاہ ولی تیری ولایت معلوم ہوگئی۔ اب شہر کی طرف مراجعت کر تاکہ ہم بھی آرام کریں۔" پھر گھر آیا اور اس وقت سے احمد شاہ ولی کے نام سے مشہور ہوگیا۔

مسلمانوں سے لڑائی نہ کی جائے۔ علمائے کرام کی رائے۔

ایک مرتبہ والی مالوہ ہوشنگ شاہ نے کچھ ایسی حرکتیں کیں کہ احمد شاہ کو اس سے مقابلہ کے لیے میدان میں نکلنا پڑا اور لڑائی کا شدید خطرہ پیدا ہوگیا۔ مولانا عبدالغنی اور مولانا نجم الدین جو احمد شاہ کے ارکانِ سلطنت میں سے تھے، اس صورتِ حال سے بے حد پریشان ہوئے اور احمد شاہ سے کہا کہ ہوشنگ شاہ بھی مسلمان ہے اور تم بھی مسلمان ہو، سلاطین بہمنیہ نے آج تک کبھی کسی مسلمان سے جنگ نہیں کی۔ اب تم اپنے ایک غیر مسلم

باجگزار نرسنگھ کی حمایت میں مسلمانوں سے جنگ کے لیے نکل کھڑے ہوا یہ غلط بات ہے۔ احمد شاہ علمائے کرام کی اس گفتگو سے بہت متاثر ہوا، فوج کو واپس جانے کا حکم دے دیا۔ لیکن ہوشنگ شاہ نے احمد شاہ کی اس مراجعت کو اس کی بزدلی پر محمول کیا اور اس کا تعاقب کرنے لگا۔ احمد شاہ نے تنگ آکر علما کو جمع کیا اور کہا کہ اب مجبوراً لڑنا پڑے گا، اور قرآن وحدیث کی رُو سے عقاب وعذاب کا مستوجب وہی ٹھہرے گا جو عاصی و نافرمان ہوگا۔ چنانچہ لڑائی ہوئی اور ہوشنگ شاہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ فریقین کے بے شمار آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے جس کا احمد شاہ کو انتہائی صدمہ ہوا۔ ہوشنگ شاہ کے اہل وعیال گرفتار ہوئے اور احمد شاہ نے ان کو عزت واحترام سے رکھا اور خلعت وانعام دے کر پورے اعزاز کے ساتھ واپس مالوہ بھیجا۔

احمد شاہ صوفی مشرب اور راست باز حکمران تھا، وہ ہر ایک سے حُسنِ اخلاق کے ساتھ پیش آتا اور فقرا ومشائخ کی بے حد تکریم کرتا تھا۔ اس سے پہلے کے تمام بہمنی سلاطین شیخ محمد سراج جنیدی کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے۔ یہ اس خاندان کا پہلا حکمران ہے جو سید محمد حسینی گیسو دراز کا مرید ہوا اور اس سے متاثر ہوکر پھر سب لوگ ان کے دائرۂ ارادت میں آگئے۔

علامہ محمد بن ابوبکر مخزومی دمامینی کا عزم دکن

احمد شاہ کی علم دوستی اور اہلِ علم کی قدردانی کے واقعات سن کر بہت سے علما وفقہا دکن تشریف لے آئے تھے، جن میں ایک عالم دین علامہ محمد بن ابوبکر مخزومی دمامینی کا نام بھی کتبِ تاریخ میں مرقوم ہے۔ یہ وقت کے بہت بڑے ادیب اور عالم وفاضل بزرگ تھے۔ عرب سے گجرات آئے، وہاں کی علمی وادبی محفلوں میں شریک ہوئے اور مختلف علوم وفنون میں علمائے گجرات سے ان کی بحثیں ہوئیں۔ گجراتی علما ان کا مقابلہ نہ کر پاتے اور ہر بحث میں یہ ان کو عاجز کر دیتے تھے۔ بالآخر انھوں نے ان کے علم وفضل کا لوہا مانا اور ان سے استفادہ

کرنے لگے۔ علامہ محمد بن ابوبکر دمامینی یوں تو تمام علوم کے ماہر تھے، لیکن نحو، ادب اور عروض میں تو کوئی عالم ان کی ٹکر کا نہ تھا۔ انھوں نے گجرات میں سلسلۂ تدریس شروع کیا اور طلبائے علم وسیع تعداد میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور استفادہ کرنے لگے۔ پھر گجرات میں دکن کے حکمران احمد شاہ بہمنی کی علم دوستی کی شہرت سنی تو دکن کا قصد کیا اور گلبرگہ پہنچے۔ احمد شاہ سے ملاقات ہوئی تو وہ بڑے اکرام سے پیش آیا۔ دکن میں انھوں نے نحو کی ایک کتاب، وافی، کی جو علم نحو کی کتابوں میں متن متین کی حیثیت رکھتی ہے، شرح لکھی اور منہل الصافی شرح الوافی، اس کا نام رکھا۔ اس شرح کو انھوں نے سلطان احمد شاہ بہمنی کے نام معنون کیا۔ اس کے دیباچہ میں حمد و ثنا کے بعد احمد شاہ کی تعریف کی گئی ہے۔ یہ کتاب کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد (دکن) میں موجود ہے[۳۹]۔

عہدِ احمد شاہی کے علمائے کرام

سلطان احمد شاہ بہمنی کے عہد میں بہت سے علمائے کرام نے دکن کو اپنا مسکن ٹھہرا لیا تھا، ان میں سے مولانا محمد گازرونی، ملا احمد قزوینی، میر ابوالقاسم جرجانی، علامہ محمد بن ابوبکر مخزومی دمامینی، مولانا عبدالغنی مانڈوی، مولانا نجم الدین، مولانا لطف اللہ سبزواری، مولانا محمد تقی الدین اور مولانا غیاث الدین انجو خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان علما میں سے بعض تو باقاعدہ رکن حکومت تھے اور بادشاہ ان کی بڑی تکریم کرتا تھا، وہ ان کی مجلسوں میں بیٹھتا، ان سے استفادہ کرتا، مسائلِ شرعی دریافت کرتا اور قرآن و حدیث کے احکام سنتا تھا۔

زوالِ سلطنت کے اسباب۔ ملا احمد قزوینی کی تقریر

سلطان فیروز شاہ اور احمد شاہ ہمیشہ علما کی مجلس میں بیٹھتے اور مختلف ملکی معاملات سے متعلق ان کی رائے لیتے تھے۔ ایک دن ان دونوں نے دورِ ماضی کے سلاطینِ اسلام

---

۳۹ محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن ص ۵۰۹

کی ترقی و تنزل کے اسباب کے بارے میں علما سے استفسار کیا تو ملا احمد قزوینی نے جو متبحر عالم اور فاضل بزرگ تھے، مجمع علما میں، ان دونوں بہمنی سلاطین کے سامنے اس موضوع پر تقریر کی اور اس ضمن کے تیرہ اسباب کی وضاحت فرمائی، جو اختصار کے ساتھ درج ذیل ہیں :

۱- انھوں نے بتایا کہ ابتدائے اسلام میں حکومت کی بنیاد امت کے معززین کی رائے اور مشورے پر قائم تھی - بادشاہ خادم اور رعیت مخدوم تھی - جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے : سید القوم خادمھم - خلافتِ راشدہ کے زمانے تک شورائی عمل جاری رہا - کسی فردِ مسلم نے بھی اس سے انکار نہیں کیا - خلافتِ راشدہ کے منقرض ہونے کے بعد جب سلطنت و امارت کا دور شروع ہوا تو شوریٰ کی عمارت منہدم ہو گئی اور شخصی حکومت قائم ہوئی جس میں بادشاہ مخدوم ٹھہرا اور رعیت خادم قرار پا گئی - ولی عہدی کا سلسلہ وجود میں آیا ؛ تمام سلاطین اسی پر عمل کرتے رہے - اس سے شخصی طریقِ سلطنت کا رواج پڑ گیا - اس نے جہاں شورائی نظام کو ختم کیا، وہاں مسلمانوں کو بھی تباہ و برباد کر ڈالا - ان کی ترقی کی رفتار بالکل رک گئی ؛ اور اقبال، ادبار سے بدل گیا - یہ اسلامی سلطنت کے زوال کا پہلا سبب ہے -

۲- ان کے زوال کا دوسرا سبب، مسلمان حکومتوں میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہے - ایک ہی ملک اور ایک ہی علاقے میں کئی کئی حکومتیں قائم ہیں اور سب کمزوری اور ضعف کا شکار ہیں - سب ایک دوسرے کی دشمن ہیں اور باہم قتل و غارت کا بازار گرم ہے - اس سے اولاً سلطنت میں ضعف پیدا ہوتا ہے، اس کے بعد، اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے -

۳- تیسرا سبب یہ ہے کہ سلاطین عیش و عشرت میں مصروف ہیں، وہ اپنے آپ کو مختارِ کل سمجھتے ہیں اور جو جی چاہے کرتے ہیں - کون ہے جو ان کو کسی معاملے میں ٹوکنے کی جرأت کرے - حتیٰ کہ وزرا اور عمالِ حکومت بھی اپنے آپ کو بادشاہ تصوّر کرتے ہیں -

۴- چوتھا سبب، آپس کی خانہ جنگی ہے - اس سے جہاں تاج دار بے تاج

ہوجاتا ہے، وہاں رعایا بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ ملک کے معززین ذلت کے گڑھے میں گر جاتے ہیں؛ اور اکثر لوگ، تو ترکِ وطن پر مجبور ہو جاتے ہیں اور در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔

۵۔ پانچواں سبب، کار پردازانِ حکومت کا باہمی اختلاف ہے۔ ایک فریق کوئی قدم اٹھاتا ہے تو دوسرا اس کی مخالفت پر اتر آتا ہے، جس سے سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

۶۔ چھٹا سبب، سلاطین کی خود غرضی اور خود پسندی ہے۔ اکثر سلاطین، رعایا کے مفاد سے بے خبر ہیں اور من مانی کرتے ہیں۔ انھوں نے قانون کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، جس بے گناہ کو چاہا قتل کر دیا، جس گنہ گار کو چاہا بری کر دیا۔ جسے جی چاہا اونچے سے اونچے منصب پر فائز کر دیا اور جسے چاہا الگ کر دیا۔ نہ کسی کا جرم دیکھا، نہ کسی کی نیکی کا خیال کیا، لیاقت اور نالائقی کو ناپنے کا ان کے پاس کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ بس ان کی مرضی اصل معیار ہے۔ اس سے حکومت کے ملازمین اور رعایا بد دل ہو جاتے ہیں؛ اور یہ چیز عام طور پر انقراضِ سلطنت پر منتج ہوتی ہے۔

۷۔ ساتواں سبب بے جا تعصب اور افراط و تفریط ہے۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے اور اس کے مقابلے میں اعتدال کا سبق دیا ہے۔ آنحضرت کا فرمان ہے: خیر الامور اوسطھا۔

۸۔ آٹھواں سبب، سلاطین کا اسلام کے اصولوں پر قائم نہ رہنا اور شعائرِ اسلامی کی پابندی نہ کرنا ہے۔ اصحابِ فہم علما کے نزدیک زوالِ سلطنت کا یہ سب سے بڑا سبب ہے۔

۹۔ نواں سبب، سلطنت کے اعلیٰ مناصب پر جہلا کا تقرر ہے۔ اس سے سلطنت کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں، شاہی خزانہ خالی ہو جاتا ہے اور اخلاقِ حسنہ کی جڑیں کٹ جاتی ہیں۔

۱۰۔ دسواں سبب، سلطنت کو موروثی قرار دے لینا ہے، جس کی وجہ سے بعض دفعہ

شیر خوار بچوں کو بھی تخت پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بادشاہت برائے نام رہ جاتی ہے اور اختیار و اقتدار کی باگ ڈور مختلف عہدے داروں کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے نہ نظم سلطنت باقی رہتا ہے اور نہ کسی کا رعب و دبدبہ۔

۱۱۔ گیارھواں سبب، سلاطین کے دل سے رعایا کے لیے اسلامی ہمدردی کا فقدان اور تالیف قلبی کا ترک کر دینا ہے، وہ رعایا کے ساتھ قساوت قلبی کا مظاہرہ کرتے اور اس پر ہر قسم کے ظلم روا رکھتے ہیں۔ اس طرز عمل سے رعایا ان کی طرف سے بدظن ہو کر مخالفت پر اتر آتی ہے، جس کا نتیجہ بالآخر سلطنت کا خاتمہ ہوتا ہے۔

۱۲۔ بارھواں سبب یہ ہے کہ غیر مذہب کے لوگ، از روئے نفاق اسلام قبول کر کے مسلمانوں کا حصہ بن جاتے ہیں، پھر کسی طرح بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں اور ایسے اقدام کرتے ہیں کہ جس سے مسلمانوں میں فتنہ و فساد بپا ہو جاتا ہے، رعایا کئی حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ نتیجۃً سلطنت میں کمزوری کے آثار ابھر آتے ہیں۔

۱۳۔ تیرھواں سبب، سلاطین کا عیاشی میں بڑھ جانا، ان کی بیویوں کا بے راہ روی اختیار کر لینا، اور ان کی اولاد کا مختلف نوع کی برائیوں کو اپنا لینا ہے۔

زوال سلطنت کے یہ اسباب بتانے کے بعد ملا احمد قریشی نے کہا، اے بادشاہ! جب تک سلطنت کے اصول جمہوری نہ ہوں گے، سلطنت کبھی قائم نہ رہ سکے گی۔ سلطنت کے استحکام کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اصول و قوانین جیسا کہ اسلام نے بتایا ہے جمہور کی آرا اور مجلس شوریٰ کے فیصلوں کے مطابق ہوں۔ اگر ایسا نہیں ہو گا تو اس کا قائم رہنا اور مستحکم ہونا دشوار ہے۔ اگر قائم رہی اور چلی بھی تو اس کی عمر زیادہ نہیں ہو سکتی۔

زوال سلطنت کے یہ تیرہ اسباب ہم نے اختصار کے ساتھ درج کیے ہیں۔ اندازہ کیجیے، اس مطلق العنانی کے زمانے میں ایک بادشاہ اور ایک ولی عہد کے سامنے ایک عالم دین بھری مجلس میں کس جرأت اور دلیری کے ساتھ بات کرتا ہے اور کس انداز سے مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کے اسباب کی وضاحت کرتا ہے۔

وفات

سلطان احمد شاہ بہمنی نے ۲۸ رجب ۸۳۸ھ کو اس دارِ فانی سے عالمِ بقا کو رحلت کی اور حکومت کے بارِ گراں سے سبکدوش ہوا۔ اس کی مدت فرماں روائی بارہ سال دو مہینے ہے[۶۰]۔

سلطان علاء الدین بہمنی

سلطان احمد شاہ بہمنی کی وفات کے بعد یکم شعبان ۸۳۸ھ کو اس کا بیٹا سلطان علاء الدین بہمنی دکن کی مسندِ حکومت پر فائز ہوا۔ یہ رقیق القلب، نرم خو، نیک سیرت، رحم دل، عدل گستر، رعایا پرور اور پاکیزہ سیرت بادشاہ تھا۔ تدین اور پابندیٔ شرع میں یکتا تھا۔ سلطنت کے معاملات پر گہری نظر رکھتا تھا۔ ملکی نظم و نسق کو بہتر طریق سے قائم رکھنے اور اس کو مستحکم کرنے میں انتہائی مستعد تھا۔ اس کے ارکانِ سلطنت میں علما بھی شامل تھے، جن میں مُلّا احمد قزوینی، مولانا عبدالغنی قاضی محمد سراج، مُلّا محمد گازرونی اور مُلّا ابوالقاسم جرجانی لائقِ تذکرہ ہیں۔

علاء الدین بہمنی نے جہاں ملک کو عدل و انصاف سے بھر دینے اور رعایا کو خوش حال بنانے کی کوشش کی وہاں مملکت کو وسعت دینے اور اس میں علم و ادراک کو عام کرنے کے لیے بھی ساعی ہوا۔

حدودِ شرعیہ کا نفاذ اور عادات و اخلاق

اس نے ممالکِ محروسہ کے ہر گاؤں اور قصبے میں، قاضی، مفتی اور محتسب مقرر کیے اور ان کو سخت تاکید کی کہ شرعی احکام کے اجرا اور عوام کو منہیات سے روکنے میں تغافل نہ کریں۔ ملک میں شراب کی بالکل ممانعت تھی۔ اگر کوئی شراب نوشی کے جرم کا مرتکب ہوتا تو اس کو شرعی سزا دی جاتی۔ اس معاملے میں وہ اتنا سخت گیر تھا کہ کسی کی رعایت نہ کرتا۔ فرشتہ کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ سید محمد حسینی گیسو دراز کے پوتے نے

---

[۶۰] مفصل حالات کے لیے دیکھیے تاریخ فرشتہ ج ۱، ص ۴۹۵ تا ۵۱۰۔ محبوب الوطن تذکرہ سلاطینِ دکن ص ۸۷۴ تا ۵۲۵۔

ایک فاحشہ عورت کے ساتھ شراب پی، اس کو زدوکوب کیا اور اس کی چٹیا کاٹ دی، کوتوال نے اس کو پکڑ کر بادشاہ کو اطلاع دی تو بادشاہ نے اس کے پاؤں پر دو سو کوڑے مارے اور فاحشہ کو گدھے کی کھال اوڑھا کر تشہیر کیا، اور پھر شہر بدر کر دیا۔

نہایت انصاف پسند تھا، ظلم کو کسی شکل میں برداشت نہ کرتا، ظالموں کو شدید سزائیں دیتا، معدلت گستری میں وہ امیر و غریب اور چھوٹے بڑے کے درمیان کسی امتیاز کا روادار نہ تھا۔ قمار بازوں اور بدمعاشوں کا شدید دشمن تھا۔ دریوزہ گروں اور گداگروں کو کسبِ معاش کی تاکید کرتا اور بھیک مانگنے سے سختی سے روکتا، ان کو محنت مزدوری سے کما کر کھانے کا حکم دیتا۔

مشائخ و علما کو حکم تھا کہ وہ لوگوں کو منہیات سے روکیں، انھیں اسلامی آداب و اخلاق کی تعلیم دیں اور صراطِ مستقیم پر قائم رہنے کی تاکید کریں۔ اس نے ملک کے ہر حصے میں شفاخانے قائم کیے اور لوگوں کے علاج کے لیے ان میں تنخواہ دار اطبا مقرر کیے، علوم و فنون کو عام کرنے کی غرض سے دارالعلوم جاری کیے، جن میں ملک کے مختلف حصوں کے طلبا حصولِ علم کے لیے آتے تھے۔

ایک واقعہ

سلطان علاء الدین کا معمول تھا کہ وہ نماز کے لیے مسجد میں جاتا۔ جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی مسجد میں ادا کرتا، کبھی کبھی خود بھی خطبہ دیتا تھا۔ عربی اور فارسی کا عالم تھا، اور عمدہ تقریر کرتا تھا۔ جمعہ اور عید کے خطبے میں وہ اپنا نام ان الفاظ کے ساتھ لیتا:

السلطان العادل الکریم الحکیم الرؤف علی عباد ہ اللہ الغنی علاء الدنیا والدین بن علاء الدین بن اعظم السلاطین احمد شاہ ولی بھمنی۔

ایک مرتبہ جمعہ کے روز ایک عرب تاجر جامع مسجد میں آیا۔ اس نے اپنے گھوڑے بادشاہ کے وزرا کے ہاتھ فروخت کیے تھے، لیکن وہ اس کو رقم ادا کرنے میں حیلے بہانوں سے کام لے رہے تھے۔ عرب تاجر ان کے اس رویّے سے تنگ آچکا تھا، وہ جمعہ کے روز

منبر کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ اس بات سے بھی آگاہ تھا کہ بادشاہ نے کسی وجہ سے بعض سادات کو قتل کیا ہے۔ جب بادشاہ نے حسبِ معمول یہ الفاظ کہے:

السلطان العادل الکریم الحلیم الرؤف علی عباد اللہ الغنی علاء الدنیا والدین علاء الدین بن عظم السلاطین احمد شاہ ولی بہمنی۔

تو وہ عرب تاجر اپنی جگہ سے اُٹھ کر بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بلند آواز سے بولا:

لا واللہ لا عادل ولا کریم ولا رحیم ولا رؤف، ایھا الظالم الکذاب تقتل الذریۃ الطاھرۃ وتتکلم بھذا الکلمات علی منابر المسلمین۔

یعنی خدا کی قسم! اے ظالم و دروغ گو، نہ تو عادل ہے، نہ کریم ہے، نہ بردبار اور مہربان ہے۔ اولادِ طاہرہ یعنی سادات کو قتل کرتا ہے اور مسلمانوں کے منبروں پر کھڑا ہو کر اس قسم کے کلمات زبان سے نکالتا ہے جو خلاف واقع ہیں۔

بادشاہ پر عرب تاجر کا یہ کلام نہایت موثر ثابت ہوا۔ بہت رویا، اسی وقت گھوڑوں کی قیمت ادا کر دی اور کہا جن لوگوں نے مجھ کو یزید کی طرح بدنام کیا ہے وہ لوگ خدا کے غضب سے رہائی نہیں پائیں گے۔ مسجد میں آ کر محل میں داخل ہوا پھر تادمِ مرگ گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اس کا جنازہ ہی باہر نکلا۔ ۸۶۲ھ میں اس دارِ ناپائیدار سے عالمِ بقا کو کوچ کر گیا۔ اس کی مدتِ سلطنت تینتیس[۲۳] سال نو مہینے بیس دن ہے۔ تقریباً تیس[۳۰] سال عمر پائی[۴۲]۔

اس کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں وارثِ تخت و تاج بنا، جو نہایت ظالم و سفاک تھا اور اپنے بے پناہ ظلم کی بنا پر لوگوں میں، ہمایوں شاہ بہمنی ظالم مشہور تھا۔ یعنی لفظِ ظالم اس کے نام کا مستقل جز بن گیا تھا۔

۴۲؎ تاریخ فرشتہ ج ا ص ۴۹۵ تا ۵۰۱۔ محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن ص ۵۲۶ تا ۵۶۵۔

بادشاہوں کی تاریخ

یہ نویں صدی ہجری کے شاہانِ ہند کی ان مساعی کا مختصر تذکرہ تھا جو انھوں نے فروغِ علم کے بارے میں انجام دیں اور جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک علما و فقہا کا مرتبہ کتنا بلند تھا اور اشاعتِ علم اور تبلیغِ دین کے باب میں وہ کس درجہ ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اگرچہ ان میں سے بعض حکمرانوں کی زندگی کا اسلوب اسلامی احکام سے پوری طرح ہم آہنگ نہ تھا، تاہم علم و علما سے ان کو خاص تعلق تھا۔ ان کے عہد میں ترقیِ علم کی راہیں کشادہ ہوئیں، فکر و عمل کے دائروں نے وسعت اختیار کی اور فقہا و علما نے محض خدمتِ دین کو اپنا مطمح نظر ٹھہرایا۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ بادشاہوں کی تاریخ، زیادہ تر ان کے جنگی کارناموں اور شمشیر و سنان کے محور کے گرد گھومتی ہے اور مورخ کا قلم عام طور پر ان کی بہادری اور شجاعت کی داستانیں بیان کرنے میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ حالاں کہ ان میں کی اچھی خاصی تعداد نے اسلامی و دینی امور کے نشر و ذیوع کو بھی شائستۂ التفات ٹھہرایا، اور اسلام کی تہذیبی و ثقافتی اقدار کو پھیلانے کے لیے کوششیں کیں۔ مگر تاریخ کے ڈھیر میں ان کو کسی خاص ترتیب اور عنوان کے تحت تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ ان کی زندگی کے ان گوشوں کی نشان دہی یا تو بزرگانِ دین کے ملفوظات سے ہوتی ہے یا مختلف کتبِ تاریخ کے تمام واقعات کو کھنگال لینے کے بعد مطلب کی کوئی شے ہاتھ آتی ہے۔ ہم کتاب کا مقدمہ لکھنے بیٹھے تو یہی مشکل سامنے آئی اور بہت سی کتابوں کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ ان سے جو مواد ہمیں مل سکا ہے، اس کا ضروری حصہ ایک ترتیب کے ساتھ حوالۂ قرطاس کر دیا گیا ہے۔ اس کے صواب و خطا کا فیصلہ معزز قارئین کے ہاتھ میں ہے۔

کچھ اس کتاب کے بارے میں

فقہائے ہند کی پہلی جلد خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آ چکی ہے، جو پہلی صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک کے فقہائے کرام کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔

اس میں بتفصیلِ ذیل دو سو پچانوے (۲۹۵) فقہا کے حالات مندرج ہیں:

پہلی صدی ہجری	۳۶
دوسری صدی ہجری	۱۷
تیسری صدی ″	۷
چوتھی صدی ″	۷
پانچویں صدی ″	۴
چھٹی صدی ″	۹
ساتویں صدی ″	۵۵
آٹھویں صدی ″	۱۶۰
کل	۲۹۵

ان میں سے بعض کے حالات بہت مختصر ہیں اور بعض کے کچھ مفصل۔ اس کی اصل وجہ مواد کی فراہمی ہے جو کہیں کم مل سکا ہے اور کہیں کچھ زیادہ۔ جو ملا وہ پیش کر دیا گیا۔

پیشِ نگاہ جلد نویں صدی ہجری کے فقہائے عظام کے تذکرہ کو محیط ہے جن کی تعداد ایک سو پانچ تک پہنچتی ہے۔ پہلی جلد کے ابتدائیہ میں ہم نے عرض کیا تھا کہ دوسری جلد نویں اور دسویں صدی ہجری کے فقہا کے حالات و سوانح پر محتوی ہوگی، لیکن یہ صرف نویں صدی ہجری تک محدود ہے۔ دسویں صدی اس میں شامل نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت متعلقہ مواد کی کمی بیشی کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ اب دیکھا تو صرف نویں صدی ہجری کا مواد مع مقدمہ کے تقریباً تین سو صفحات تک پھیل گیا ہے اور دسویں صدی کا اس سے بھی زیادہ ہے۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ ہر صدی کے فقہائے عظام کے سوانحِ حیات الگ الگ جلد میں پیش کیے جائیں۔ اگر زندگی باقی رہی، اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی، اور قلم و قرطاس سے رابطہ قائم رہا تو یہ سلسلہ اسی ترتیب سے چودھویں صدی ہجری تک ممتد ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

یہاں یہ وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ کتاب میں جن فقہائے کرام کے حالات درج کیے گئے ہیں، ان میں بعض صوفیا و مشائخ بھی شامل ہیں، اور وہ حضرات بھی ہیں، جن کی کسی فقہی تصنیف کا علم تو نہیں ہو سکا، مگر تذکرہ نگاروں نے انھیں فقہا کی فہرست میں شامل کیا ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اُس دور میں صوفیا و مشائخ کے لیے علم سے بہرہ ور ہونا اور فقہ میں مہارت پیدا کرنا ضروری تھا، مرشد اس وقت تک کسی کو اپنے حلقہ ارشاد میں داخل نہیں کرتا تھا، جب تک کہ وہ ظاہری علوم سے آراستہ نہ ہو۔ ایسے متعدد واقعات کتابوں میں مسطور ہیں کہ ایک شخص نے حصولِ علم کی راہ کو ترک کر کے تصوّف سے رابطہ پیدا کرنا چاہا اور ذوقِ طریقت نے اس کو صوفیا و مشائخ کے حلقے میں جانے کے لیے مجبور کیا مگر مرشد نے اس کو اجازت نہ دی اور پہلے علومِ ظاہری کے حصول کو ضروری قرار دیا کہ اس کے بغیر وادیِ تصوّف میں گام فرسا ہونا خطرات سے خالی نہیں۔ علومِ ظاہری میں علمِ فقہ کو اوّلیں مقام حاصل تھا اور اس کو نظر انداز کر کے ذہن اخذ و قبول کی نعمت سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتا تھا۔

اسی طرح بعض علمائے کرام کسی فقہی کتاب کے مصنف نہ تھے بلکہ مدرس تھے اور طلبا کو کتبِ فقہیہ کا درس دیتے تھے اور پھر مقامی طور پر مسندِ افتا پر بھی فائز تھے۔ ظاہر ہے جو عالم فقہی کتابیں پڑھائے گا اور مختلف مسائل کے متعلق فتوے بھی دے گا، وہ لازماً فقہا کے زمرے میں آئے گا اور اسی بنا پر تذکرہ نگاروں نے اس کو فقیہ سے تعبیر کیا ہے۔

یہاں ہم یہ بھی عرض کریں گے کہ یہ کام بڑا محنت طلب ہے اور یہ راستہ جو ہم نے اپنے لیے منتخب کیا ہے، انتہائی دشوار گزار ہے۔ اگر حضراتِ اہلِ علم یہ محسوس کریں کہ یہ بندۂ عاجز کہیں ٹھوکر کھا گیا ہے اور کسی مقام پر لغزشِ فہم کا شکار ہو گیا ہے تو اسے مطلع فرمائیں، ان کی نہایت مہربانی ہو گی۔ اور اگر قدم

صحیح سمت کی طرف بڑھ رہے ہیں اور قلم اصل منزل کی طرف رواں ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے بے پایاں کرم کا نتیجہ ہے اور ہم اس سے اجر کے طالب ہیں ۔ دعا ہے اللہ رب العالمین صحت وعافیت سے رکھے اور خیریت وسلامتی کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچائے ۔ آمین ۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب ۔

بندۂ عاجز

محمد اسحاق بھٹی

۲۰ جون ۷۵ ۱۹ء

۱۰ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۵ھ

نویں صدی ہجری

الف

۱۔ قاضی ابراہیم بن فتح اللہ ملتانی

قاضی ابراہیم بن فتح اللہ بن ابوبکر بن فخر الدین بن بدرالدین ربیعی، اسماعیلی، غوری فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے جید علما میں سے تھے۔ ملتان میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی اور اسی شہر میں اپنے عصر کے مشہور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ پھر جنوبی ہند کے لیے عازم سفر ہوئے اور وہاں کے مختلف شہروں میں گھومتے ہوئے سلطان علاء الدین بہمنی کے ایام حکومت میں شہر بیدر میں داخل ہوئے اور اس سے تعلقات و روابط استوار کیے۔ اس کی وفات کے بعد اس کے دو بیٹوں — انام شاہ اور محمد شاہ — کے اتالیق مقرر کیے گئے۔ محمد شاہ بہمنی ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ وہ تخت حکومت پر متمکن ہوا تو اس نے ان کو شہر بیدر کا قاضی مقرر کر دیا اور پھر یہ دکن میں قاضی القضاۃ کے منصبِ بلند پر فائز ہوئے۔ زہد و عبادت، اتقاو تورع اور شریعت مطہرہ پر کامل استقامت کے باوجود انھوں نے نہایت آسودہ زندگی بسر کی۔ قضا وغیرہ کی شدید اور نازک مصروفیات کے باوصف تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں سے ایک کتاب کا نام معارف العلوم ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور علوم و فنون کی تعریفات کے موضوع پر مشتمل ہے۔ ان کی اولاد بہت نیک تھی اور ان کے اعقاب و اخلاف میں چند بہترین عالم اور اونچے درجے کے صالح لوگ پیدا ہوئے ہیں، جن میں ایک ان کے بیٹے شیخ محمد بن ابراہیم ملتانی تھے۔ قاضی ابراہیم بن فتح اللہ ملتانی نے ۷ جمادی الاخریٰ

۸۶۵ھ میں بیدر میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔[1]

۲۔ شیخ ابو الفتح جون پوری

شیخ ابو الفتح کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ شیخ ابو الفتح بن عبد الحی بن عبد المقتدر بن رکن الدین شریحی کندی دہلوی جونپوری۔

شیخ ابو الفتح ۱۴ محرم ۷۷۲ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت سے پہلے والدِ مکرم شیخ عبد الحی وفات پا چکے تھے۔ لہٰذا اپنے جدِّ محترم شیخ عبد المقتدر کی نگرانی میں تربیت پائی۔ انہی سے علوم ظاہری کی تعلیم حاصل کی اور انہی کے فیضِ صحبت سے طریقت و تصوف سے بہرہ یاب ہوئے۔ تحصیل علم کے بعد مسندِ تدریس پر فائز ہوئے اور اپنے زمانے کے دیارِ ہند کے مشہور اساتذہ میں سے گردانے گئے۔ طویل عرصہ تک دار السلطنت دہلی میں مسندِ تدریس پر متمکن رہے اور بے شمار تشنگانِ علم کی علمی تشنگی بجھانے کے فرائض انجام دیے۔ ان کے دادا کی خاص طور سے ان کو وصیت تھی کہ ہمیشہ درس و افادۂ عام میں مشغول رہنا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے استاذ و مرشد دادا کی اس وصیت پر تا دمِ واپسیں عمل پیرا رہے۔ عالم و فاضل، فصیح و بلیغ اور جامع معقول و منقول تھے۔ شاعر بھی تھے اور عربی و فارسی میں قصائد و اشعار کہتے تھے۔

قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے فقہی بحثیں

ان کے معاصرین میں علمی اعتبار سے اونچے درجے کے علمائے کرام کے نام تذکروں میں مذکور ہیں، جن میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی کا اسمِ گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ اصول و کلام اور مسائل فقہیہ میں قاضی شہاب الدین سے اکثر ان کی بحثیں رہتیں۔ بالخصوص زبابِ گریہ یعنی مشک بلائی کے باب میں جو بلّی کے عرق سے ٹپکتا ہے، دونوں فقہا کے درمیان خوب گرما گرم مباحثے ہوئے۔ شیخ اس کو

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۲۰۴ بحوالہ مخزن الکرامات۔

نجس قرار دیتے تھے اور قاضی شہاب الدین اس کی طہارت کے قائل تھے۔ اس موضوع سے متعلق ان دونوں اصحابِ علم کی طرف سے کئی رسائل بھی تصنیف ہوئے۔ لیکن اس بحث کے جو حصے شیخ کی اولاد کی وساطت سے نقل ہوئے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اندازِ گفتگو میں قاضی شہاب الدین کا پلہ بھاری تھا اور شیخ کا اندازِ استدلال ان کے مقابلے میں کمزور تھا۔

دہلی سے ہجرت اور جون پور میں قیام

شیخ ابو الفتح کا وطن دہلی تھا اور یہ پہلے وہیں سکونت رکھتے تھے لیکن جب مغل حکمران تیمور لنگ دہلی پر حملہ آور ہوا اور اس نے دہلی پر قبضہ کر کے شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا تو لوگوں نے دہلی کی سکونت ترک کر کے جون پور کا قصد کیا۔ جون پور جانے والے اس گروہ میں علما بھی شامل تھے اور عوام بھی۔ شیخ ابو الفتح بھی اس گروہ میں شریک تھے۔ قاضی شہاب الدین بھی دہلی میں مقیم تھے اور وہ بھی تیمور کی غارت گری سے خوف زدہ ہو کر جون پور چلے گئے تھے۔

لوگوں میں یہ بات بہت مشہور تھی کہ شیخ کے گھر میں سونے کی بارش ہوتی ہے۔ یہ بات صرف عوام سے مسموع ہے۔ لیکن شیخ کے ان واقعات و ملفوظات میں، جو اُن کے خلفا نے ان کے بعد جمع کیے اور باقاعدہ کتابی شکل میں مرتب کیے، کہیں منقول نہیں ہے۔ ان کی اولاد اس کو محض افسانہ قرار دیتی تھی اور اس کو صحیح نہیں مانتی تھی۔ البتہ ان کی اولاد میں سے ایک بزرگ شیخ عبد الوہاب اس کو صحیح قرار دیتے تھے۔ اور وہ ان کی اولاد میں بلند مرتبہ کے حامل تھے۔

اس سلسلے میں شیخ عبد الوہاب یہ کہتے ہیں کہ شیخ ابو الفتح نے ایک کتاب مرتب کی ہے جو اُن کے جدّ امجد قاضی عبد المقتدر کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے قاضی عبد المقتدر کے خلیفہ اور شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے صحبت یافتہ قاضی شہ کے حوالے سے ایک واقعہ نقل کیا ہے جو انھوں نے خود قاضی شہ سے سنا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ قاضی شہ ایک روز قاضی عبد المقتدر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اس روز ان کے گھر میں کھانے کو کوئی چیز نہ تھی اور وہ تین دن سے فاقے سے تھے۔ اور غالباً قاضی عبدالمقتدر کی زبان سے ان کے سامنے اس کا اظہار بھی ہوگیا تھا۔ قاضی شہ نے یہ سنا تو بہت متاثر ہوئے اور ان کے دل میں اس سے ایک صدمہ سا پیدا ہوا۔ اسی تاثر اور قلبی تکلیف کے ساتھ وہ باہر نکلے اور ان کے مکان کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ ناگہاں کیا دیکھتے ہیں کہ دس، پندرہ اور پچیس رائج الوقت سکّے (جن کو کانی کہا جاتا تھا) ان پر گرے۔ انھوں نے وہ سکّے اٹھائے اور قاضی عبدالمقتدر کی خدمت میں پیش کر دیے۔ ساتھ ہی اپنے تاثر و صدمہ کی کیفیت بھی بیان کر دی۔ قاضی صاحب ان سکّوں کو دیکھتے ہی اور قاضی شہ کی بات سنتے ہی غصّے میں آگئے۔ انھوں نے ہر چند منت و زاری سے کوشش کی کہ وہ یہ سکّے قبول کرلیں مگر جیسے جیسے ان کا اصرار بڑھتا گیا اسی نسبت سے ان کے غیظ و غضب میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب انھوں نے ان کو قبول کرنے سے بالکل ہی انکار کر دیا تو ان کے معتقدین نے یہ سکّے قاضی شہ سے اچھا خاصا مال دے کر خرید لیے۔ بس اس واقعہ کی اتنی ہی حقیقت ہے۔

شیخ ابوالفتح نے جمعہ کے روز ۱۲ ربیع الاول ۸۵۸ھ کو جون پور میں وفات پائی۔[۵۲]

ان کے جدّ امجد قاضی عبدالمقتدر

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں شیخ ابوالفتح جون پوری کے جدّ امجد قاضی عبدالمقتدر کے بھی مختصر حالات و سوانح بیان کر دیے جائیں۔ ان کو دہلوی بھی کہتے ہیں، تھانیسری بھی کہتے ہیں اور جون پوری بھی۔! ان کے اجداد دیارِ ہند میں آئے تو سب سے پہلے دہلی میں آکر سکونت پذیر ہوئے تھے، اس لیے دہلوی کہلائے۔ پھر تھانیسر کو اپنا مسکن بنا لیا تھا، لہٰذا تھانیسر کی طرف منسوب ہوئے اور تھانیسری کے نام سے

---

۵۲ اخبار الاخیار، ص ۱۷۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۳۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۲۰۴ تا ۲۰۵۔ حدائق الحنفیہ، ص ۳۲۲، ۳۲۳۔

پکارے گئے۔ بعد میں حملہ تیمور کے زمانے میں ان کے لڑکے اور پوتے دہلی چھوڑ کر جون پور چلے گئے تھے، اس لیے جون پوری کی نسبت سے شہرت پائی۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے: عبدالمقتدر بن محمود بن سلیمان شریحی کندی۔ عبدالمقتدر کا لقب منہاج الدین اور ان کے والد کا رکن الدین تھا۔ یہ قاضی شریح کندی کی اولاد سے تھے۔ ان کے دادا سلیمان سلطان قطب الدین خلجی کے زمانے میں وارد ہند ہوئے۔ دہلی کے شمالی علاقوں کے قاضی مقرر کر دیے گئے۔ انھوں نے فرائض قضا بڑی محنت اور دیانت داری سے انجام دیے اور تھانیسر میں سکونت اختیار کی۔ قاضی سلیمان کی وفات کے بعد ان کے لڑکے قاضی محمود کو جو رکن الدین کے لقب سے ملقب تھے، ان کی جگہ قاضی مقرر کیا گیا۔ خلجی سلطنت میں ان کو بڑی عزت و تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور شہر تھانیسر میں وہ بہت ہی اعزاز و اکرام کے حامل تھے۔

قاضی عبدالمقتدر بہت بڑے عالم و فاضل، فیاض طبع اور درویش کامل تھے۔ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے خلیفہ اور مشہور عالم دین قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے استاذ تھے۔ عربی و فارسی کے شاعر اور فصاحت و بلاغت میں بلند مرتبہ کے حامل تھے۔ ان کے قصائد میں سے وہ قصیدہ جو انھوں نے لامیۃ العجم کے جواب میں کہا، ان کے کمالِ فصاحت پر دلالت کناں ہے۔ ہمیشہ درس و تدریس میں مصروف اور افادۂ عام میں مشغول رہے اور واقعہ یہ ہے کہ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے اکثر خلفا کا طریق یہی تھا۔ طلبا کو تحصیلِ علم اور احکامِ شریعت پر کاربند رہنے کی نصیحت فرماتے۔ کہا کرتے کہ ایک مسئلہ شرعی پر غور کرنا، ان ہزار رکعت کی عبادت پر فضیلت رکھتا ہے، جس میں کبر و ریا کی آمیزش پائی جاتی ہو۔

منقول ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کی خدمت میں جا کر بعض مسائل سے متعلق بحث کیا کرتے تھے اور شیخ ان کو ذاتی طور پر اور ان کی بحثوں کو علمی طور پر بہت پسند فرماتے تھے اور ان کو مزید تحصیل علم کی ترغیب دیتے تھے۔ بالآخر وہ ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گئے اور ظاہری فضائل کے ساتھ

ساتھ باطنی نعمت سے بھی ہم کنار ہوئے۔ قاضی موصوف کے ایک معتقد کی ایک کتاب مناقب الصدیقین کے نام سے موسوم ہے۔ یہ کتاب مشائخ چشت کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں قاضی عبدالمقتدر کے بہت سے احوال معاملات مندرج ہیں۔

اس کتاب میں ایک واقعہ یہ مرقوم ہے کہ ایک روز ان کے تلمیذ قاضی شہاب الدین کو کہیں سے سونا ہاتھ آگیا۔ انھوں نے یہ سونا اپنی والدہ کو دیا اور تنہائی میں کہا کہ اس سونے کو کسی جگہ زمین میں دبا دیا جائے۔ اس کے بعد وہ شیخ عبدالمقتدر کی مجلس میں گئے۔ شیخ نے جوں ہی قاضی شہاب الدین کو دیکھا تو فرمایا تم تو زمین میں سونا دفن کرنے کی فکر میں ہو، تمھارا علم سے شغل کہاں باقی رہا ہے۔

فرمایا کرتے تھے کہ میرے پاس ایک طالب علم آتا ہے جس کا پوست علم، مغز علم اور استخوان علم ہے۔ اس طالب علم سے مراد قاضی شہاب الدین دولت آبادی تھے۔ ان کا حلقۂ تلامذہ بہت وسیع تھا جن میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی، ان کے پوتے شیخ ابو الفتح بن شیخ عبدالحی اور بے شمار لوگوں کے نام تذکروں میں موجود ہیں۔

قاضی عبدالمقتدر نے ۲۶ محرم ۷۹۱ھ کو اٹھاسی سال کی عمر پا کر دہلی میں وفات پائی اور وہیں اپنے والد قاضی محمود کے قریب حوض شمسی کے جانب جنوب میں دفن کیے گئے۔[۵۳]

قاضی عبدالمقتدر کا قصیدہ لامیہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کہا گیا ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کس درجہ اونچے مرتبے کے شاعر تھے اور ان کا کلام کس قدر فصیح و بلیغ تھا۔

۱- یا سائق الظعن فی الاسحار والاصل   سلّم علی دار سلمی وابك ثم سل

---

۵۳ اخبار الاخیار، ص ۱۵۰، ۱۵۱۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، ص ۲۹ تا ۳۶۔ مآثر الکرام دفتر اول، ص ۱۶۶۔ ابجد العلوم، ص ۸۹۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۷۰ تا ۷۷۔ تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار [illegible] ص ۱۹۵۔ حدائق الحنفیہ، ص ۲۹۹، ۳۰۰۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۳۳، ۱۳۴۔

٢- عن الظباء التی من دأبها ابدا — صید الأسود بحسن الدّل والخجل

٣- وعن ملوك كرام قد مضوا قِدَدا — حتّٰی یجیبك عنهم شاهد الطلل

٤- اضحت اذا بعدت عنها كواعبها — اطلالها مثل اجفان بلا مُقل

٥- فدی فؤادی اعرابیة سكنت — بیتًا من القلب معمورًا بلا جَوَل

٦- بخیلة بوصال المستهام بها — والجود فی الخود مثل البخل فی الرجل

٧- كانها ظبیة لكن بینهما — فرقا جلیلا بعظم الساق والكفل

٨- خیالها عند من یهوی زیارتها — احلی من الأمن عند الخائف الوجل

٩- كیف السبیل الیها بعد ان حفظت — بالبیض والسُمر فی اعلی ذری الجبل

١٠- طرقتها فجأة واللیل فی جدل — والذئب فی كسل والقوم فی شغل

١١- قالت لك الویل هلا خفت من اسد — له براثن كالعسّالة الذبل

١٢- فقلت انی ملیك صیده اسد — وصید غیری من ظبی ومن وعل

١٣- قالت فما تبتغی لا منع قلت لها — كلا فانی عفیف القول والعمل

١٤- واننی رجل من معشر سَحِبوا — ذیل التبتل والتقوی علی زحل

١٥- لا یطمعون ولكن كان دَیدنهم — اعطاءُ ما ملكوا كالعارض الهطل

١٦- اسد اذا سخطوا افنوا عدوهم — قوم اذا فرحوا اعطوا بلا ملل

١٧- ما قال قائلهم یوما لواحدهم — لو كنت من مازن لم تستبح ابلی

١٨- یا طالب الجاه فی الدنیا تكون غنًی — علی شفا حفرة النیران والشعل

١٩- یا طالب العز فی العقبی بلا عمل — هل تنفعك فیها كثرة الامل

٢٠- یا ایها الطفل انت الطفل فی امل — وشمس عمرك قد مالت الی الطَفل

٢١- یا من تطاول فی البنیان معتمدا — علی القصور وخفض العیش والطول

٢٢- لانت فی غفلة والموت فی اثر — یعدو وفی یده مستحكم الطُوَل

٢٣- واقنع من العیش بالادنی وكن ملكا — ان القناعة كنز عنك لم یزل

٢٤- ثم اغتنم فرصة من قبل ان ضعفت — قواك من سطوة الامراض والعلل

٢٥- ولا تكن لمزيد الرزق مضطربا   واقنع بما قسم القسّام فى الازل

٢٦- لا تغترر انت فى الدنيا فان بها   من عزّ بزّ فكن منها على وجل

٢٧- اكالة اكلت كالهر ما ولدت   حيّالة قتلت من جاء بالحيل

٢٨- ولا مناص من الله العزيز وان   فررت منه الى الدأماء والقُلل

٢٩- يا ايها الناس ان العمر فى سفر   وان اوقاتكم والله كالظلل

٣٠- ان المنايا بلا شك لآتية   وانتم فى المنى والمين والكسل

٣١- لله دَرّ فقير مالك ابدا   وذى خصاص بفضل الله مكتفل

٣٢- ولم يكن فخره الا بعزة من   اعيى الاعاجم والاعراب بالدول

٣٣- محمد خير خلق الله قاطبة   هو الذى جل عن مثل وعن شكل

٣٤- له المزايا بلا نقص ولا شبه   له العطايا بلا من ولا بدل

٣٥- له المكارم ابهى من نجوم دُجى   له العزائم امضى من قنا البطل

٣٦- له الفضائل اجدى من عصا كثر   له الشمائل احلى من جنىَ النحل

٣٧- له الجمال اذا ما الشمس قد نظرت   اليه قالت الا يا ليت ذلك لى

٣٨- النصر قادمه والفتح خادمه   كلاهما عن حماه غير مرتحل

٣٩- يا اعظم الناس من حاج ومعتمر   واكرم الخلق من حافٍ ومنتعل

٤٠- اتيتنا بكتاب جل سنفحة   وجدتنا بسبيل ناسخ السبل

٤١- بعثت بالملة البيضاء راسخة   عفا بها سائر الاديان والملل

٤٢- افحمت كل بليغ بالكتاب كما   جادلت بالسيف اهل الجد والجدل

٤٣- ضحى طلوعك بالشمس الضحى ابدًا   وقد غنيت عن الميزان والحمل

٤٤- أَمّ التمنى اذا جاءتك سائلة   ارجعتها وهى فى عفر مع الحمل

٤٥- نداك اكثر لا ينتهى ابدًا   لكن اذ ناه اندى من ندى السبل

٤٦- وعرف طيبك للكفار ضائرة   مسيرة الشهر مثل الورد للجُعَل

٤٧- لصحبك الغُرّ ياتى فضلُهم ابدًا   وفضل امتك الزهراء لم يزل

۴۸۔ واھل بیتك فینا رحمۃ نزلت   اھل اطھارنۃ عن رجس وعن دجل

۴۹۔ یاسید المرسلین المکرمین ادمؐ   شفاعۃ لعبید ضارع وجل

۱۔ اے صبح اور شام ساربانی کرنے والے۔ دارِ سلمی کو سلام کہنا اور رونا، پھر اس سے پوچھنا۔

۲۔ ان ہرنیوں کے بارے میں، جن کی ہمیشہ عادت رہی ہے کہ وہ شیروں کو بھی اپنے غمزوں اور تبسموں سے شکار کر لیتی ہیں۔

۳۔ اور ان معزز بادشاہوں کے بارے میں بھی پوچھنا جو گروہ در گروہ گزر چکے، یہاں تک کہ تمہیں ان کے بارے میں کھنڈر گواہ بن کر جواب دیں۔

۴۔ جب ان کی حسینائیں وہاں سے چلی گئیں تو اس کے بلند مقامات اس طرح بے رونق ہو کر رہ گئے جس طرح کہ بغیر دیمے (ڈھیلے) کے پپوٹے۔

۵۔ میرے دل کو ایک ایسی زنِ اعرابیہ نے زخمی کر دیا ہے جس نے دل کے اندر مکمل جگہ بنا لی ہے اور وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتی۔

۶۔ جو اس کا دیوانہ ہے اس سے ملنے (وصال) میں بڑی کنجوس ہے اور چہار دیواری میں سخاوت ایسی ہی ہے جیسے فوج میں بخالت کرنا۔

۷۔ وہ (اعرابیہ) گویا ایک ہرنی ہے لیکن دونوں میں ایک بڑا فرق ہے وہ فرق جو پنڈلی کی ہڈی اور ڈھانسے کے درمیان ہے۔

۸۔ اس کے دیدار کے خواہش مند کے لیے، اس کا خیال بھی، اس اطمینان سے زیادہ شیریں ہے، جو سہمے اور ڈرے ہوئے کو حاصل ہو۔

۹۔ جب اس نے پہاڑ کی بلند چوٹیوں پر سفید چمک دار تلواروں اور گندمی سپروں سے اپنی حفاظت کر رکھی ہو تو بتاؤ اس تک رسائی کیسے ہو۔

۱۰۔ میں شب کو اچانک چل پڑا جب کہ رات بچھڑ رہی تھی۔ بھیڑیے سستی کے عالم میں تھے اور لوگ اپنے اپنے کاموں میں مشغول۔

۱۱۔ وہ بولی، تیرا ناس ہو، تو شیر سے کیوں نہیں ڈرا، جس کے پنجے نیش مگس کی طرح تیز ہیں۔

۱۲۔ میں نے کہا۔ میں وہ (شکاری) بادشاہ ہوں، جس کا شکار شیر ہے اور دوسروں کا

شکار ہرن ہے یا پہاڑی بکرا۔

۱۳- اس نے کہا۔ تم چاہتے کیا ہو۔ میں نے کہا۔ نہیں۔ میں اپنے قول اور عمل دونوں کی عفت رکھتا ہوں۔

۱۴- میں ایسی قوم کا فرد ہوں جو تبتل اور تقویٰ میں زحل (ستارے کی بلندی) پر بھی فخر رکھتی ہے۔

۱۵- وہ طمع نہیں رکھتے بلکہ ان کی عادت یہ ہے کہ اپنی چیزیں اس طرح دے دیتے ہیں جیسے بادل جھڑی لگادے۔

۱۶- وہ ایسے شیر ہیں کہ غصے میں آجائیں تو اپنے دشمن کو فنا کردیں اور خوش ہوں تو کسی احساسِ تکلیف کے بغیر سب کچھ لٹادیں۔

۱۷- ان کے ایک فرد نے دوسرے سے کسی روز بھی یہ نہیں کہا کہ اگر میں بنی عاذن سے ہوتا تو میری اونٹنی کو مباح نہ سمجھا جاتا۔

۱۸- اے دنیا کی عزت کے طالب! کل (بروزِ حشر) تم آگ اور شعلے کی خندق کے کنارے کھڑے ہوگے۔

۱۹- اے عقبیٰ میں بلا عمل ہی عزت چاہنے والے۔ کیا تجھے آرزوؤں کی کثرت کوئی نفع پہنچا سکے گی؟۔

۲۰- اے بچے، تم اپنی آرزوؤں میں بچے ہی نکلے۔ تمھاری عمر کا سورج اب ڈوبنے کے قریب ہے۔

۲۱- اے وہ جو عمارتوں پر فخر کرتا ہے اور محلات، آسودہ زندگی اور امیری پر اعتماد کیے ہوئے ہے۔

۲۲- تو غفلت میں پڑا ہے اور موت پیچھے پیچھے دوڑ رہی ہے جس کے ہاتھ میں عمر کی باگ ڈور ہے۔

۲۳- معمولی زندگی پر قناعت کرلے تو، تُو بادشاہ ہوجائے گا۔ قناعت ایک ایسا خزانہ ہے جو تجھ سے کبھی زائل نہ ہوگا۔

۲۴۔ تم فرصت کو غنیمت جانو، قبل اس کے کہ تمھارے قوی مرض و بیماری غالب آنے سے کمزور ہو جائیں۔

۲۵۔ زیادہ رزق کے لیے مضطرب نہ ہو بلکہ قسامِ ازل نے جو حصہ مقرر کر رکھا ہے، اسی پر قناعت کر۔

۲۶۔ دنیا کے بارے میں دھوکے میں نہ رہو، کیونکہ دنیا میں جسے عزت ملتی ہے، اس سے چھینی بھی جاتی ہے، لہٰذا اس سے ہوشیار رہو۔

۲۷۔ (یہ دنیا) اپنی ہی اولاد کو بلّے کی طرح چٹ کر جاتی ہے اور ایسی عیار ہے جو ہر چالاک کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

۲۸۔ خدائے غالب (کی گرفت) سے فرار ممکن نہیں۔ اگرچہ بھاگ کر سمندر میں یا پہاڑ کی چوٹی پر کیوں نہ چلے جاؤ۔

۲۹۔ اے لوگو! زندگی اپنا سفر طے کیے جا رہی ہے اور تمھارے اوقات سائے کی طرح (بھاگ رہے) ہیں۔

۳۰۔ موت تو بلاشبہ آکر رہے گی۔ مگر تم ہو کہ آرزو، فریب اور سستی میں پڑے ہو۔

۳۱۔ کیا کہنے ہیں اس درویش کے جو بادشاہی کرتا ہے اور جھونپڑا رکھتا ہے اور اللہ کا فضل ہمیشہ اس کے شاملِ حال رہتا ہے۔

۳۲۔ اس کا یہ فخر صرف اس کی خاطر ہوتا ہے جس نے غلبہ حاصل کر کے عرب و عجم کو عاجز کر دیا۔

۳۳۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کی تمام مخلوق سے قطعی طور پر افضل ہیں اور کسی نظیر یا مثال سے بالاتر ہیں۔

۳۴۔ آپؐ کی ذاتِ گرامی جن اوصاف سے مزین ہے، ان میں کوئی کمی یا بیشی نہیں اور آپؐ کے جو عطایا ہیں ان پر نہ احسان جتایا نہ معاوضہ طلب کیا۔

۳۵۔ آپؐ کے مکارم شبِ تاریک کے ستاروں سے بڑھ کر روشن اور نمایاں ہیں اور آپؐ کے عزائم بہادر کے نیزوں سے زیادہ کام کرنے والے ہیں۔

۳۶۔ آپؐ کے فضائل عصا (ئے موسوی) سے زیادہ نفع بخش ہیں اور آپؐ کی سیرت پیداوار نحل (شہد) سے زیادہ شیریں ہے۔

۳۷۔ آپؐ کا جمال ایسا ہے کہ اگر سورج دیکھے تو یہ کہہ اُٹھے کہ کاش یہ مجھے حاصل ہوتا۔

۳۸۔ نصرت آپؐ کے آگے آگے چلتی ہے اور فتح آپؐ کی خدمت میں لگی ہوئی ہے اور یہ دونوں آپؐ کی چراگاہ سے باہر قدم نہیں رکھتیں۔

۳۹۔ اے تمام حج اور عمرہ کرنے والوں سے برتر اور اے تمام برہنہ پا اور نعل پوش مخلوقات سے بزرگ تر۔

۴۰۔ آپؐ ہمارے پاس وہ کتاب لے کر تشریف لائے، جو بدرجہ غایت منفعت بخش ہے اور وہ راستہ لے کر مبعوث ہوئے جس نے باقی تمام راستوں کو منسوخ کر دیا۔

۴۱۔ آپؐ کو ایسی روشن اور محکم ملت دے کر مبعوث کیا گیا، جس نے تمام ادیان و ملل کو مٹا دیا۔

۴۲۔ آپؐ نے تمام اہل بلاغت کو دلائل سے اسی طرح خاموش کر دیا، جس طرح نبرد آزماؤں کو جہاد بالسیف سے (جھکا لیا)۔

۴۳۔ آپؐ کے آفتاب ہدایت کے ساتھ طلوع ہونے سے ہمیشہ کے لیے روشنی آگئی اور میزان و حمل کے بُرجوں سے لوگوں کو بے نیاز کر دیا۔

۴۴۔ جب کوئی سائلہ آپؐ کے پاس تمنا لے کر حاضر ہوئی تو آپؐ نے اسے اس طرح لوٹایا کہ اگر وہ بانجھ تھی تو (آپؐ کی دعا اور برکت کے ساتھ) اس کی گود ہری ہو گئی۔

۴۵۔ آپؐ کی شبنم افشانی کا اکثر حصہ دائمی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس کا تو مختصر ترین حصہ بھی بارش سے زیادہ نمی رکھتا ہے۔

۴۶۔ آپؐ کی خوشبو ایک مہینے کی راہ سے ہی اہل کفر کو اس طرح محسوس ہو جاتی ہے، جیسے گلاب کی خوشبو بھونرے کو۔

۴۷۔ آپؐ کے تابناک صحابہؓ کی فضیلت بھی دائمی ہے اور آپ کی روشن اُمت کی فضیلت بھی لازوال ہے۔

۴۸۔ آپؐ کے اہل خانہ بھی ایک رحمت ہیں جو نازل ہوئی۔ وہ طاہر و پاک ہیں اور وہ

ہیں، جو رجس اور پلیدی سے قطعی طور پر دُور ہیں۔

۴۹- اے رسولانِ مکرم کے سردار! ما عاجزو ترساں بندوں کے لیے شفاعت کو قائم و دائم رکھیے۔

۳- شیخ ابوالفتح قریشی کالپوی

شیخ ابوالفتح بن علاء الدین گوالیاری کالپوی قریشی سید محمد گیسو دراز کے مرید اور خلیفہ تھے۔ علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔ حرمین شریفین کی شرف زیارت سے مشرف ہوئے اور حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ شیخ شہاب الدین عمر بن محمد سہروردی کی کتاب عوارف المعارف ان سے پڑھی اور مسندِ خلافت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں علم نحو کے بارے میں تکمیل اور علم تصوف کے سلسلے میں مشاہدہ شامل ہیں۔ کالپی میں مدفون ہیں۔ ۸۶۲ھ میں وفات پائی اور کالپی میں دفن کیے گئے۔ مادۂ تاریخ "گلشن اسرار" ہے۔[۴۵]

۴- شیخ احمد بن حسن بلخی

شیخ احمد بن حسن بن حسین بن معز الدین بلخی جن کو برہان الدین ابوالقاسم ہندی بہاری کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، ۸۲۹ھ میں رمضان المبارک کی ستائیسویں رات کو پیدا ہوئے۔ عقائد نسفیہ مع اس کی شرح مظفری کے اپنے دادا حسین بن معز الدین سے پڑھی۔ باقی کتب درسیہ اپنے والد مکرم شیخ حسن بن حسین سے پڑھیں اور عرصہ تک ان سے منسلک رہے۔ حرمین شریفین کا سفر بھی کیا اور حج و زیارت کی نعمت سے متمتع ہوئے۔ پھر ہندوستان آئے اور والد مکرم کی وفات کے بعد مسندِ مشیخت پر متمکن ہوئے۔ لنگر دریا کے نام سے مشہور تھے۔

---

[۴۵] اخبار الاخیار، ص ۱۶۳- خزینۃ الاصفیاء- تذکرہ علمائے ہند ص ۶- نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۴۷۳- حدائق الحنفیہ، ص ۳۲۵-

مشائخ فردوسیہ میں سے تھے اور اپنے زمانے کے نامور عالم دین اور فقیہ تھے۔ تاریخ وفات ۲۶ ربیع الاول ۷۸۱ھ ہے۔ مدفن شہر بہار ہے۔[۵۵]

۵۔ مولانا احمد تھانیسری

مولانا احمد بن محمد تھانیسری ارض ہند کے مشہور ادبا اور نامور فضلا میں سے تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ دارالحکومت دہلی میں پیدا ہوئے اور قاضی عبدالمقتدر بن رکن الدین شریحی کندی سے تحصیل علم کی۔ بعد ازاں شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے درس طریقت لیا۔ اور ایک عرصہ تک ان سے منسلک و ملازم رہے۔

اس دور میں ایک عالم دین مولانا خواجگی دہلوی تھے۔ یہ بھی شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی سے نسبت ارادت رکھتے تھے۔ ان کے اور مولانا احمد تھانیسری کے درمیان گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ انھوں نے ایک روز خواب میں دیکھا کہ چند روز تک ہندوستان پر مغل حملہ کرنے والے ہیں، وہ جہاں جائیں گے تاخت و تاراج کریں گے۔ دہلی شہر بھی ان کی تیغ خون آشام کی زد میں آنے والا ہے۔ خواب کے علاوہ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اس زمانے میں حالات بھی اس قسم کے پیدا ہو گئے تھے اور لوگوں میں مغلوں کے حملے کی افواہیں بھی پھیل گئی تھیں۔ بہر حال یہ خواب انھوں نے اپنے دوست مولانا احمد کو سنایا اور دہلی سے نکل جانے کا مشورہ دیا، مگر انھوں نے ان کی یہ بات ماننے سے انکار کیا اور دہلی ہی میں مقیم رہے[۵۶] البتہ مولانا خواجگی نے دہلی کی سکونت ترک کر کے کالپی کا رخ کیا اور وہیں مستقل طور سے رہائش اختیار کر لی۔ اس زمانے میں بہت سے شرفا و علما دہلی سے باہر چلے گئے تھے اور مختلف

---

۵۵ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۶ بحوالہ حاشیہ غلام یحیی علی شرح آداب المریدین۔ از شیخ احمد بن یحیی منیری۔

۵۶ اخبار الاخیار، ص ۱۴۴۔

شہروں میں جاکر اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ چند روز بعد تیمور نے دہلی پر حملہ کر دیا اور اس کی فوجیں شہر میں داخل ہو گئیں اور خوب قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ قتل و غارت کے بعد گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو مولانا احمد اور ان کے متعلقین کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

مولانا احمد تھانیسری، علم فقہ پر اس درجہ عبور رکھتے تھے کہ اس باب میں بڑے بڑے فقیہ ان کے سامنے بحث و جدل سے عاجز آجاتے تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ دہلی میں فتنۂ تیمور فرو ہوا تو رہائی پاکر تیمور کے دربار میں پہنچے۔ وہاں صاحبِ ہدایہ شیخ برہان الدین مرغینانی کے پوتے بھی موجود تھے جو حکومتِ تیمور میں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز تھے۔ دربارِ تیمور میں اب دو عظیم فقیہ تشریف فرما تھے۔ ایک مولانا احمد تھانیسری اور دوسرے صاحب ہدایہ کے پوتے شیخ الاسلام۔ دونوں کی نشستوں کے تقدم و تاخر کا معاملہ سامنے آیا۔ تیمور نے شیخ الاسلام کو پہلی قطار میں جگہ دینا چاہی تو مولانا احمد کو یہ بات ناگوار گزری اور شیخ الاسلام سے پیچھے بیٹھنے کو اپنی شخصیت اور علمی مقام کی اہانت پر محمول کیا۔ اب گفتگو شروع ہوئی تو شیخ الاسلام نے دورانِ گفتگو میں کسی مسئلہ فقہی میں ٹھوکر کھائی۔ مولانا احمد نے جو پہلے سے ان کے خلاف بھرے بیٹھے تھے، فوراً ٹوکا۔ امیر تیمور ان کی اس جرأت مندانہ گرفت اور اسلوبِ کلام پر نہایت متعجب ہوا اور بولا، یہ صاحبِ ہدایہ کے پوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان سے مسائل فقہیہ میں غلطی کا امکان نہیں۔ مولانا احمد نے ایک قدم آگے بڑھ کر فرمایا۔ صاحب ہدایہ نے، جو اُن کے دادا تھے، ہدایہ میں کئی مقامات پر غلطی کی ہے۔ اگر ایک جگہ پر انھوں نے بھی ارتکابِ خطا کر لیا ہے تو کیا مضائقہ ہے۔ شیخ الاسلام نے سوال کیا، وہ کون سے مقامات ہیں، جہاں صاحب ہدایہ نے غلطی کی ہے۔ آپ کو اس کا ثبوت دینا چاہیے۔ مولانا نے اپنے بیٹوں اور شاگردوں کو اشارہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں تقریر کریں اور ان مقامات کی وضاحت کریں جہاں صاحب ہدایہ نے ارتکابِ خطا کیا ہے۔ لیکن امیر تیمور نے

صاحبِ ہدایہ کے احترام اور شیخ الاسلام کے ناموس کا لحاظ کرتے ہوئے، اس گفتگو کو کسی دوسرے موقع پر ملتوی کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد مولانا احمد تھانیسری نے اہل و عیال کو ساتھ لیا اور دہلی سے کالپی تشریف لے گئے اور اسی کو مستقل طور سے وطن قرار دے لیا۔ امیر تیمور ان کے علم و فضل سے اس درجہ متأثر ہوا کہ ان کو اپنا مصاحب و ندیم بنانے کی کوشش کی اور اپنے ساتھ سمرقند جانے کو کہا مگر انھوں نے انکار کر دیا اور کالپی چلے گئے۔ وہاں مولانا خواجگی پہلے سے موجود تھے۔ ان سے پھر برادرانہ و دوستانہ تعلقات قائم کر لیے۔ ۸۲۰ھ کو شہر کالپی میں وفات پائی اور کالپی کے قلعہ میں دفن کیے گئے۔ مادۂ تاریخ ”گلشنِ ہدایت“ ہے۔

مولانا احمد تھانیسری اونچے درجے کے شاعر اور فصیح الکلام اور بلیغ البیان بزرگ تھے۔ اس کا اندازہ اس نعت سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہی:

۱۔ اطار لبی حنین الطائر الغرد	وهاج لوعة قلبي التائه الكمد
۲۔ واذكرتني عهودا بالحمى سلفت	حمامة صدحت من لاعج الكبد
۳۔ بانت تؤرقني والقوم قد هجعوا	من بين مضطجع منهم ومستند
۴۔ ما زارطرفي غمض بعد بعدكم	ولا لخيال سرور دار في خلدي
۵۔ ليت الهوى لم يكن بيني وبينكم	وليت حبل ودادي غير منعقد
۶۔ كانت مواسم ايام وغرتها	ولت سراعا على رغم ولم تعد
۷۔ عشنا بها وعيون البين راقدة	والقلب في جذل والدهر في رقد
۸۔ والهم منصدع والكرب مندفع	والجد مرتفع كالانجم السعد
۹۔ والشعب ملتئم والعهد منهزم	والشمل منتظم لم يرم بالبدد
۱۰۔ حتى استهل غراب البين فارتحلوا	عند الصباح وشد العيس بالقتد
۱۱۔ من كل هوجاء مرقال عذافرة	تبدي النشاط على الاعياء والنجد

۱۲- کانہ لم یکن بین الحمیٰ انس | الی اللوی وکأن الحمیٰ لم یفد
۱۳- صاروا احادیث تروی بعد ما ملؤوا | سامع الدھر بالالفاظ کالشھد
۱۴- بقیت فردا وراح الناس کلھم | کالسیف یبقی بلا اغمادہ الفرد
۱۵- لاعیش بعد لُبَیلات اللویٰ رغدا | ولا وصول الی ذاک الحمی بیدی
۱۶- خل الاحادیث عن لیلی وجارتھا | وارحل الی السید المختار من ادد
۱۷- ولیس فی الدین والدنیا واُخرتی | سری جناب رسول اللہ معتمدی
۱۸- برٌّ رؤف رحیم سید سند | سھل الفناء رحیب الباع والصفد
۱۹- رب الندی والجدی والصالحات معًا | طفلا وکھلا وفی شب وفی مرد
۲۰- بالعلم مکتنف بالحلم متصف | باللطف ملتحف بالبر متسد
۲۱- بالخلق مشتمل بالرفق مکتحل | بالحق متصل بالصدق منفرد
۲۲- بالشرع معتصم للدین منتقم | فی اللہ مجتھد باللہ مقتصد
۲۳- بالفقر مفتخر بالزھد مشتھر | بالشکر متزر بالحمد منجرد
۲۴- خطّاب مفصلۃ وصنّاع مکرمۃ | دفّاع مظلمۃ عن کل مضطھد
۲۵- العدل سیرتہ والفضل طینتہ | والبذل شیمتہ فی الوجد والوجد

درج ذیل قصیدہ بھی اسی موضوع سے تعلق رکھتا ہے:

۱- یا افضل الناس من ماض ومؤتنف | واکرم الخلق من حر ومن عبد
۲- افدیک بالروح والقلب المشوق معا | والنفس والمال والاھلین والولد
۳- قد عاقنی البعد عن مرمای یا سکنی | وطال شوقی الی لقیاک یا سندی
۴- ویا حیوتی ویا روحی ویا جسدی | ویا فؤادی ویا ظھری ویا عضدی
۵- مالی الیک بقطع البید من قبل | ولیس لی باصطبار عنک من مدد
۶- وھل تُخِبّ بنا خوص مرجمۃ | نحو الحجاز ونحو البان والنجد
۷- وھل اسامر فیھا اھلھا سحرا | وھل اَجُرُّ بھا الاذیال من بُرُد
۸- ارجو الوفادۃ فی ارض حللت بھا | یا لھف نفسی اذا ما کنت لم اقد

۹- عطفا علی ورفقابی ومکرمة — فلیس غیرک یا مولای ملتحدی

۱۰- واشفع الی اللہ لی فی ان یثبطنی — عن الھوی وذوی الدنیا وعن سدد

۱۱- یارب صل وسلم دائما ابدا — علی النبی نبی الحق والرشد

۱۲- محمد احمد الھادی لامتہ — الی الصراط صراط غیر ملتحد

۱۳- وصحبہ وذویہ الطاہرین ومن — احبھم شغفا فی الغیب والعتد

۱۴- مالاح برق وماسح الغمام علی — ربی الفلا فکساھا حلة القتد

۱۵- واغبق الروض بالازھار مونقة — مسطورة بحبی باکر برد

۱۶- وماتغرد غرید علی فنن — غض الاروم مخضل وملتبد ؎

۱- گانے والے پرندے کی آواز نے میرے ہوش اڑادیئے اور میرے حیران اور بے چین دل کے سوزِ غم میں ہیجان برپا ہوگیا۔

۲- ایک کبوتری نے جلے ہوئے دل سے فریاد نکال کر مجھے حمیٰ کے گزرے ہوئے واقعات کی یاد دلادی۔

۳- (اور) مجھے رات بھر جگائے رکھا، جب کہ لوگ لیٹے ہوئے تھے اور تکیہ لگائے آرام سے سورہے تھے۔

۴- تمہاری دوری کے بعد نہ میری آنکھوں کو نیند نصیب ہوئی، نہ میرے دل میں کوئی مسرت کا جذبہ ابھرا۔

۵- کاش میرے اور تمہارے درمیان محبت کے جذبات کروٹ نہ لیتے اور کاش میری محبت کی رسی بٹی ہی نہ ہوتی۔

۶- وہاں کی خوشیوں کے دن اور وہاں کی بہاریں میری مرضی کے خلاف تیزی سے گزر گئیں۔

؎ ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: اخبار الاخیار، ص ۱۴۴ تا ۱۴۶۔ سبحۃ المرجان ص ۳۷، ۳۸۔ مآثر الکرام، ص ۱۶۹، ۱۷۰۔ ابجد العلوم، ص ۸۹۲، ۸۹۳۔ خزینۃ الاصفیا، ج ا ص ۳۴۹، ۳۵۰۔ حدائق الحنفیہ، ص ۳۱۲-۳۱۳۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۸ تا ۱۳۔

اور پھر لوٹ کر نہ آئیں۔

۷- ہم نے وہاں زندگی گزاری اور آنکھیں سو رہی تھیں۔ دل ٹھکانے تھا اور زمانہ بھی آرام کر رہا تھا۔

۸- غم (کا بادل) چھٹ چکا تھا اور کرب دور ہو چکا تھا اور خوش بختی سعد ستاروں کی طرح بلند تھی۔

۹- قبیلہ اکٹھا تھا۔ زمانہ گزر رہا تھا اور جماعت ایسی منظم تھی کہ جس پر انتشار کا طعنہ نہیں دیا گیا۔

۱۰- یہاں تک کہ جدائی کے کوّے نے آواز دی اور لوگ صبح کے وقت روانہ ہونے اور اونٹوں کے کجاوے باندھنے لگے۔

۱۱- (اور وہ بھی ایسے) اونٹ جو ہوا سے باتیں کرنے والے تیز رفتار اور مضبوط ہوں اور تھکا دینے والی بلندی کو سَر کرنے میں بھی خوشی اور چُستی محسوس کریں۔

۱۲- (اس طرح رخصت ہوئے کہ) گویا حمٰی سے لوی تک کے درمیان نہ کوئی جان پہچان والا تھا اور نہ ادھر کوئی قبیلہ آیا۔

۱۳- یہ سب وہ داستانیں بن گئے جن کا ذکر کیا جاتا ہے، حالانکہ پہلے انھوں نے زمانے کے کانوں کو الفاظ سے اس طرح بھر دیا تھا جیسے شہد ہو۔

۱۴- لوگ سب کے سب چلے گئے اور میں اس طرح اکیلا رہ گیا جیسے بے نیام کی تنہا تلوار۔

۱۵- لوی کی راتوں کے بعد، اب زندگی کا کوئی مزہ نہیں رہا اور نہ اب حُمیٰ تک پہنچنے کی مجھے دسترس ہے۔

۱۶- لیلیٰ اور اس کی دمن کے ذکر کو چھوڑو اور اس مصیبت سے نکل کر سیّد مختار کی طرف آؤ۔

۱۷- دین، دنیا اور آخرت میں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا میرے لیے کوئی نہیں جس پر اعتماد کیا جائے۔

۱۸- آپؐ پیکرِ نیکی ہیں، رؤف و رحیم اور سیّد و سند ہیں۔ نرم صحن والے، کشادہ دشت اور فراخ بخشش ہیں۔

۱۹- سخاوت و کرم اور حسنات والے بھی ہیں۔ عالمِ طفولیت میں بھی، جوانی میں بھی اور

لڑکپن میں بھی۔

۲۰۔ علم سے آراستہ، حلم سے متصف، لطف و کرم کی ردا اوڑھے ہوئے اور بر و تقویٰ کا تکیہ لگائے ہوئے ہیں۔

۲۱۔ اخلاق کی چادر میں لپٹے ہوئے اور نرمی و سنت کا سرمہ لگائے ہوئے ہیں۔ حق سے اتصال پذیر اور وابستہ اور سچائی میں یگانہ ہیں۔

۲۲۔ شرع کا دامن مضبوطی سے پکڑے ہوئے اور دینی سزا نافذ کرنے والے ہیں۔ راہِ خدا میں کوشاں اور اللہ کے معاملے میں استقامت اختیار کرنے والے ہیں۔

۲۳۔ قابلِ فخر باتوں کا افتخار رکھتے ہیں اور زہد میں شہرۂ آفاق ہیں۔ شکر کا آزار باندھے اور حمد میں رواں دواں ہیں۔

۲۴۔ اعلیٰ مفصل خطابت والے، لطف و کرم کو پوری طرح قائم کرنے والے اور ہر ظالم کے ظلم کو سر اعتبار سے دور کرنے والے ہیں۔

۲۵۔ عدل آپؐ کی سیرت اور فضل آپؐ کی طینت ہے۔ جود و عطا آپؐ کی خصلت ہے، فراخی میں بھی اور تنگی میں بھی۔

ایک اور نعت کا ترجمہ یہ ہے:

۱۔ اے تمام گزشتہ اور موجودہ انسانوں سے افضل اور اے تمام آزاد و غلام سے اکرم۔

۲۔ میری روح، مشتاق دل، جان، مال، خاندان اور اولاد سب کچھ آپ پر قربان ہیں۔

۳۔ اے آرام جانؐ، مجھے دوری نے منزلِ مقصود پر پہنچنے سے روک دیا، اور اے سندی! آپ سے شوقِ ملاقات مدتِ دراز سے (دل کو بے چین کیے ہوئے) ہے۔

۴۔ اے میری زندگی، میری روح، میرے جسم، میرے دل، میری پشت اور میرے بازو۔

۵۔ آپ کی طرف مسافت کا میدان طے کرنے کا مجھ میں یارا نہیں، آپ کی جدائی میں صبر کرنے کا کوئی چارہ نہیں۔

۶۔ کیا کھجور کے بکھرے ہوئے پتے، ہمیں حجاز، شجر بانی اور اونچی زمین کی طرف دوڑا کر لے جائیں گے۔؟

۷۔ کیا میں وہاں کے لوگوں سے ساری رات باتیں کر سکوں گا اور کیا وہاں چادر کے کنارے (اپنی طرف) کھینچ سکوں گا۔؟

۸۔ جس سرزمین میں، میں داخل ہوا، اس میں وہاں پیامبری کا آرزو مند ہوں اور اگر میں قاصد نہ بن سکوں تو مجھ پر تف ہے۔

۹۔ مجھ پر مہربانی ہو۔ نوازش و کرم ہو۔ کیوں کہ اے آقا، میرے لیے آپ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں۔

۱۰۔ میرے لیے اللہ سے سفارش کیجیے کہ وہ مجھے نفسانی خواہش سے دنیا داروں سے اور ردکاوٹوں سے دور رکھے۔

۱۱۔ اے میرے رب! نبی برحق اور رسولِ ہدایت پر ہمیشہ ہمیشہ صلوٰۃ وسلام بھیجتا رہ۔

۱۲۔ یعنی محمد و احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جو اپنی امت کو اس راستے پر چلنے کی ہدایت فرمانے والے ہیں جو ہرگز غیر دینی راہ نہیں ہے۔

۱۳۔ اور ان کے صحابہ کرام اور پاک آل پر بھی (درود بھیج) اور اس پر بھی جو ان حضرات سے ظاہراً و باطناً غایت درجے کی محبت رکھتا ہے۔

۱۴۔ اس وقت تک (درود بھیجتا رہ) جب تک بجلی چمکتی رہے اور بادل میدانی ٹیلوں پر برس کر انھیں ایسا سرسبز و شاداب کرتے رہیں، جیسے مخمل کی چادر پہنا دی گئی ہو۔

۱۵۔ اور جب تک باغ قرینے سے سجے ہوئے پھولوں سے مہکتے رہیں اور میری اولیں اور خنک محبت کی بارش سے سیراب رہیں۔

۱۶۔ اور جب تک کوئی پرندہ ہری اور گھنی شاخ پر بیٹھا نغمہ سرائی کرتا ہے اور اس کی جڑ شاداب رہے۔

ایک مرتبہ قیام کالپی کے دوران میں مولانا احمد کے بیٹوں اور مولانا خواجگی کے معنوی فرزند و تلمیذ قاضی شہاب الدین کے درمیان معاصرانہ چشمک ہوگئی۔ قاضی شہاب الدین نے مولانا احمد کے بیٹوں کی شکایت اپنے استاذ مولانا خواجگی سے کی اور اس سلسلے میں ایک مکتوب کے ذریعے ان سے امداد کے خواہاں ہوئے۔ مولانا خواجگی نے شکایت کے جواب

میں شیخ سعدی کے یہ دو شعر قاضی موصوف کو لکھ بھیجے۔

اے بیش از آنکہ در قلم آید ثنائے تو واجب بر اہل مشرق و مغرب دعائے تو
اے در بقائے عمر تو نفع جہانیان باقی مباد آنکہ نخواہد بقائے تو[۵۸]

۶۔ شیخ احمد بن محمود نہروالی

شیخ احمد بن محمود حسینی عریضی نہروالی گجراتی ایک صالح عالم دین اور معروف فقیہ تھے۔ ان کا شمار مشائخ چشتیہ میں ہوتا تھا۔ گجرات میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ اپنے چچا شیخ حسین بن عمر عریضی غیاث پوری گجراتی سے مختلف علوم کی تحصیل کی اور ایک مدت تک ان کے ساتھ منسلک رہے۔ علم طریقت و تصوف بھی ان ہی سے حاصل کیا اور ان کی وفات کے بعد مسندِ مشیخت پر متمکن ہوئے۔

شیخ موصوف صاحبِ وجد و حال بزرگ تھے اور حالتِ وجد ہی میں، ۷ محرم کو ۸۰۰ھ کے بعد نہروالی میں وفات پائی اور اپنے چچا شیخ حسین بن عمر کے قریب دفن کیے گئے[۵۹]

۷۔ شیخ احمد بن یعقوب بھٹی

شیخ احمد بن یعقوب بن محمود بن سلیمان، علاقہ سندھ کے شہر بھٹ کے رہنے والے تھے۔ نہایت نیک اور پرہیز گار بزرگ تھے۔ مختلف علوم کے عالم اور بہت بڑے فقیہ تھے۔ ان کا لقب جلال الدین تھا۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت شیخ جلال الدین حسین بن احمد حسینی بخاری اوچی کے شاگرد تھے۔ ان سے انھوں نے قاضی عیاض کی مشہور کتاب منتفق النظم و الشفا فی حقوق المصطفیٰ باقاعدہ درساً درساً

---

۵۸ اخبار الاخیار، ص ۱۴۵۔

۵۹ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۵ — گلزار ابرار، ص ۱۵۵ تا ۱۵۷۔

پڑھی تھی۔ احادیث کی بعض کتابوں کا بھی ان سے درس لیا۔ یہ مصنف بھی تھے اور انھوں نے خزانتہ الفوائد الجلالیہ کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو ان کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے اور کتاب اپنے موضوع میں بڑی جامع اور مفید ہے۔ صاحبِ نزہۃ الخواطر علامہ سید عبد الحی حسنی لکھنوی لکھتے ہیں کہ اس کتاب کا ایک نسخہ لکھنؤ میں سید نور الحسن بن نواب صدیق حسن قنوجی رحمہ اللہ کے کتب خانے میں موجود تھا۔[۱۰]

۸۔ شیخ احمد کھٹوی

شیخ احمد بن عبداللہ کھٹوی سرکھیجی کا لقب شہاب الدین تھا۔ عابد و زاہد اور فقیہہ تھے اور سرزمینِ ہند کے ان خوش بخت حضرات میں سے تھے جو علم فقہ سے بھی بہرہ مند تھے اور زیورِ تصوف و طریقت سے بھی مزیّن تھے۔ ان کا تعلق علاقۂ گجرات کے عظیم مشائخ میں سے تھا۔ ۷۳۷ھ کو موضع کھٹو میں پیدا ہوئے جو ہندوستان کے مشہور شہر اجمیر کے قریب ہے۔ ان کے آبا و اجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ منقول ہے کہ بچپن کے زمانے میں ایک گاؤں میں گئے۔ وہاں گاؤں کے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ نہایت تیز آندھی آئی جو ان کو اڑا کر کسی دوسری جگہ لے گئی اور اس طرح یہ اپنے وطن سے بہت دور چلے گئے، جہاں بالکل بے یار و مددگار ہو گئے۔ پردیسیوں کی طرح اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ ایک روز کہیں جا رہے تھے کہ اتفاقاً ایک درویش کامل بابا اسحاق مغربی کا اُدھر سے گزر ہوا۔ انھوں نے ان کو لاوارث بچہ سمجھ کر اپنے ساتھ لیا اور اپنی قیام گاہ میں موضع کھٹو لے گئے۔ اب وہ بابا اسحاق مغربی کے پاس رہنے لگے اور انھوں نے ہی ان کی پرورش کی۔ ان کے فیضِ صحبت سے روحانی تعلیم و تربیت سے سرفراز ہوئے اور ایک ولی کامل کی حیثیت

---

[۱۰] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۵۔

سے دنیا کے سامنے نمودار ہوئے اور پھر ان ہی کی خلافت و اجازت کا شرف حاصل کیا۔
ان کے شیخ و مرشد شیخ اسحاق مغربی کا سلسلۂ نسب شیخ ابو مدین مغربی سے ملتا ہے۔ شیخ اسحاق نے بڑی لمبی عمر پائی تھی منقول ہے (تصوف کی اصطلاح میں) ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان چند ہی مشائخ کا واسطہ ہے۔ کہتے ہیں صرف پانچ واسطوں سے ان کا سلسلۂ مشیخت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی ہوتا ہے۔
یہ ۱۵۱ھ میں پیدا اور ۶۷۹ھ میں فوت ہوئے۔ اس حساب سے ان کی عمر ۱۲۸ سال بنتی ہے۔ ان کے بزرگوں میں سے ہر ایک نے تقریباً ڈیڑھ سو سال کی عمر پائی۔
شیخ اسحاق مغربی کی وفات کے بعد شیخ احمد کھٹو سے دہلی آگئے اور ظاہری علوم کی تحصیل کی۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو مسجد خان جہاں میں ڈیرے ڈال لیے اور عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ اشیائے اکل و شرب سے اس درجہ بے نیازی اختیار کر لی تھی کہ سوکھی اور باسی روٹی کا ایک ٹکڑا کھاتے اور اسی سے روزہ افطار کرتے۔ چلّے کے چالیس دنوں میں تو تقلیلِ غذا کا یہ عالم ہوتا کہ روزانہ صرف ایک کھجور کھاتے۔ ترکِ آسائش کی کیفیت یہ تھی کہ عمر بھر شادی نہیں کی۔ حج و زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔
فیروز شاہ کے دورِ حکومت میں اس کی طرف سے ایک شخص ظفر خاں نہر والہ کا حاکم مقرر تھا، جو بعد کو سلطان مظفر کے لقب سے مشہور ہوا۔ شیخ احمد کے قیام دہلی کے زمانے میں یہ شیخ احمد سے متعارف بلکہ متاثر تھا۔ جب یہ گجرات کا فرماں روا بنا تو اس نے شیخ احمد کو گجرات تشریف لانے اور وہیں مستقل طور سے مقیم ہو جانے پر مجبور کیا۔ چنانچہ شیخ موضع کھٹو سے علاقہ گجرات کے ایک مقام کھیج میں تشریف لے گئے اور وہیں اقامت اختیار کر لی۔ اس علاقے کے لوگوں نے ان سے خوب روحانی فیض حاصل کیا۔ ان کا دسترخوان بھی بہت وسیع تھا جس پر امیر و غریب اور شاہ و گدا سب حاضر ہوتے تھے۔
شیخ کے حلقۂ ارادت میں بے شمار لوگ موجود تھے۔ ان کے ایک مرید کا نام محمود بن سعید ایرجی تھا جنھوں نے "تحفۃ المجالس" کے نام سے ان کے ملفوظات

اور حالات و سوانح جمع کیے ہیں۔ اس کتاب میں ان کی نیکی و دینداری کشوف و کرامات اور تبحر علمی کے بہت سے واقعات مرقوم ہیں۔ جن میں سے چند واقعات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں

ایک تاجر کا واقعہ

ایک مرتبہ ایک بہت بڑا تاجر تیس سیر مصری اور کستوری کا ایک بڑا نافہ لے کر مسجد خان جہاں میں شیخ احمد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ نے اس تاجر سے پوچھا آپ کہاں سے آئے ہیں اور ہمیں کب سے جانتے ہیں؟ اس نے کہا، میں شیخ نور کا مرید ہوں جو پنڈوہ میں اقامت پذیر ہیں اور اس وقت وہیں سے آرہا ہوں۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ دہلی آچکا ہوں۔ گزشتہ دنوں دہلی سے سامان تجارت کی خرید و فروخت کے بعد شیخ نور کی خدمت میں پنڈوہ گیا تو انھوں نے پوچھا، تم نے دہلی میں کن کن مشائخ سے ملاقات کی؟ میں نے جن جن حضرات مشائخ سے شرف ملاقات حاصل کیا تھا، ان سب کے نام عرض کیے۔ فرمایا۔ شیخ احمد کھٹو سے ملے؟ ان کی یہ بات سن کر میں خاموش ہو گیا۔ فرمایا، اگر تم دہلی گئے اور شیخ احمد کھٹو سے نہیں ملے تو تمھارا سفر ضائع گیا اور دہلی کی مدت قیام بے مقصد رہی۔ مرشد کے اس فرمان سے میں سخت پریشان ہوا اور بے قراری کے عالم میں وہاں سے چلا اور اب آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔

تاجر کی یہ بات سن کر شیخ احمد نے فرمایا۔ شیخ نور سے نہ ہماری کبھی ملاقات ہوئی اور نہ آج تک انھوں نے ہم کو دیکھا ہے اور نہ ہم نے ان کو۔ لیکن اس بزرگ نے ہم کو اپنے کشف و کرامت کے ذریعے جان لیا، جو اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے

تیمور لنگ سے ملاقات

سلطان فیروز شاہ کو شیخ سے بے انتہا عقیدت تھی۔ امیر تیمور کے دہلی پر حملہ آور ہونے کے پندرہ دن پہلے شیخ نے اپنے کچھ عقیدت مندوں اور مریدوں اور خود

سلطان فیروز سے یہ کہا کہ تیمور لنگ دہلی پر حملہ کرے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان فیروز تو دہلی سے جون پور چلا گیا مگر شیخ دہلی ہی میں رہے اور فرمایا۔ ہم دہلی والوں کے ساتھ رہیں گے۔ جب تیمور نے دہلی پر حملہ کیا اور وہاں خون ریزی اور قتل وغارت کے بعد لوگوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو شیخ اور ان کے بعض معتقدین کو بھی مغلیہ فوج نے گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا۔ اتنے میں تیمور کو شیخ کی صالحیت و تدین کا پتہ چلا تو اس نے ان کو رہا کر دیا اور نہایت عزت و احترام سے پیش آیا۔ ایام نظر بندی کا ذکر کرتے ہوئے شیخ خود فرماتے ہیں:

چہل فقیران یا ما دران بند بودند، ہر روز چہل کاک گرم بر ما از غیب می فرستادند کہ خورش فقیراں می شد۔

یعنی ہمارے ساتھ چالیس فقیر جیل میں محبوس تھے۔ غیب سے روزانہ چالیس روٹیاں ہمارے لیے اللہ تعالیٰ بھیج دیتا اور ہم نہایت مزے سے کھاتے۔

ایک عجیب وغریب واقعہ

رہائی کے بعد کا ایک عجیب وغریب واقعہ شیخ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم بہت سے لوگ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ ہمارا جہاز سمندر میں جا رہا تھا کہ میں ایک دفعہ وضو کرنے لگا۔ اچانک میرا پاؤں پھسلا اور میں سمندر میں جا گرا گرتے ہی میں نے یَاحافظُ یَاحَفِیظُ یَارَقِیبُ یَاوَکِیلُ یَااللّٰہُ پڑھنا شروع کیا۔ میں پانی کی سطح پر تیرتا جا رہا تھا اور یہ وظیفہ میرے وردِ زبان تھا۔ اتنے میں مجھے اپنے پاؤں کے نیچے ایک پتھر معلوم ہوا اور میں اس پر کھڑا ہو گیا۔ پانی کمر تک تھا اور میں برابر یہ وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد ملاح اور جہاز کے کپتان نے مجھ کو مچھلی کی طرح اوپر اٹھا لیا۔

رسول اللہ کا مہمان

اس کے ساتھ ہی شیخ فرماتے ہیں کہ میں مکہ مکرمہ پہنچا، حج کیا اور مدینہ منورہ کو روانہ ہوا۔ مدینہ منورہ میں امام خان جہان شیخ تاج الدین سرکھیجی اور کچھ اور لوگ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم مسجد نبوی میں مقیم تھے۔ ہمارے ساتھیوں نے کھانا کھانے کا انتظام

کرنا چاہیے۔ میں نے کہا ہم تو کھانے کا انتظام نہیں کریں گے کیوں کہ ہم رسول اللہ کے مہمان ہیں۔ اس کے بعد وہ لوگ کھانا کھا کر واپس آئے، ہم نے ایک ساتھ عشا کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد وہ تو سو گئے اور میں ہاتھ دھو کر تسبیح پڑھنے لگا۔ ناگہاں ایک آواز آئی۔ "رسول اللہ کا مہمان کون ہے؟" میں نے خیال کیا کہ دوسرے آدمی کو آواز دی جارہی ہے۔ دوسری مرتبہ پھر یہی آواز فضا میں گونجی اور میرے کانوں سے ٹکرائی، لیکن میں اب بھی خاموش رہا۔ تیسری مرتبہ پھر یہی آواز بلند ہوئی اور میں نے سنی۔ اب میں سمجھا کہ یہ آواز مجھے ہی دی جارہی ہے اور رسول اللہ کا مہمان میں ہی ہوں۔ چنانچہ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور آواز دینے والے کے پاس پہنچا جو اپنے ہاتھ میں ایک خوان لیے کھڑا تھا۔ اس نے کہا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے۔ میں نے دامن پھیلایا، اور اس نے کھجوریں میرے دامن میں ڈال دیں۔ اور خالی خوان لے کر واپس چلا گیا۔ وہ کھجوریں میں نے منہ میں ڈالیں تو وہ اتنی لذیذ اور میٹھی تھیں کہ میں نے آج تک اس قسم کی کھجوریں نہیں کھائی تھیں۔

ایک خواب

کھجوریں کھانے کے بعد میں سو گیا۔ رات کو میں نے ایک خواب دیکھا اور وہی خواب میرے تینوں ساتھیوں نے بھی دیکھا، خواب یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہموار اور روشن مقام میں تشریف فرما ہیں۔ چند کبار صحابہ بھی وہاں کھڑے ہیں اور ایک عورت جو مختلف قسم کے زیور پہنے ہوئے ہے وہاں موجود ہے۔ آنحضرتؐ نے مجھے فرمایا اسے قبول کرلو۔ میں نے عرض کیا، ہمارے بزرگوں نے قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے فرمایا، یہ تمھارے والد ہیں۔ میں نے دیکھا تو حضرت علی اپنی انگلی دانتوں میں دبائے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ بابا احمد! رسول اکرمؐ کے حکم کی تعمیل کرو اور اس عورت کو قبول کرلو۔ چنانچہ میں نے اس عورت کو قبول کر لیا اور فوراً ہی میرے دل میں آیا کہ عورت کی صورت میں جو چیز سامنے کھڑی ہے وہ دنیا ہے اور رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ مجھے پوری دنیا مل گئی۔

سر پہ عمامہ باندھو

مدینہ منورہ سے ہماری واپسی کا وقت آیا تو ہم تینوں ساتھی آخری سلام کے لیے آنحضرتؐ کے روضۂ اقدس پر حاضر ہوئے۔ روضۂ مبارک کے خدام دس گز کے فاصلے پر ہاتھوں میں کالے دستانے چڑھائے کھڑے تھے مجھ سے کہا، یہ عمامہ لو میں نے جواب دیا ہمارے پیر و مرشد نے عمامہ نہیں باندھا، وہ ٹوپی پہنتے تھے۔ اس پر خدام نے کہا، رات خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ آپ کو دس گز کپڑا عمامہ باندھنے کے لیے دیا جائے اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا ہے کہ احمد کو ہمارا حکم ہے کہ یہ عمامہ اپنے سر پر باندھ لے اور مخلوقِ خدا کو اسلام کی دعوت دے۔ چنانچہ وہ کپڑا جو آنحضرتؐ کی طرف سے عطیہ تھا، میں نے ہاتھ میں لیا، اس کو چوما اور سر پر باندھ لیا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ کا شرفِ زیارت حاصل ہوا اور آپ نے ارشاد فرمایا کہ دہلی کی مسجد خان جہان میں رہ کر پہلے سے زیادہ ریاضت و عبادت اور مجاہدہ کیا جائے۔ اسی اثنا میں سید جلال الدین بخاری اوچی مخدوم جہانیاں کو بھی یہ ندائے غیبی سنائی دی کہ ایک جوان صالح دہلی کی مسجد خان جہان میں مشغولِ عبادت ہے اور بہت ہی ریاضت کر رہا ہے۔ چنانچہ ہم حج سے واپس آئے تو مسجد خان جہان میں سید جلال الدین بخاری میری ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ وہ مسجد کے قریب پہنچے تو ان کے ایک معتقد نے آکر مجھے اطلاع دی کہ مخدوم جہانیاں آپ سے ملنے کے لیے آرہے ہیں۔ میں فوراً اٹھا اور مسجد کے دروازے پر پہنچا، وہ پالکی میں سوار تھے، پالکی سے اترے اور نہایت شفقت اور پیار سے مجھے گلے لگایا اور دیر تک سینے سے چمٹائے رکھا۔ پھر پالکی میں بیٹھ کر واپس چلے گئے اور میں مسجد میں واپس آکر مصروف عبادت ہو گیا۔

سفر کے معمولات

ایک جگہ سفر کے معمولات بیان کرتے ہوئے اپنے بارے میں فرماتے ہیں۔ اس فقیر نے بغیر کسی رفیق اور سامان کے تنہا پورے گیارہ سال برہنہ پا سفر کیا ہے جس شہر اور قصبے میں جاتا، وہاں کی مسجد

میں رات بسر کرتا۔ دوران سفر میں اللہ ہی میرا نگہبان تھا ہمیشہ عشا کی نماز کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتا رہا۔ سفر میں روزے رکھتا اور مصروف ریاضت رہتا۔ فرماتے ہیں، اگرچہ سفر میں کئی قسم کی تکلیفیں بھی برداشت کرنا پڑتی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضور حق کی فرحت و مسرت قلب کو بہت زیادہ حاصل ہوتی ہے۔ پیدل سفر کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے پا پیادہ سفر آنحضرت کی اس حدیث کے پیش نظر کیا ہے، جس میں آپ فرماتے ہیں، ”امضوا حفاتا عراتا سترون اللہ جھرۃ“ ای عیاناً۔[۱]

ایک فقیر کا واقعہ

شیخ احمد کہتے ہیں، ایک روز ایک فقیر ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا۔ بابو جیو مجھے روزانہ چار روپے دیتے ہیں۔ میں نے بابو جیو سے کہا۔ یہ فقیر بے انتہا بھنگ پیتا ہے، ابھی ان روپوں کی بھنگ خریدے گا اور پی جائے گا۔ بابو جیو نے جواب دے۔

مارا از فعلِ ما خواہند پرسید　　　　و اورا از فعلِ او خواہند پرسید

ہم سے ہمارے کام کے بارے میں پوچھا جائے گا اور اس سے اس کے کام کے بارے میں!

ان دنوں میری عمر بارہ سال کی تھی۔ اس دن سے آج تک میں بابو جیو کی بات کی پیروی کرتا ہوں۔

اونچا ہاتھ

شیخ احمد کھٹوی کہتے ہیں، ایک دن بابو جیو نے مجھ سے کہا۔ بابا احمد! تم سخاوت بہت کرتے ہو۔ بھائی ہاتھ کبھی کبھی اونچا کیا کرو۔ میں نے کہا، بابو جیو، دعا کرو میرا ہاتھ ہمیشہ اونچا رہے، کبھی نیچا نہ ہو۔ اس پر بابو جیو نے کہا۔ ہم اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ بابا احمد کا ہاتھ ہمیشہ اونچا رہے اور خدا کی مخلوق ان سے

---

[۱] یہ الفاظ اخبار الاخیار، ص ۵۹ پر مرقوم ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے کہ تم برہنہ پا اور برہنہ جسم چلو تو اللہ تعالیٰ کو کھلے بندوں دیکھ لو گے۔ ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث مجھے احادیث کی کسی متداول اور مستند کتاب میں نہیں ملی۔

لیتی رہے۔ پھر یہ شعر پڑھا:

ہمت بلند دار کہ داور کردگار — بر ہمت بلند کند فضل خود نثار

اس کے بعد یہ حدیث پڑھی: یا ابن آدم انفق، انفق، انفق۔[۱۲]

پھر یہ آیت پڑھی: وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا۔[۱۳]

ایک استاذِ فقہ سے ملاقات

ایک دن شیخ نے فرمایا۔ فقیروں کی مجلس میں آنا آسان ہے لیکن وہاں سے اپنے آپ کو صحیح سالم واپس لے جانا مشکل ہے۔

اس پر مرتب ملفوظات شیخ محمود بن سعید ایرجی نے کہا سید بہاء الدین جو میری والدہ کے دادا تھے، فرمایا کرتے تھے تم ہر اس شخص کو درویش نہ سمجھو جو تمھارے پاس آتا اور گروہ درویشاں کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ اگر تم طاقت رکھتے ہو تو ان کی آنکھ، کان اور زبان پر قبضہ کر کے ان کے دلوں کو حاضر کر لو۔ میری یہ بات سن کر شیخ نے اپنا ایک واقعہ سنایا۔ انھوں نے بتایا کہ میں ایک مرتبہ سمرقند کی ایک مسجد میں پہنچا۔ وہاں ایک فقیہ طلبا کو پڑھا رہا تھا اور طلبا اس کے اردگرد بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ میں درویشوں کی سی ٹوپی سر پر رکھے اور فقیروں کا سا لباس پہنے ہوئے تھا، طلبا سے دور ہو کر بیٹھ گیا۔ ایک طالب علم حسامی پڑھ رہا تھا لیکن اس کی عبارت

---

[۱۲] ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے: اے ابن آدم خرچ کر، خرچ کر، خرچ کر۔ انفاق فی سبیل اللہ اور صدقات و خیرات کا تو بہت سی احادیث میں حکم دیا گیا ہے لیکن ان الفاظ پر مشتمل حدیث مجھے کتب احادیث میں نہیں ملی۔

[۱۳] یہ آیت سورہ مزمل کی آخری آیت کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: اور جو نیک عمل اپنے لیے آگے (ذخیرۂ آخرت بنا کر) بھیجو گے، اس کو اللہ کے پاس پہنچ کر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑا پاؤ گے۔

غلط پڑھ رہا تھا۔ میں نے دور سے بیٹھے ہوئے آواز دی:

اعراب غلط می خوانی۔

اعراب غلط پڑھ رہے ہو۔

میری آواز سنتے ہی ان کا فقیہہ استاذ اپنی نشست سے اٹھا، مجھ سے ملا اور وہاں سے اٹھا کر مجھے اپنی مسندِ درس کے قریب لے گیا۔ پھر اس نے علم اصول کے بارے میں مجھ سے چند سوالات پوچھے، جن کا میں نے صحیح صحیح جواب دیا۔ جب اس عالمِ فقہ کو میری علمی حیثیت کا پتا چلا تو وہ میری طرف مخاطب ہوا اور کہا:

با ایں چنیں علم جامہ مختصر و کلاہ بر سر چرا می پوشی۔

اس علم کے باوجود یہ معمولی سے کپڑے اور فقیروں کی سی ٹوپی کیوں پہن رکھی ہے۔

میں نے جواب دیا: یکے علم، دوم اگر جامہ لطیف بپوشم نفس بدخوئی کند۔ ایں درویش مخصوص خود را دریں لباس پوشیدہ می دارد۔

ایک تو میں علم کی نعمت سے بہرہ ور ہوں، دوسرے اس کی موجودگی میں اگر میں عمدہ لباس زیب تن کروں گا تو نفس بدخوئی کرے گا اور پندار میں مبتلا ہو گا، لہٰذا اس فقیر نے اپنے لیے یہ لباس مخصوص کر لیا ہے اور یہ اپنے آپ کو اس میں چھپائے رکھتا ہے۔

ایک قابلِ ذکر واقعہ

مصنف تحفۃ المجالس نے یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ تراویح میں ایک عالمِ دین مولانا محمد قاسم باقاعدہ قرآن مجید سنتے تھے منزل سورۃ الاعلیٰ تک پہنچ گئی تھی جس رات قرآن مجید ختم ہونا تھا، اسی رات شیخ احمد نے محمد قاسم سے کہا، آپ آج شب فلاں گاؤں چلے جائیں۔

مولانا کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی اور دل میں خیال آیا کہ آج رات کو نماز تراویح میں قرآن مجید ختم ہو جائے گا، کل علی الصبح روانہ ہو جاؤں گا۔ لیکن یہ بات شیخ سے نہ کہی کہ مبادا وہ اس کو سوئے ادب سمجھیں۔ تھوڑی دیر جب یوں ہی گزر گئی اور مولانا وہیں ٹھہرے رہے تو دوبارہ حکم دیا کہ آپ فلاں گاؤں چلے جائیں۔ چنانچہ وہ سلام کر کے اس گاؤں کو روانہ ہو گئے۔ قصبہ دولقہ میں پہنچے تو عشا کا وقت ہو چکا

تھا۔ تیزی سے نماز کے لیے مسجد میں گئے کہ امام کی اقتدا میں فرض پڑھیں۔ دو رکعت سنت ادا کی۔ بعد ازاں نماز تراویح کی نوبت آئی تو حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ امام نے سورۂ الاعلیٰ سے تراویح پڑھانا شروع کی۔ مولانا محمد قاسم نے سورۂ الاعلیٰ تک تو پورا قرآن مجید سن ہی لیا تھا، اب اس امام کے پیچھے باقی سورتیں بھی سن لیں۔

مولانا محمد قاسم اس گاؤں سے واپس لوٹ کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عرض کیا: مخدوم جیو عفو فرماید بندہ کہ مکث می کرد سبب ایں معنی بود کہ یک شب بماند ختم مرتب شود، بامداداں رواں شود۔

مخدوم معاف فرمایئے گا۔ تعمیل ارشاد میں میرے توقف کی وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید ختم ہونے میں بس ایک ہی رات باقی رہ گئی تھی۔ خیال یہ تھا کہ پورا قرآن مجید ختم ہونے کے بعد کل صبح سویرے چلا جاؤں گا۔

اس پر شیخ احمد نے کہا: مولانا! درویشاں از جہت کار دنیا کار دین از آن تو نقصان نخواہند کرد۔

مولانا! درویش کسی دینوی کام کے لیے آپ کے دینی کام میں نقصان نہیں پیدا کرتے۔

پھر فرمایا:

درویش کو بعض اوقات اللہ کی طرف سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کام کا انجام کیا ہو گا۔ چوں کہ دولقہ کے امام مسجد کو نماز تراویح میں سورۂ الاعلیٰ سے آگے کی سورتیں پڑھنا تھیں اس لیے آپ کو حکم دیا گیا کہ فوراً چلے جاؤ۔ یاد رکھو، درویش جس کام کو کہیں، اس کی تعمیل میں دیر نہ لگاؤ۔

تصنیف

شیخ احمد کی تصانیف میں سے ایک رسالہ ہے جو انھوں نے والیِ گجرات سلطان احمد شاہ کے لیے تصنیف کیا اور اس کی شرح ابو حامد اسماعیل بن ابراہیم نے لکھی۔ ان سے یہ رسالہ عبداللہ محمد بن عمر آصفی گجراتی نے تاریخ گجرات میں شیخ کی ولادت و وفات اور سوانح و حالات کے سلسلے میں نقل کیا ہے۔

وفات: شیخ احمد کھٹو نے ایک سو گیارہ سال عمر پا کر جمعرات کے روز قبل

از زوال ۱۴ شوال ۹۴۹ھ کو موضع مریکھیچ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

ان کے رسالہ کے شارح ابوحامد اسماعیل بن ابراہیم نے ان کا مرثیہ کہا، جس کا مطلع یہ ہے:

ان حزنا لنا اتمہ ببال نحن کالطین وھو مثل جبال

اور ان کی تاریخ وفات اس شعر سے نکالی:

طاء ومیم علی ثمان مئات کان دال یاء من الشوال

یہ شعر بھی اسی مرثیے کا ہے:

عمرہ دلنا علی انہ قطب مات یوم الخمیس قبل الزوال

والی گجرات سلطان محمد بن احمد کی مجلس میں بعض شعرا نے ان کی وفات پر یہ شعر کہے:

چو شیخ احمد امام دین و دنیا سوی فردوس می شد خرم و شاد
فلک می گفت در تاریخ آن سال شہ عالم محمد را بقا باد[۱۴]

۹- ملک العلما قاضی شہاب الدین احمد دولت آبادی

ولادت، وطن اور تعلیم و تربیت

ان کا نام احمد اور لقب شہاب الدین تھا۔ والد کا اسم گرامی شمس الدین اور جدامجد کا عمر تھا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے انھیں "مولانا قاضی شہاب الدین بن شمس الدین بن عمر الزاولی الدولت آبادی"[۱۵] لکھا ہے۔

فرشتہ نے ان کا ذکر سلطنت ابراہیم شرقی کے ضمن میں کیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق ان کا خاندان غزنی سے آیا تھا اور یہ اصلاً غزنی ہی کے باشندے تھے۔

از جملہ فضلائے عصر او یکے قاضی شہاب الدین جون پوری است۔ اصل او غزنین

---

۱۴ اخبار الاخیار، ص ۱۵۶ تا ۱۶۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۶ تا ۱۸

۱۵ ملاحظہ ہو سبحۃ المرجان، ص ۲۹۔ مآثر الکرام، ص ۱۷۱۔

است و در دولت آباد دکن نشو و نما یافت [۱۶]

(سلطان ابراہیم شرقی) کے فضلائے عصر میں سے ایک قاضی شہاب الدین جونپوری ہیں۔ ان کا مولد غزنی ہے اور انھوں نے دولت آباد دکن میں نشو و نما پائی۔

تذکرہ علمائے ہند میں مولوی رحمان علی لکھتے ہیں:

در دولت آباد متولد شدہ [۱۷]

(قاضی شہاب الدین) دولت آباد میں پیدا ہوئے۔

بظاہر ممکن ہے، ان کے بارے میں میر غلام علی آزاد، محمد قاسم فرشتہ اور مولوی رحمان علی کے بیانات میں کچھ اختلاف معلوم ہوتا ہو، کیوں کہ میر غلام علی نے ان کو زاولی، فرشتہ نے "اصل او غزنین است" اور مولوی رحمان علی نے "در دولت آباد متولد شدہ" لکھا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان تینوں بیانات میں کوئی اختلاف، کوئی منافات اور کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔ ان کا اصلی وطن زابلستان تھا۔ دریائے ہلمند اور دریائے قندھار کے بالائی حصوں کے علاقے کو عرب، زابلستان کے نام سے موسوم کرتے تھے اور بالخصوص اس سے وہ علاقہ مراد لیا جاتا ہے، جو غزنہ کے گرد واقع ہے۔ اس لیے اگر ان کو زاولی اور غزنہ کے باشندے کہا گیا ہے تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس میں اختلاف یا تضاد پایا جاتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے آبا و اجداد غزنی سے آئے اور دہلی میں اقامت گزین ہوگئے۔ اس کے بعد دولت آباد منتقل ہوگئے۔ اس لیے یہ دولت آبادی کہلائے۔ دولت آباد، شہر دیوگیر کا نام ہے اور یہ وہ شہر ہے جس کو سلطان محمد تغلق نے دہلی کے بجائے اپنا دارالسلطنت بنایا تھا۔ اس شہر کو بہت تھوڑا عرصہ تک دارالسلطنت کی حیثیت حاصل رہی۔ بعدازاں دارالسلطنت پھر دہلی ہی کو قرار دے دیا گیا تھا۔

---

۱۶ تاریخ فرشتہ، ج ۲، ص ۳۰۶۔ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ۔

۱۷ تذکرہ علمائے، ص ۸۸۔ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ (طبع دوم، ۱۹۱۴ء)

اساتذہ کرام

اگرچہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تاریخ ولادت کے بارے میں کوئی یقینی علم حاصل نہیں ہو سکا۔ تاہم ایک روایت کے مطابق یہ ۷۶۱ھ میں پیدا ہوئے[۱۸] انھوں نے ابتدائی تعلیم دولت آباد میں حاصل کی اور وہیں نشو و نما پائی۔ پھر دہلی تشریف لے گئے۔ مطولات کی تعلیم کا آغاز دہلی میں ہوا اور اس کے لیے سب سے پہلے قاضی عبدالمقتدر شریحی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور حدت فکر، سرعت فہم و ادراک اور بے پناہ ذکاوتِ ذہن کی بنا پر بہت جلد استاذ کی نظروں میں سما گئے۔ استاذ ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں میر غلام علی آزاد کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

قاضی عبدالمقتدر در باب او می فرمود، پیش من طالب علمے می آید کہ پوست او علم و مغز او علم، و استخوان او علم است[۱۹]

قاضی عبدالمقتدر ان کے بارے میں فرماتے ہیں، میرے پاس ایک ایسا طالب علم آیا ہے جس کا پوست علم ہے، مغز علم ہے اور ہڈیاں علم ہیں۔

یعنی سر سے پاؤں تک وہ علم ہی علم ہے۔

قاضی عبدالمقتدر شریحی کا انتقال ۷۹۱ھ میں ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد شیخ شہاب الدین مولانا خواجگی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ مولانا خواجگی اپنے دور کے بہت بڑے عالم اور مولانا معین الدین عمرانی کے شاگرد تھے۔ یہاں بھی اپنے رفقائے درس میں انھوں نے بہت جلد امتیازی مقام حاصل کر لیا۔ اس ضمن میں آزاد بلگرامی

---

[۱۸] اخبار الاخیار (اُردو ترجمہ)، ص ۳۲۱ مطبوعہ دارالاشاعت کراچی (۱۹۶۳ء)
یہاں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صاحب اخبار الاخیار شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اصل کتاب (فارسی) میں ان کی تاریخ ولادت کہیں نہیں لکھی۔ مترجم مولانا اقبال الدین احمد نے ۷۶۱ھ تحریر کی ہے مگر اس کا حوالہ نہیں دیا۔

[۱۹] مآثر الکرام، ص ۱۷۱۔ شائع کردہ شیخ شمس الحق۔ مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ۔ ۳۹۔ شارع علامہ اقبال لاہور

کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

مولانا القاضی شہاب الدین تلمذ القاضی عبد المقتدر الدھلوی و مولانا خواجگی الدھلوی وھو من تلامذۃ مولانا معین الدین العمرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ، ففاق اقرانہ وسبق اخوانہ۔[۲۰]

مولانا قاضی شہاب الدین نے قاضی عبد المقتدر دہلوی اور مولانا خواجگی دہلوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور (مولانا خواجگی) مولانا معین الدین عمرانی رحمۃ اللہ کے شاگردوں میں سے تھے۔ قاضی شہاب الدین اپنے اقران و معاصرین پر فوقیت حاصل کر گئے اور ساتھیوں پر سبقت لے گئے۔

۸۰۱ھ میں امیر تیمور ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور ساتھ ہی یہ وحشت ناک خبریں آنے لگیں کہ وہ بہت جلد دہلی پر حملہ کرنے والا ہے۔ اسی زمانے میں سید محمد گیسو درازؒ نے ایک خواب دیکھا، جس کی تعبیر دہلی پر مغلوں کا حملہ کی گئی اور اسی سے متاثر ہو کر مولانا خواجگی دہلی سے کالپی چلے گئے تھے۔

و مولانا خواجگی پیش از آمدن امیر تیمور گورگان بنا بر رویائے صالحہ کہ میر سید محمد گیسو درازؒ دیدہ بودند و از آمدن مغل اخبار نمودہ از دہلی برآمد بکالپی رسیدہ متوطن شد و در ہماں جا بسر برد۔[۲۱]

یعنی امیر تیمور کے حملے سے پہلے میر سید محمد گیسو درازؒ نے جو خواب دیکھا اور جس کی تعبیر مغلوں کا حملہ کی گئی تھی، مولانا خواجگی اس کی بنا پر دہلی کی سکونت ترک کر کے کالپی چلے گئے تھے، جو وہیں متوطن ہو گئے تھے اور پھر پوری زندگی وہیں بسر کی۔

دہلی سے روانگی اور جون پور میں قیام

بہر حال تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا اور وہ جہاں گیا قتل و غارت کا بازار گرم کرتا گیا۔ اس ضمن میں اس نے تلمبہ، ملتان اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں نہایت بے دردی کا مظاہرہ کیا۔ اس

---

[۲۰] سبحۃ المرجان۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، ص ۳۹۔

[۲۱] اخبار الاخیار، ص ۱۴۴۔

کی تفصیلات دہلی پہنچیں تو وہاں کے باشندے بہت پریشان ہوئے اور اعیان و اکابر اور علماء و صوفیا کی کثیر تعداد دہلی کی سکونت ترک کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ان میں مولانا خواجگی بھی تھے جنھوں نے اپنے شاگرد رشید شہاب الدین کو ساتھ لیا اور دہلی سے نکل کھڑے ہوئے اور کالپی جا پہنچے۔ کالپی اس زمانے میں ایک اہم اور بارونق شہر تھا۔ مولانا خواجگی تو کالپی ہی میں سکونت گزین ہو گئے مگر قاضی شہاب الدین وہاں سے جون پور تشریف لے گئے۔ جون پور کو اس دور میں سلطان ابراہیم شرقی کی علم دوستی اور معارف پروری نے مشرق کا شیراز بنا دیا تھا۔ ایک بہت بڑے عالم مولانا احمد تھانیسری تھے، جو مولانا خواجگی کے گہرے دوست تھے، یہ دہلی ہی میں رہ گئے تھے اور دہلی ہی میں تیمور کے دربار میں ان کا صاحب ہدایہ کے پوتے سے ایک تیز سا مکالمہ ہوا تھا۔ بعد میں یہ بھی کالپی چلے گئے تھے اور ان کی وفات کالپی ہی میں ہوئی۔

جون پور میں علمائے دین کی پذیرائی

مسلمانوں کی تاریخ کا یہ پہلو بہت ہی نمایاں ہے کہ حکمرانی و جہاں داری کے دربار میں علم و ادب کو نہ صرف یہ کہ ہر دور میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا گیا بلکہ اس کو ہمیشہ اونچا درجہ دیا گیا اور اہل علم، ارباب تحقیق اور اصحاب فتویٰ و تقویٰ کو ہر مقام پر فوقیت حاصل رہی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے اس پُرآشوب دور میں بھی جبکہ اس پر تیمور حملہ آور ہوا اور اس نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی تو اسی ملک کا دوسرا گوشہ جو جون پور کے نام سے معروف تھا، علمائے دین اور متبعین شریعت کے لیے دار الامان کی حیثیت اختیار کیا گیا۔ جو بزرگان دین دہلی اور اس کے گرد و نواح سے ہجرت کر کے وہاں پہنچے سلاطین جون پور ان سے انتہائی تکریم کے ساتھ پیش آئے۔ ان کا بدرجہ غایت خیر مقدم کیا اور ان کے شایان شان ان کو اعلیٰ مناصب عطا کیے۔ ان سلاطین میں ابراہیم شرقی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ وہ علمائے دین اور ارباب کمال کا بہت ہی قدردان تھا۔ اس نے ان کو بلند مرتبے پر فائز کیا اور اس کے زمانے میں بہترین کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اس ضمن میں طبقات اکبری کے مصنف نظام الدین کے الفاظ لائق مطالعہ ہیں۔

علماؤ بزرگان کہ از آشوبِ جہان پریشان خاطر بودند، بجون پور کہ درآن ایام دارالامان بود رو آوردند۔ وآن دارالسلطنت از فرقدوم علما دارالعلم گردید و چندین کتب ورسائل بنام او تصنیف شد۔ مثل حاشیہ ہندی و بحر مواج وفتاویٰ ابراہیم شاہی وارشاد وغیرہ ذالک۔ وچون عونِ الٰہی قرین آن بادشاہ عالم پرور بود لاجرم درعنفوانِ دولت بتجارب وکاردانی از جمیع سلاطینِ ہند در مضمار معالی قصب السبق ربود۔ [۲۲]

یعنی ان علما اور بزرگانِ دین نے جو دنیا کی تکلیفوں اور پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ اس دور میں اپنی تشریف آوری اور قیام سے جون پور کو سرفراز کیا۔ جس کی حیثیت اس زمانے میں دارالامن کی تھی اور یہ دارالسلطنت، علما کی آمد کی وجہ سے گہوارۂ علم قرار دیا گیا۔ (سلطان ابراہیم شرقی) کے نام سے اس زمانے میں چند کتابیں بھی تصنیف ہوئیں۔ مثلاً حاشیہ ہندی، بحرمواج، فتاویٰ ابراہیم شاہی اور ارشاد وغیرہ۔ اور چونکہ نصرتِ الٰہی سے یہ بادشاہ علما پرور تھا اس لیے آغاز حکمرانی میں تمام سلاطین ہند سے بازی لے گیا تھا۔

سلطان ابراہیم شرقی

ابراہیم شرقی کے اوصاف و کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرشتہ لکھتا ہے:

اما شاہے بود متصف بعقل ودانش وتدبیر، درعصروے فضلائے ممالکِ ہندوستان ودانشمندانِ ایران وتوران کہ از آشوبِ جہان پریشان خاطر بودند، بدارالامان جون پور آمدہ، درمہدِ امن وامان غنودند واز خوانِ احسان او زلہا برداشتہ، بنام نامی او چنانچہ بزبانِ علم خواہد آمد چندین کتب ورسائل پرداختند۔ [۲۳]

یعنی یہ وہ بادشاہ تھا جو عقل ودانش اور تدبیر کے اوصاف سے متصف تھا۔ اس

---

[۲۲] طبقاتِ اکبری از خواجہ نظام الدین احمد بن محمد مقیم ہروی، ج ۳، ص ۲۷۵۔ مطبوعہ باہتمام ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ مطبع ہٹسٹ مشن کلکتہ (۱۹۳۵ء)

[۲۳] تاریخ فرشتہ، ج ۲، ص ۳۰۵۔

کے عہد میں مختلف علاقہائے ہند کے فاضل اور ایران و توران کے وہ دانش مند و کامل حضرات، جون پور کے دارالامن میں تشریف لائے، جو آشوبِ جہان سے حیران اور پریشان خاطر تھے، ان کو اس کے عہدِ امن و امان میں پوری آسودگی حاصل ہوئی اور جیسا کہ آگے تحریر کیا جا رہا ہے، انھوں نے اس کے خوانِ احسان سے متمتع ہو کر، متعدد کتب و رسائل تصنیف کر کے اس کے نام سے منسوب کیں۔

چند علمائے کرام

جو علمائے عظام ان دنوں واردِ جون پور ہوئے، ان میں قاضی القضاۃ شیخ شہاب الدین دولت آبادی، شیخ ابوالفتح (نبیرہ قاضی عبدالمقتدر شریحی) قاضی احمد بن محمد (مصنف فتاویٰ ابراہیم شاہی)، قاضی تاج الدین ظفر آبادی، قاضی نصیر الدین (تلمیذ قاضی عبدالمقتدر شریحی)، شیخ خضر بن حسن بلخی اور قاضی نظام الدین غزنوی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سلاطین جون پور نے علمائے کرام کی بے حد قدر دانی کی۔ اور اسی وجہ سے ہندوستان کے مختلف گوشوں سے اٹھ کر بہت سے علما و فقہا نے اس شہر کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:[۲۴]

دارالحبور جون پور کانت دارالخلافۃ للسلاطین الشرقیۃ نشأ بہا کثیر من المشائخ والعلماء

جون پور، جو علما کا گہوارہ ہے، سلاطینِ شرقی کا دارالخلافہ تھا۔ اس میں کثیر تعداد میں علما و مشائخ پیدا ہوئے۔

قاضی شہاب الدین کی عزت افزائی

علمائے کرام کی اس جماعت کے ساتھ قاضی شہاب الدین بھی جو احمد بن عمر دولت آبادی کے نام سے موسوم تھے، جون پور پہنچے۔ اس دور کا حکمران سلطان ابراہیم شرقی ان کے علم و فضل کی فراوانیوں سے متاثر ہوا۔ ان کو ملک العلما کا خطاب

---

[۲۴] سبحۃ المرجان، ص ۳۹۔

دیا اور ممالک محروسہ کے عہدۂ قضا پر فائز کیا۔

وذهب الى دار الجبور جون فور، فاغتنمه السلطان ابراهيم الشرقي جون فور دروده ونصر سقاه السحاب الاحسان، ورده وعظمه بين الكبراء ولقبه بملك العلماء[۲۵]

قاضی شہاب الدین آستانۂ علما دجبور جون پور میں پہنچے تو سلطان ابراہیم شرقی نے ان کی تشریف آوری کو غنیمت جانا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ابر احسان سے اس سرزمین کو سیراب کیا۔ سلطان نے جماعت اکابر میں ان کو زیادہ لائق تعظیم گردانا اور ملک العلما کا خطاب عطا کیا۔[۲۶]

سلطان ابراہیم شرقی، ان سے اس درجہ توقیر سے پیش آتا تھا کہ انھیں متبرک تہواروں کے موقع پر چاندی کی کرسی پر بٹھاتا۔ فرشتہ لکھتا ہے:

سلطان ابراہیم در تعظیم و توقیر او بسیار می کوشید و در روز ہائے متبرک در مجلس او بر کرسی نقرہ می نشست۔[۲۷]

سلطان ابراہیم شرقی ان کی بے پناہ عزت کرتا اور متبرک ایام میں انھیں اپنے دربار میں نقرئی کرسی پر بٹھاتا۔

حسد و رقابت

سلطان ابراہیم شرقی کے دربار میں قاضی شہاب الدین کی غیر معمولی قدر و منزلت کی گئی۔

---

[۲۵] سبحۃ المرجان، ص ۳۹

[۲۶] ایک روایت کے مطابق ان کو ملک العلما کا خطاب شیخ اشرف جہانگیر نے دیا تھا:

حضرت قاضی خدمتے شائستہ و ملازمتے بابستہ شد و الباس خرقہ کردند و بخطاب ملک العلما کردند۔ (لطائف اشرفی، ج ۱، ص ۱۰۴)

یعنی قاضی شہاب الدین ان کی خدمت میں آئے اور ان سے منسلک ہوئے اور انھوں نے ان کو خرقہ پہنایا اور ملک العلما کا خطاب عطا کیا۔

[۲۷] تاریخ فرشتہ، ج ۲، ص ۳۰۶۔

اس سے ان کے بعض ہم عصروں کو بڑی تکلیف ہوئی۔ ان کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ ان کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنے لگے۔ قاضی موصوف اس سے نہایت پریشان ہوئے اور واقعہ کی تفصیل سے بذریعہ مکتوب اپنے استاذِ محترم مولانا خواجگی کو مطلع کیا۔ انھوں نے جواب میں مطمئن رہنے کی تلقین فرمائی اور چند ہی روز میں حاسدین کا یہ گروہ ختم ہوگیا۔ اس ضمن میں آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

قاضی جانب جون پور رفت، سلطان ابراہیم شرقی اشرق اللہ ضریحہ مقدم اورا مغتنم دانستہ۔ لوازم قدرشناسی افزوں از وصف بجا آورد و بہ خطاب ملک العلمائی بلند آوازہ ساخت۔ عرق حسد ابنائے جنس در جنبش آمد۔ قاضی شکایتِ حساد بمولانا خواجگی نوشت۔ مولانا ایں دو بیت شیخ سعدی شیرازی در جواب قلمی فرمود۔

اے بیش از آنکہ در قلم آید ثنائے تو — واجب بر اہل مشرق و مغرب دعائے تو
اے در بقائے عمر تو نفع جہانیاں — باقی مباد آنکہ نخواہد بقائے تو

گویند در اندک زمانی جماعۂ حساد فانی گشتند[۲۸]

یعنی قاضی شہاب الدین جون پور تشریف لے گئے۔ سلطان ابراہیم شرقی نے، اللہ اس کی قبر کو منور کرے، ان کے ورودِ مسعود کو مغتنم جانا۔ ان کی نہایت قدرشناسی کی اور ملک العلما کا خطاب عطا کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاصرین ان سے حسد کرنے لگے۔ قاضی موصوف نے اس کا شکوہ اپنے استاذ مکرم مولانا خواجگی سے کیا اور ان کو واقعہ کی تفصیل سے بذریعہ مکتوب مطلع فرمایا۔ مولانا خواجگی نے جواب میں ان کو شیخ سعدی شیرازی کے یہ دو شعر لکھ بھیجے:

اے بیش از آنکہ در قلم آید ثنائے تو — واجب بر اہل مشرق و مغرب دعائے تو
اے در بقائے عمر تو نفع جہانیاں — باقی مباد آنکہ نخواہد بقائے تو

---

۲۸ مآثر الکرام۔ از میر غلام علی آزاد بلگرامی دفتر اول مطبوعہ لاہور (۱۹۷۱ء)، ص ۱۷۱۔

کہتے ہیں، اس کے بعد چند ہی روز میں حاسدین کا یہ گروہ ختم ہو گیا۔

قاضی شہاب الدین کے حاسدین میں سرفہرست مولانا احمد تھانیسری کے لڑکے کا نام آتا ہے۔ مولانا احمد تھانیسری اور مولانا خواجگی ایک دوسرے کے مخلص دوست تھے۔ حملۂ تیموری کے زمانے میں مولانا خواجگی تو کالپی چلے گئے تھے مگر مولانا احمد تھانیسری نے دہلی ہی میں سکونت اختیار کیے رکھی۔ وہ یہ توقع رکھتے تھے کہ تیمور ان کے علمی مرتبے کے مطابق ان سے عزت و احترام کا برتاؤ کرے گا لیکن ان کی یہ توقع پوری نہ ہوئی اور وہ بھی کالپی چلے گئے اور وہاں جا کر اپنے پرانے دوست مولانا خواجگی کے ساتھ قدیم تعلقات کی تجدید کی۔ مولانا احمد تو کالپی میں وفات پا گئے مگر ان کی اولاد، ابراہیم شرقی کے جود وسخا اور معارف پروری و علم نوازی کی داستانیں سن کر جون پور پہنچی۔ وہاں انھوں نے جب یہ دیکھا کہ قاضی شہاب الدین تکریم و اعزاز کے بلند مقام پر فائز ہیں تو ان کے دل میں قاضی موصوف کے خلاف حسد و بغض کے جذبات ابھرنے لگے اور وہ ان کی ایذا رسانی کے درپے ہو گئے۔

قاضی شہاب الدین نے ایک مکتوب میں مولانا خواجگی سے اس کا شکوہ کیا تو انھوں نے جواب میں شیخ سعدی کے مندرجہ بالا دو شعر لکھ بھیجے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

مولانا احمد تھانیسری از آں جا با اہل و عیال برآمد و بکالپی متوطن شد و طریقۂ مواخات کہ میان مولانا خواجگی بود، سلوک می داشتہ اند۔ میانِ اولادِ ایشاں و قاضی شہاب الدین کہ شاگرد و فرزند معنوی مولانا خواجگی بود، نقار واقع شد۔ قاضی شکوہ ایشاں را بخدمت مولانا خواجگی نوشتہ، استعانت نمود۔ مولانا ایں دو بیت شیخ سعدی را در جواب او نوشت[۲۹]

یعنی مولانا احمد تھانیسری نے اہل و عیال کو ساتھ لیا، دہلی سے نکلے اور کالپی میں اقامت گزیں

---

۲۹ اخبار الاخیار، ص ۱۴۶۔

ہوگئے اور وہاں پہنچ کر مولانا خواجگی کے ساتھ دیرینہ تعلقات کی تجدید کی۔ پھر ان کی اولاد اور مولانا خواجگی کے معنوی فرزند قاضی شہاب الدین کے درمیان حسد پیدا ہوگیا۔ قاضی شہاب الدین نے ایک تحریر میں مولانا خواجگی سے اس کا شکوہ کیا اور ان سے اعانت چاہی تو مولانا خواجگی نے اس کے جواب میں شیخ سعدی کے وہ دو شعر لکھ بھیجے جو پہلے گزر چکے ہیں۔

تدریس اور تصنیف و تالیف

قاضی شہاب الدین کی وسعتِ علم اور جذبہ خدمتِ دین و ملت کا اندازہ لگایئے کہ اگر ایک طرف وہ جون پور کے منصبِ قضا پر متعین ہیں تو دوسری طرف وہاں کی مسندِ تدریس پر فائز ہیں۔ آزاد بلگرامی کے الفاظ ہیں:

فزین القاضی مسند الافادة وفاق البرجیس فی افاضة السعادة [۳۰]

قاضی شہاب الدین نے مسندِ درس و افادہ کو زینت بخشی اور علم و سعادت کی نشر و اشاعت میں سب سے فوقیت لے گئے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی بلند مرتبے پر پہنچے۔

والف کتبا سارت بھا ۔ رکبان العرب والعجم [۳۱]

اور ایسی کتابیں معرضِ تصنیف میں لائے جن کی وجہ سے عرب و عجم میں بڑی شہرت پائی۔

ان کے حالات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی تگ و تازِ علمی کے چار میدان تھے۔ ایک مسندِ قضا، دوسرے درس و افادہ، تیسرے تصنیف و تالیف اور چوتھے تصوف کے ذریعے تبلیغ دین۔

تصوّف

پہلے تین امور کی توضیح ہو چکی، تصوف کے بارے میں مرقوم ہے:

ہر چند آں برادر قدوۂ علمائے روزگار و زبدۂ فضلائے ہر دیار است۔ اما بعنایتِ الٰہی و حمایتِ نامتناہی واز التفاتِ ایں طائفہ علیہ و توجہاتِ ایں زمرۂ

۳۰؎ سبحۃ المرجان، ص ۳۹ ۳۱؎ ایضاً

سنیہ، شربے از مشرب صوفیہ وطربے از منصب بالمنیہ دارد و ایں را از اعلیٰ ترین دولت و احویٰ ترین رفعت تصور کند[۵۳۲]

یعنی ہر چند کہ قاضی شہاب الدین قدوۂ علمائے روزگار اور زبدۂ فضلائے دیار تھے۔ تاہم وہ اللہ کی عنایات و احسانات اور علما و صوفیا کی عالی مرتبت جماعت کی توجہ خاص سے مشرب تصوف اور منصبِ ولایت سے بھی بہرہ ور تھے اور اس کو عمدہ ترین دولت اور اعلیٰ ترین نعمت تصور کرتے تھے۔

شعر و شاعری

قاضی شہاب الدین شعر و شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور کبھی کبھی فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ ایک بادشاہ کے نام ایک کنیز کی ضرورت کے لیے انھوں نے یہ قطعہ لکھا، جو بہت مشہور ہے:

ایں نفس خاکسار کہ آتش سزائے اوست — پُر باد گشت لائق بے آب کردن است
یک کس چناں فرست کہ پا بر سرم نہد — زیرہ و ہمہ منی و تکبر کہ در من است

قدر و منزلت کی انتہا

قاضی موصوف چونکہ متعدد اوصاف کے مالک تھے اور علم و فضل کے ہر گوشے کے شناور تھے، ساتھ ہی زہد و اتقا کی نعمت سے بھی مالا مال تھے، لہٰذا سلطان ابراہیم شرقی کو قدرتی طور پر ان سے تعلق خاطر پیدا ہوا اور وہ ان سے اس درجہ عقیدت و مودت کا اظہار کرنے لگا کہ اگر ان کو تھوڑی سی تکلیف بھی پہنچ جاتی تو بے چین ہو جاتا اور ان کی تکلیف خود برداشت کرنے کے لیے تیار رہتا۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ فرشتہ نے ان الفاظ میں درج کیا ہے:

گویند وقتے مولانا را مرضے طاری شد، سلطان ابراہیم بعیادت او رفتہ۔ بعد از تفتیش احوال و اظہار لوازم مہربانی قدحے را پُر آب کرد گرد سر مولانا گردانید و

---

۵۳۲ مکتوب اشرفی بحوالہ اخبار الاخیار۔ ص ۱۶۷

خود نوشیدہ۔ گفت، بار خدایا، ہر بلائے کہ در راہِ او باشد، نصیبِ من گردان و اورا شفا بخش[۳۳]

کہتے ہیں، ایک مرتبہ مولانا شہاب الدین دولت آبادی ایک مرض میں مبتلا ہوئے، سلطان ابراہیم ان کی مزاج پرسی کے لیے گیا۔ حالات معلوم کرنے اور مہربانی و شفقت کے اظہار کے بعد اس نے پانی سے بھرا ہوا ایک پیالہ مولانا کے سر پر گھمایا، وہ پانی خود پیا اور کہا اے بارِ خدایا! جو مصیبت اس شخص پر آنے والی ہے، اس کو میرے لیے مقدر کر دے اور اس کو شفا عطا فرما۔

اس سے آگے فرشتہ لکھتا ہے:

وازیں جا عقیدۂ آں صاحبِ تاج و تخت نسبت بعلمائے شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم می تواں کرد کہ تا چہ غایت بود[۳۴]

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے علمائے کرام کے بارے میں یہ صاحبِ تاج و تخت کس درجہ عقیدت رکھتا تھا اور اس کو ان سے کتنی گہری محبت تھی۔

تصانیف

ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی جن تصنیفات کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو سکی ہیں، وہ یہ ہیں۔

بحرِ موّاج: یہ فارسی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ اس میں مصنف نے سجع کا التزام کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں حشو و مہمل الفاظ اور جملے بھی آگئے ہیں لیکن اس کے باوجود فی الجملہ یہ ایک مفید کتاب ہے اور اختصار و تہذیب اور تنقیح کی طالب ہے۔ اس میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ آیات میں تراکیبِ نحوی سے متعلق بحث کا بہت زیادہ اعتنا کیا گیا ہے اور ان کے وجوہِ وصل و فصل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب متعدد جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

۳۳ھ تاریخ فرشتہ، ج ۲، ص ۳۰۶ ۳۴ھ ایضاً

ارشاد : علم نحو میں یہ ایک نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اس میں تعبیر مسئلہ کے ضمن میں مثالیں دینے کا التزام کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع میں یہ ایک نادر کتاب ہے۔

حواشی کافیہ : یہ علم نحو کی مشہور کتاب کافیہ پر حواشی ہیں۔ یہ کتاب شرح ہندی کے نام سے معروف ہے۔ مولانا الہ داد جون پوری، علامہ غیاث الدین منصور شیرازی اور علامہ ابوالفضل خطیب گازرونی نے اس پر حواشی لکھے۔ یہ کتاب مصنف علام کی زندگی ہی میں بہت شہرت حاصل کر گئی تھی اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ملا عبدالرحمٰن جامی نے شرح جامی کے نام سے جب کافیہ کی شرح لکھی اور قاضی شہاب الدین نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ ملا جامی نے میری کتاب "شرح ہندی" کا خلاصہ لکھا ہے۔[۳۵]

شرح بزدوی : یہ کتاب اصول فقہ میں ہے اور مبحث امر تک ہے۔ یہ کتاب انھوں نے اپنے ایک تلمیذ شیخ محمد بن عیسیٰ جون پوری کے لیے لکھی۔

بدیع البیان : یہ کتاب فن بلاغت میں ہے اور اس کی عبارات میں سجع کی رعایت رکھی گئی ہے۔

قصیدہ بانت سعاد کی ایک طویل شرح سپرد قلم کی۔

شرح قصیدہ بردہ

رسالہ در تقسیم علوم وصنائع - فارسی میں ہے۔

ہدایۃ السعداء - فارسی میں ہے۔

مناقب السادات - یہ بھی فارسی میں ہے

رسالۃ فی العقیدۃ الاسلامیہ

ان کتابوں کے علاوہ بھی وہ متعدد کتب ورسائل کے مصنف تھے۔ یہ اسلامی ہند کے وہ عالم دین تھے، جو تمام مروجہ اصناف علم پر کامل عبور رکھتے تھے اور تفسیر، حدیث، فقہ، نحو، لغت، ادب اور بیان پر ان کو پوری دسترس حاصل تھی۔ اپنے زمانے میں فصاحت وبلاغت کے اونچے مرتبے پر فائز تھے۔

---

۳۵ بزم صوفیہ، ص ۴۴۷

ان کے سوانح نگاروں نے ان کا ذکر "وحید العصر، فرید الدہر اور صاحب تصانیف عالیہ" کے الفاظ کے ساتھ کیا ہے۔

وفات

ان کے سن وفات میں اختلاف ہے اور مختلف مورخین نے مختلف سنین وفات تحریر کیے ہیں۔ تاریخ فرشتہ میں مرقوم ہے کہ سلطان ابراہیم شرقی ان سے بے حد تعلقِ خاطر رکھتا تھا اور ان کو بھی اس سے انتہائی محبت تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب ۸۴۰ھ میں سلطان کا انتقال ہوا تو قاضی شہاب الدین اتنے مغموم ہوئے کہ یہ صدمہ برداشت نہ کرسکے اور اسی سال وفات پا گئے۔ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں:

قاضی شہاب الدین نیز با سلطان عصر موافقت کرد۔ چنداں از فوتِ ابراہیم شاہ مغموم گشت کہ در ہماں سال یعنی اربعین و ثمان مائۃ بعالم قدس تشریف برد۔ والبقاء للملک المعبود[۳۶]

یعنی قاضی شہاب الدین کو بھی سلطانِ وقت ابراہیم شاہ شرقی سے قلبی لگاؤ تھا۔ وہ اس کی وفات سے اس درجہ غمگین ہوئے کہ اسی سال ۸۴۰ھ میں دنیائے فانی سے عالم قدس میں تشریف لے گئے۔

اس سے آگے دوسری روایت کی رُو سے فرشتہ اُن کا سالِ وفات ۸۴۲ھ تحریر کرتا ہے۔

و بعضے گویند بدو سال بعد از فوتِ سلطان ابراہیم طائر روحش در سنہ اثنی و اربعین و ثمان مائۃ بروضہ رضوان پرواز کرد[۳۷]

بعض کہتے ہیں کہ سلطان ابراہیم کی وفات سے دو سال بعد ان کے طائر روح نے جنت الفردوس کو پرواز کی۔

---

[۳۶] تاریخ فرشتہ، ج ۲، ص ۳۰۶ [۳۷] ایضاً

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں ان کا سال وفات ۸۴۸ھ تحریر فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وفات او در سنہ ثمان واربعین وثمان مائۃ۔ قبر او در شہر جون پور است[۳۸]

کہ ان کی وفات ۸۴۸ھ میں ہوئی۔ قبر شہر جون پور میں ہے۔

صاحب حدائق الحنفیہ مولوی فقیر محمد جہلمی نے بھی سال ارتحال ۸۴۸ھ لکھا ہے اور "صدر نشین انجمن" سے تاریخ وفات نکالی ہے[۳۹]

تذکرہ علمائے ہند میں مولوی رحمان علی نے لکھا ہے کہ ۲۵ رجب ۸۴۹ھ کو ان کا انتقال ہوا۔ الفاظ یہ ہیں:

تاریخ بست وپنجم رجب سال ہشت صد وچہل ونہ ہجری رحلت فرمودہ بجون پور جانب جنوب، مسجد سلطان ابراہیم کہ بنام مسجد اٹالہ شہرت دارد۔ مدفون شدہ[۴۰]

کہ ۲۵ رجب ۸۴۹ھ کو رحلت فرمائی اور جون پور میں، مسجد سلطان ابراہیم کے جانب جنوب میں، جو کہ مسجد اٹالہ کے نام سے مشہور ہے، مدفون ہوئے۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی یہی تاریخ وفات لکھی ہے۔ وہ سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں۔

توفی لخمس بقین من رجب المرجب سنۃ تسع واربعین وثمان مائۃ ودفن بجون پور فی الجانب الجنوبی من مسجد السلطان ابراھیم الشرقی[۴۱]

۲۵ رجب المرجب ۸۴۹ھ کو فوت ہوئے اور جون پور میں، سلطان ابراہیم شرقی کی مسجد کے جنوبی جانب میں دفن کیے گئے۔

---

[۳۸] اخبار الاخیار، ص ۱۸۰

[۳۹] حدائق الحنفیہ، ص ۳۱۹

[۴۰] تذکرہ علمائے ہند، ص ۸۹۔

[۴۱] سبحۃ المرجان فی آثار ھندستان، ص ۳۹

آزاد بلگرامی نے ماثر الکرام میں بھی یہی تاریخ وفات لکھی ہے۔

"قاضی در بست و پنجم رجب المرجب سنہ تسع و اربعین و ثمان مائۃ بر گل گشت فردوس اعلیٰ شتافت۔ مرقد منورش در بلدۂ جون پور جانب جنوبی مسجد ابراہیم شرقی"[۴۲]

قاضی شہاب الدین ۲۵ رجب المرجب ۸۴۹ھ کو زینت آرائے گل گشت فردوس ہوئے۔ ان کا مرقد منور جون پور شہر میں مسجد ابراہیم شرقی کی جنوبی جانب میں ہے۔

مولوی ذوالفقار احمد مرحوم نے بھی یہی تاریخ وفات تحریر فرمائی ہے[۴۳]

نواب صدیق حسن خان مرحوم نے ابجد العلوم میں توفی فی سنۃ ۸۴۹ھ و دفن بجون پور تحریر کیا ہے۔

مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے بھی نزہۃ الخواطر میں یہی تاریخ لکھی ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"وکانت وفاتہ لخمس بقین من رجب سنۃ تسع و اربعین و ثمان مائۃ بمدینۃ جون پور فدفن جنوبی المسجد للسلطان ابراهیم الشرقی و مدرستہ"[۴۴]

یعنی وہ ۲۵ رجب ۸۴۹ھ کو شہر جون پور میں فوت ہوئے اور سلطان ابراہیم شرقی کی مسجد اور اپنے مدرسے کی جنوبی جانب میں دفن کیے گئے۔

اولاد

کسی تذکرے سے یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ قاضی شہاب الدین کی کوئی نرینہ اولاد بھی تھی۔ البتہ ان کی ایک لڑکی ضرور تھی، جس کی شادی اس دور کے مشہور عالم شیخ نصیر الدین بن شیخ نظام الدین کے ساتھ ہوئی تھی۔ شیخ نظام الدین امام ابوحنیفہؒ کی اولاد سے تھے، یہ اصلاً غزنی کے باشندے تھے۔ غزنی سے وارد ہند ہوئے، دہلی

---

۴۲ ماثر الکرام، ص ۱۷۲

۴۳ ملاحظہ ہو: قضاۃ الارب من ذکر علماء النحو و الادب، ص ۱۹۶، ۱۹۵ مطبوعہ مطبع فیض منبع مفید عام آگرہ۔ باہتمام محمد قادر علی خاں۔ متوفی (۱۳۱۶ھ)

۴۴ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۲۱۔ ابجد العلوم، ص ۸۹۲۔

آئے اور دہلی سے جون پور پہنچے۔ جون پور میں قاضی شہاب الدین سے تعارف ہوا تو انھوں نے ان کو سلطان ابراہیم شرقی کے مقربین میں شامل کر دیا۔ وہ ان کی گوناگوں صلاحیتوں سے اس درجہ متاثر ہوا کہ انھیں مچھلی شہر کے قاضی مقرر کر دیا۔

بہرحال ان کے حالات تو آگے بیان ہوں گے، یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ قاضی شہاب الدین کی اس لڑکی سے شیخ نصیر الدین بن نظام الدین کے یہاں تین لڑکے پیدا ہوئے۔ صفی الدین، رضی الدین اور فخر الدین۔!

شیخ صفی الدین اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم دین تھے۔ انھوں نے علوم ظاہری کی تکمیل تو اپنے نانا ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے کی اور علوم باطنی کے لیے سید اشرف بن ابراہیم سمنانی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس موقع پر شیخ رضی الدین کے مفصل حالات معرض تحریر میں لانا مقصود نہیں کیونکہ وہ اپنے اصل مقام پر درج کیے گئے ہیں۔ یہاں ہم فقط یہ عرض کر کے آگے نکل جانا چاہتے ہیں کہ اسلامی ہند کا یہ عظیم فرزند غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ ان کے علم و فضل کا اندازہ اس سے کیجیے کہ یہ ان دو فنی کتابوں کے مصنف ہیں جو اہل علم میں مشہور و متداول ہیں۔ ان میں ایک علم صرف کی "دستور المبتدی" ہے اور دوسری علم نحو کی شہرہ آفاق کتاب کافیہ ابن حاجب کی بسیط و مفصل شرح "غایۃ التحقیق"۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ غایۃ التحقیق ہندی نبوغ و عبقریت کا وہ عظیم علمی شاہکار ہے جس کا ذکر حاجی خلیفہ نے بھی کشف الظنون میں کیا ہے [۳۵]

قاضی شہاب الدین کے دوسرے نواسے شیخ رضی الدین تھے۔ انھوں نے اپنے نانا ہی سے فیض علم حاصل کیا تھا۔ فقہ و اصول اور علم کلام و عربیت میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ سلطان ابراہیم شرقی ان کے علم و فضل کی فراوانی سے اس درجہ متاثر تھا کہ اس نے ان کو ردولی کے منصب قضا پر متعین کر دیا تھا۔ یہ ردولی ہی میں سکونت پذیر

---

[۳۵] کشف الظنون ج ۲، ص ۱۲۷۵۔

ہو گئے تھے۔ قضا کے علاوہ ان کا مشغلہ درس و تدریس تھا۔ عمر بھر یہی خدمت انجام دیتے رہے۔

تیسرے نواسے مولانا فخر الدین تھے۔ یہ بھی جون پور میں پیدا ہوئے اور اپنے نانا قاضی شہاب الدین سے تعلیم حاصل کی اور فقہ و اصول اور کلام و عربیت میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔

تلامذہ

ملک العلما کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا اور ان میں بعض ایسے حضرات بھی شامل ہیں جو علوم و فنون کی تمام شاخوں پر گہری نظر رکھتے تھے اور بہت سی اہم کتابوں کے مصنف تھے۔ ان میں سے چند کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

۱۔ **مولانا علاءالدین جونپوری:** انھوں نے ایک عرصہ اپنے استاذ گرامی کی صحبت میں گزارا اور ان سے تعلیم حاصل کی۔ ملک العلما کو ان سے جو تعلق خاطر تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ان کے لیے ”کافیہ“ کی شرح لکھی، جو ”شرح ہندی“ کے نام سے معروف ہے۔ ان کے اس لائق شاگرد مولانا علاءالدین جون پوری نے اس شرح پر حاشیہ تحریر کیا۔

۲۔ **مولانا عبدالملک جون پوری:** جون پور میں پیدا ہوئے۔ ایام طفولیت ہی میں قاضی شہاب الدین سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں سندِ فراغ حاصل کی۔ پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اپنے عصر کے جلیل القدر عالم تھے۔ استاذ کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔

۳۔ **شیخ محمد بن عیسیٰ:** ۸۰۰ھ میں دارالسلطنت دہلی میں پیدا ہوئے۔ حملۂ تیمور کے دور میں دیگر بزرگان دین کے ساتھ ان کے والد گرامی بھی دہلی سے جون پور چلے گئے تھے۔ شیخ محمد بن عیسیٰ وہاں گئے تو شیخ فتح اللہ اودھی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ شیخ فتح اللہ نے تکمیل علوم شرعیہ کا حکم دیا تو قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ان کی ذہانت و قابلیت کی

وجہ سے قاضی شہاب الدین ان پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ انھوں نے اپنے اس لائق شاگرد کے لیے بحث امر تک اصول بزدوی کی مشہور شرح سپردِ قلم کی۔

ملک العلماء کے نواسوں اور شاگردوں کے حالات حروفِ تہجی کی ترتیب سے آئندہ صفحات میں علیحدہ علیحدہ بیان کیے گئے ہیں۔ یہاں چند الفاظ میں صرف ان کا تعارف مقصود تھا۔

۱۰۔ قاضی احمد بن محمد جون پوری

علامہ قاضی احمد بن محمد حنفی گیلانی بہت بڑے عالم اور اپنے عصر کے ممتاز مصنف اور مفتی تھے۔ ان کا لقب نظام الدین تھا اور اپنے لقب ہی سے مشہور تھے۔ ان کے آباو اجداد میں سے ایک بزرگ عرب سے واردِ ہند ہوئے اور گجرات (کاٹھیاوار) میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ وہیں نظام الدین کی ولادت ہوئی اور اسی شہر میں پلے بڑھے۔ اپنے دور کے مشہور اور عظیم اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور فقہ و اصول میں مرتبہ بلند پر فائز ہوئے حتیٰ کہ اپنے وقت کے بلند علما میں سے گردانے گئے اور کبار فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہونے لگا۔ اس زمانے میں سلطان ابراہیم شرقی اورنگ جون پور پر متمکن تھا۔ یہ حکمران عقل و دانش سے بہرہ ور اور علم و علما سے انتہائی محبت رکھتا تھا۔ اس کی علم پروری اور علما دوستی کی شہرت سن کر شیخ نظام الدین یعنی علامہ احمد بن محمد جون پور پہنچے اور ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے ملے۔ ملک العلما ان کی علمی قابلیت سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں سلطان ابراہیم شرقی سے ملایا۔ سلطان نے ان کی علمی و ذہنی قابلیت اور مختلف صلاحیتوں سے اثر پذیر ہو کر ان کو جون پور کا قاضی مقرر کر دیا اور اپنی عنایت و قبولیت سے نوازا۔ پھر انھوں نے جون پور ہی میں مستقل طور سے اقامت اختیار کر لی اور خود کو جون پوری کہلانے لگے۔

علوم دینیہ میں قاضی نظام الدین کا مرتبہ اس درجہ بلند تھا اور ملک العلما ان کے علمی تبحر سے اتنے متاثر تھے کہ ان کے پاس ملاقات آتے تو ان پر اس وقت تک

اپنی مہر نہ لگاتے تھے جب تک کہ قاضی نظام الدین ان پر دستخط ثبت نہ کر دیتے تھے۔ مسائل فقہ کے سلسلے میں وہ دیگر علما کے دستخطوں اور مہر کو زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔

قاضی نظام الدین جون پوری بہت بڑے مصنف بھی تھے مگر ان کی تصنیفات میں سے جس اہم اور مشہور تصنیف کا ہمیں علم ہو سکا ہے، وہ فتاویٰ ابراہیم شاہیہ ہے اگرچہ مصنف نے واضح الفاظ میں اس کو دو حصوں میں منقسم نہیں کیا مگر فتاوی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ فتاوی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ فارسی میں ہے جس کو حصۂ اول کہنا چاہیے۔ یہ حصۂ عبادات پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصۂ عربی میں ہے جس میں معاملات سے متعلق فقہی احکام درج کیے گئے ہیں

یہ فتاویٰ سلطان ابراہیم شرقی کی طرف منسوب ہے۔ اس کا ذکر حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں کیا ہے اور لکھا ہے:

ھو کتاب کبیر من افخر الکتب کقاضیخان، جمعہ من مائۃ و ستین کتابا للسلطان ابراھیم شاہ [۲۶]

کہ یہ بہت بڑی کتاب ہے اور فتاویٰ قاضی خاں کی طرح اہم ترین فقہی کتابوں میں سے ہے۔ مصنف نے یہ کتاب سلطان ابراہیم شرقی کے لیے لکھی اور اس کو ایک سو ساٹھ کتابوں میں سے جمع کیا ہے۔

فتاویٰ ابراہیم شاہی کا حصۂ عربی اور حصۂ فارسی دونوں غیر مطبوعہ ہیں اور ان کے قلمی نسخے جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا ہے، مندرجہ ذیل مقامات پر موجود ہیں۔

۱۔ پنجاب یونیورسٹی میں اس کا حصۂ فارسی بھی موجود ہے اور حصۂ عربی بھی۔ حصۂ فارسی کا نمبر ۸۹۹۱/۱۲ P D U ہے۔ اوراق ۱۵۸ اور سطور فی صفحہ ۲۷ ہیں۔ مکتوبہ، وقتِ چاشت، روز دوشنبہ، ۱۲۶۹ھ۔ کاتب کا نام درج نہیں۔ خط

---

۲۶ کشف الظنون ج ۱، ص ۲ ج ۲، ص ۱۲۸۲۔

نسخ، نستعلیق۔

حصہ عربی نمبر ۹۸ ARD II - اوراق ۴۳۵ - سطور فی صفحہ ۲۳ - خط نستعلیق کاتب کا نام درج نہیں۔

۲- رام پور لائبریری میں فتاویٰ ابراہیم شاہی کے دو نسخے ہیں۔ ایک حصہ کتاب الطہارت سے کتاب الفرائض تک ہے اور ۹۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا نمبر ۳۵۱ ہے۔ دوسرا نسخہ ناقص الطرفین ہے اور ۴۸۰ صفحات کو محیط ہے۔ اس کا نمبر ۳۵۲ ہے[۴۷]

۳- کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد دکن) میں اس کے حصہ فارسی کا ایک نسخہ ہے، جس کا نمبر ۱۱۷ ہے اور ۱۰۰۴ھ کا مکتوبہ ہے۔ صفحات ۳۱۹ اور سطور فی صفحہ ۲۱ ہیں[۴۸]۔

اسی کتب خانہ میں اس کے حصہ عربی کے نسخے کا نمبر ۲۷ ہے جو عمدہ کاغذ پر خوشخط خط نسخ میں ہے۔ ۱۰۸۷ھ کا مکتوبہ ہے۔ کاتب کا نام سید محمد ہے۔ حصہ اول صفحہ ایک سے صفحہ ۴۴۶ تک ہے اور حصہ دوم صفحہ ۴۴۷ سے شروع ہو کر صفحہ ۸۰۵ پر ختم ہوتا ہے۔ سطور فی صفحہ ہر دو حصہ ۲۵[۴۹]

۴- کشف الظنون میں حاجی خلیفہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے۔ یہ کتاب پاکستان اور ہندوستان کے علاوہ ترکی میں بھی موجود ہے[۵۰]

قاضی احمد بن محمد جون پوری کی یہ تصنیف جو فتاویٰ ابراہیم شاہی کے نام سے

---

۴۷ فہرست کتب عربی، کتب خانہ ریاست رام پور، ص ۲۲۰، ۲۲۱- مطبع احمدی، ریاست رام پور۔ (مطبوعہ مئی ۱۹۰۲ء)

۴۸ فہرست مشروح بعض کتب نفیسہ قلمیہ، مخزونہ کتب خانہ آصفیہ، سرکار عالی۔ (حصہ دوم)، ص ۱۳۹- مطبوعہ ۱۳۵۷ھ

۴۹ ایضاً، ص ۱۳

۵۰ کشف الظنون، ج ۱، ص ۳ و ج ۲، ص ۱۲۸۳۔

موسوم ہے، اپنے موضوع میں بڑی اہمیت کی حامل ہے اور اس کا شمار برّ صغیر پاک و ہند کی عظیم کتبِ فقہ میں ہوتا ہے۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود اب بھی یہ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہے اور اہل علم اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

قاضی احمد بن محمد جونپوری نے ایک روایت کے مطابق ۸۷۴ھ میں اور ایک روایت کے مطابق ۸۷۵ھ میں وفات پائی۔ ان کی قبر چاپک پور میں ہے جو اعمال جون پور میں واقع ہے[لـــه]

۱۱- شیخ احمد بن عمر پنڈوی

شیخ احمد کا لقب نور الدین بھی تھا اور علاء الدین بھی۔ یہ شیخ احمد بن عمر بن اسعد لاہوری پنڈوی ہیں۔ بہت بڑے عالم، عابد و زاہد اور فقیہ تھے۔ تدین و تقویٰ میں اس درجہ آگے بڑھے ہوئے تھے کہ لوگ ان کو نورِ الحق، علاء الحق اور قطب العالم کہتے تھے۔ اپنے دور کے اولیائے سالکین میں سے گردانے جاتے تھے، ریاضت و مجاہدہ میں اونچے مرتبہ پر فائز تھے۔ سرزمینِ بنگال کے شہر، پنڈوہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ شیخ حمید الدین احمد حسینی ناگوری مدفون بہ پنڈوہ سے تعلیم حاصل کی۔ اور اپنے والد مکرّم شیخ عمر بن اسعد کے حضور طریقت و تصوف کی منزلیں طے کیں اور عرصہ تک اس ضمن میں ان سے وابستگی اختیار کیے رکھی۔ قناعت و عفت اور ضبطِ نفس کے اوصاف سے متصف تھے اور ہر طرف سے منقطع ہو کر ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں منہمک رہتے تھے۔

منقول ہے کہ جو فقراء ان کے والد کی خانقاہ میں مقیم تھے، یہ ان ہی کی خدمت میں مصروف رہتے۔ پورے آٹھ سال تک ان کے لیے جنگل سے لکڑیاں چن کر لاتے

[لـــه] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۲۱، ۲۲، بحوالہ تجلی نور، تاریخ جون پور شیراز ہند، ص ۲۰۸ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ از صفحہ ۱۶۷ تا ۱۹۶۔

رہے۔ ان کے بھائی اعظم خاں منصب وزارت پر فائز تھے، ان کو ان کی خدمتِ فقرا کا یہ انداز پسند نہ تھا اور اس کو اپنی خاندانی اور علمی وجاہت کے منافی سمجھتے تھے۔

مدت تک فقرا کی رہائش گاہ میں جھاڑو دیتے اور ان کے بیت الخلا صاف کرتے رہے۔ کہتے ہیں ایک روز جھاڑو دے رہے تھے کہ بیت الخلا میں خانقاہ کا ایک فقیر بیٹھا تھا، جس کو یہ معلوم نہ تھا کہ شیخ احمد باہر جھاڑو دینے میں مصروف ہیں، اس کی ساری غلاظت شیخ احمد پر آپڑی۔ مگر شیخ بالکل خاموش رہے، نہ گھبرا کر اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر ہوئے اور نہ کوئی لفظ زبان سے نکالا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فقیر کو تکلیف پہنچے اور وہ آزردہ خاطر ہو۔

اپنے والد محترم شیخ عمر کی وفات کے بعد مسند نشین خلافت ہوئے اور ان سے شیخ حسام الدین مانکپوری اور بہت سے لوگوں نے ظاہری و باطنی علوم کی تحصیل کی۔

ان کی تصنیفات میں سے کچھ تو وہ مکتوبات ہیں جو انھوں نے اپنے تلامذہ اور عقیدت مندوں کو لکھے اور کچھ کتابیں ہیں، جن میں مونس الفقرا اور انیس الغربا زیادہ مشہور ہیں۔ ایک کتاب اذکار القوم واشغالہا ہے۔

ان کے کچھ ملفوظات بھی کتابوں میں منقول ہیں جو فارسی زبان میں ہیں۔

اس صوفی فقیہ اور معروف عالم دین نے ۹ ذی القعدہ ۸۱۰ھ میں شہر پنڈوہ میں وفات پائی۔ وہیں دفن کیے گئے۔[۵۲]

۱۲- قاضی اسحاق مالوی

قاضی اسحاق بن ابو اسحاق مالوی سلطان علاء الدین محمود شاہ مالوی کے زمانے کے عالم دین اور اپنے عصر کے نامور فقیہ تھے۔ ان کا شمار کبار مشائخ چشتیہ میں ہوتا تھا۔ سلطان علاء الدین محمود شاہ ان کی نیکی و تدین سے اس درجہ متاثر تھا کہ جنگ و جہاد

---

[۵۲] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۲۵ تا ۲۷ بحوالہ گنج ارشدی۔

کے لیے کسی طرف کا رخ کرتا تو پہلے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور فتح و کامرانی اور حصولِ برکت کے لیے ان سے باقاعدہ دعا کی التجا کرتا۔ اسی سلطان کے عہدِ حکومت میں ان کا انتقال ہوا[۵۳]

۱۳- قاضی اسماعیل اصفہانی

شیخ قاضی اسماعیل بن عبداللہ اصفہانی گجراتی فقہ و اصول کے جیّد علما میں سے تھے۔ عالمِ طفولیت میں اپنے والد (عبداللہ) کے ساتھ گجرات آئے اور یہاں سے اور دیگر علمائے گجرات سے تعلیم حاصل کی۔ علم کی منزلیں طے کر چکے تو شہر بھروچ کے عہدۂ قضا پر متعین کیے گئے اور طویل عرصہ تک اس منصب پر فائز رہے۔ بعد ازاں سلطان محمود کبیر کے ایامِ حکومت میں ان کو شہر احمد آباد کے قاضی مقرر کر دیا گیا، جس پر تمام عمر متعین رہے۔

صالحیت و عفت اور دینداری میں ان کا مقام بہت اونچا تھا۔ تصوّف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا اور یہ علم شیخ محمد بن عبداللہ حسینی گجراتی سے حاصل کیا تھا۔

تاریخ وفات ۲۶ ربیع الاوّل ۸۶۵ھ ہے[۵۴]

۱۴- شیخ اسماعیل بن صفی الدین ردولوی

شیخ اسماعیل بن صفی الدین بن نصیر الدین ردولوی ۱۲ ربیع الثانی ۸۹۷ھ کو پیدا ہوئے۔ ان کی کنیت ابوالمکارم تھی اور یہ شیخ اسماعیل ابوالمکارم خطیب نعمانی کے نام سے معروف تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ ان کے والد شیخ صفی الدین بہت بڑے عالم تھے قاضی شہاب الدین دولت آبادی

---

[۵۳] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۲۸ — گلزارِ ابرار، ص ۱۲۷، ۱۲۸

[۵۴] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۳۱ - بحوالہ تاریخ دکن۔ آصفی

کے نواسے اور ان کے شاگرد تھے۔ شیخ اسماعیل نے اپنے والد ہی سے تعلیم حاصل کی اور شیخ صفی الدین نے اپنے اس بیٹے کے لیے دو کتابیں بھی تصنیف کیں جو درس نظامیہ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک علم صرف کی مشہور کتاب دستور المبتدی اور دوسری کافیہ ابن حاجب کی مفصل و بسیط شرح غایۃ التحقیق۔

شیخ صفی الدین اپنے اس بیٹے کو بڑی نصیحتیں کیا کرتے تھے۔ فرمایا کرتے علما کے لیے ضروری ہے کہ وہ کم کھائیں، کم سوئیں اور شب کو کثرت سے مطالعہ کریں۔ یہ بھی فرماتے کہ رات کا مطالعہ قوتِ حافظہ کو بڑھاتا ہے۔ انھوں نے اپنے بیٹے اسماعیل کو وصیت کی تھی کہ علمائے سو میں سے نہ ہو جانا، اس لیے کہ بے عمل عالم اسی طرح ہے جیسا کہ کمان بغیر تانت کے۔ یا عالم بلا عمل اس آئینے کی مانند ہے جس پر گرد و غبار کی تہیں جمی ہوئی ہوں۔

شیخ اسماعیل بدرجہ غایت ذکی اور تیز ذہن تھے۔ وہ سولہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے اور پھر اپنے آپ کو درس اور افادۂ عام میں مشغول کر لیا تھا۔ اپنے والد شیخ صفی الدین کی وفات کے بعد باقاعدہ ان کی مسند پر بیٹھے اور حسنِ قبول سے بہرہ مند ہوئے۔ تدریس اور افتا کی مسند پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ ہر جمعہ کو مجلس وعظ بھی منعقد کرتے تھے۔

بدھ کے روز ۱۳ ربیع الاوّل ۸۶۰ھ کو وفات پائی۔[۵۵]

۱۵۔ سیّد اشرف جہاں گیر

والد اور والدہ

محمد اشرف نام اور جہاں گیر لقب تھا۔ حسنی حسینی سید تھے۔ آلِ سمنان سے تعلق رکھتے تھے۔ ولادت بھی سمنان میں ہوئی۔ والد کا اسم گرامی محمد ابراہیم تھا جو

---

۵۵ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۲۱، ۳۲

سمنان کے حکمران تھے۔ والدہ مکرمہ کا نام خدیجہ تھا۔ یہ خاتون خواجہ محمد یسوی کی دختر تھیں۔ نہایت نیک اور عابدہ و زاہدہ تھیں۔ باالالتزام تہجد کی نماز پڑھتیں۔ رات کو قیام کرتیں اور دن کو روزہ رکھتیں۔

سلطان محمد ابراہیم کے ہاں کوئی بیٹا نہ تھا، تین لڑکیاں پیدا ہوئیں تو اس نواح کے ایک مجذوب سے جن کا نام ابراہیم تھا، اولادِ نرینہ کے لیے دعا کی درخواست کی۔ انھوں نے اللہ کے حضور دعا کی، جس کے نتیجے میں ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام اشرف رکھا۔ یہ بالکل ابتدائی عمر میں مکتب میں داخل کر دیے گئے۔ حافظہ نہایت تیز تھا۔ ابھی سات ہی سال کو پہنچے تھے کہ قرأتِ سبعہ کے ساتھ قرآن مجید حفظ کر لیا اور چودہ سال کی عمر میں معقولات و منقولات کی تمام کتابیں پڑھ لیں، جس کی وجہ سے پورے عراق میں مشہور ہو گئے۔

والد کی وفات اور تخت نشینی

انیس سال کے تھے کہ والد بزرگوار سید محمد ابراہیم وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد حکومتِ سمنان کی بھاگ ڈور ہاتھ میں لی اور مہماتِ ملکی میں مشغول ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ اس دور کے عظیم بزرگ شیخ رکن الدین علاء الدولہ سمنانی اور دیگر علما و مشائخ سے تصوف و طریقت اور دیگر علوم کی تحصیل میں بھی منہمک رہے۔ عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ان کا دورِ حکومت انتہائی عدل و انصاف کا دور تھا۔ لطائف اشرفی کے مصنف نے اس کا ذکر ان اشعار میں کیا ہے

چوں اورنگِ سمنان بدو تازہ گشت | جہاں از عدالت پر آوازہ گشت
بدوران عدلش ہمہ روزگار | گلستان شدہ عدل آورد بار
زبسے عدل و انصاف آں دادگر | کہ بر میش گرگے نہ بندد کمر
بشاہین نیارد بال بازی کلنگ | کبوتر موئے باز آورد چنگ
اگر فیل بر فرق موری گزر | کند مور بر فیل آرد نظر
کہ این دورِ سلطان اشرف بود | جہاں ظلم تو بر سر من فرود[۵۴]

---

۵۴ لطائف اشرفی، ج ۲، ص ۹۱

ترکِ حکومت

علاوہ ازیں وہ اپنے زمانۂ حکومت میں فرائض وسنن اور نوافل کی ادائیگی بھی باقاعدگی سے کرتے اور اوراد و وظائف میں مشغول رہتے۔ ایک رات خواب میں دیکھا کہ حضرت خضر سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے کہا کہ اگر سلطنتِ الٰہی طلب کرنا چاہتے ہو تو اس دنیوی سلطنت کو ترک کردو اور دیارِ ہند کا رخ کرو۔ صبح ہوئی تو والدہ محترمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، خواب بیان کیا اور حکومت سے دست بردار ہو کر عازمِ ہند ہونے کی تمنا ظاہر کی۔ والدہ نے نہایت شفقت سے فرمایا۔ تمھاری ولادت سے قبل میرے والد نے بتایا تھا کہ میرے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوگا، جس کے نورِ ہدایت سے تمام عالم منوّر ہوگا۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ وقت آپہنچا۔ جاؤ رختِ سفر باندھو۔ اللہ تم کو یہ سفر مبارک کرے[۵۰]

عزمِ ہند

والدہ کی اجازت سے بہت خوش ہوئے۔ زمامِ حکومت اپنے بھائی سلطان محمد کے ہاتھ میں دی اور عازمِ ہند ہو گئے۔

سمنان سے روانہ ہوئے تو بارہ ہزار سپاہی اور ترکچی تین منزل تک الوداع کہنے کے لیے ساتھ گئے۔ وہاں سے ماوراء النہر ہوتے ہوئے بخارا پہنچے اور بخارا سے سمرقند گئے۔ سمرقند تک سواری میں کچھ گھوڑے ساتھ تھے۔ لیکن ان گھوڑوں کے ساتھ فقرا کی مجلس میں گئے تو ان کو راحت کے بجائے رسوائی کا باعث سمجھا اور یہ تمام گھوڑے فقرا کو دے دیے۔

اوچ میں داخلہ

سمرقند سے برصغیر پاک و ہند کی طرف روانہ ہوئے اور اس کی سرحدوں کو عبور کر کے اوچ میں داخل ہوئے۔ اوچ کو اس زمانے میں طریقت وتصوف اور علومِ

---

۵۰ لطائف اشرفی ج ۲، ص ۹۲، ۹۳

ظاہری و باطنی کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ شیخ سید جلال الدین حسین بن احمد بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت (متوفی ۱۰ ذی الحجہ ۷۸۵ھ) کی بساطِ طریقت آراستہ تھی۔ سید اشرف ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شیخ کی نظر ان پر پڑی تو فرمایا۔

بعد از مدتے بوئے طالب صادق بدماغ رسیدہ، بعد از روزگارے نسیم از گلزار سیادت وزیدہ۔ فرزند بسیار مردانہ برآمدہ، مبارک باد زود قدم در راہ نہ کہ برادرم علاء الدین منتظر مقدم شریف ہستند زینہار در راہ جائے نمانی[۵۸]

ایک مدت کے بعد طالب صادق کی خوشبو دماغ میں پہنچی ہے اور ایک عرصے کے بعد گلزارِ سیادت کی نسیم جاں افزا کے دلنواز جھونکے نصیب ہوئے ہیں۔ فرزندا! تم بہت ہی مردانہ انداز سے آئے ہو۔ میری طرف سے ہدیۂ تبریک قبول کرو۔ اس راہِ سعادت افروز میں جلد جلد قدم اٹھاؤ کہ برادرم علاء الدین تمہاری تشریف آوری کے منتظر ہیں۔ راستے میں ہرگز کہیں نہ ٹھہرنا۔

دہلی اور بہار کا قصد

مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے مستفیض ہو کر عازم دہلی ہوئے۔ وہاں کے مشائخ و علما سے متمتع ہو چکے تو بہار کا قصد کیا۔ قصبہ بہار میں عین اس وقت پہنچے جب حضرت شرف الدین احمد یحییٰ منیری (متوفی ۶ شوال ۷۸۲ھ) کا جنازہ رکھا ہوا تھا۔ شیخ منیری نے وصیت کی تھی کہ ان کی نماز جنازہ وہی شخص پڑھائے جو صحیح النسب سید ہو، تارکِ سلطنت ہو اور سات قرأتوں کا قاری ہو۔ یہ تمام شرطیں سید اشرف سمنانی میں پائی جاتی تھیں، لہٰذا حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کی نماز جنازہ پڑھانے کی سعادت ان ہی کے حصّے میں آئی۔

ورودِ بنگال اور شیخ احمد بن عمر سے استفاضہ

وہاں سے بنگال روانہ ہوئے۔ سرزمین بنگال میں اس زمانے میں شیخ احمد بن

---

۵۸ لطائف اشرفی، ج ۲، ص ۹۴

عمر بن اسعد لاہوری پنڈوی کا دینی اور روحانی فیض جاری تھا۔ یہ بزرگ شیخ علاء الدین اور نور الدین کے القاب سے ملقب تھے۔ بلند مرتبہ کے عالم اور صوفی تھے۔ ان کے خاندان کے اکثر افراد بڑے بڑے شاہی مناصب پر فائز تھے، جن میں سے بعض لوگ مسندِ وزارت پر متمکن تھے اور بعض دیگر اونچے عہدوں پر سرفراز۔ ! مگر خود شیخ احمد بن عمر لاہوری پنڈوی نے درویشانہ وفقیرانہ انداز اختیار کر لیا تھا اور تصوف وطریقت کی راہوں پر گام فرسا ہو گئے تھے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ جلیل القدر عالم دین بھی تھے، اس لیے جہاں لوگ حصولِ تصوف کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، وہاں ظاہری علوم کی تحصیل کا جذبہ اور تحقیق مسائل دینیہ کا داعیہ بھی انھیں ان کے بابِ عالی پر دستک کے لیے مجبور کرتا تھا۔ انتہا درجے کے سخی اور مہمان نواز بھی تھے۔ کہتے ہیں ان کی خانقاہ کے مصارف اتنے زیادہ تھے کہ بڑے بڑے امراو وزرا اس پر تعجب کا اظہار کرتے۔ سید اشرف سمنانی کی آمد سے پہلے انھوں نے اپنے عقیدت مندوں سے کہا تھا

آں کسے کہ از دو سال انتظارِ او می کشیدہ ایم، وطریقِ مواصلت اوی دیدہ ایم، امروز فردا می رسد[۵۹]

جس شخص کے آنے کا ہم دو سال سے انتظار کر رہے ہیں اور اس کی راہ تک رہے ہیں، وہ آج کل میں پہنچنے والا ہے۔

سید اشرف، جب پنڈوہ کے قریب پہنچے تو دوپہر کا وقت تھا اور شیخ احمد علاء الدین قیلولہ کر رہے تھے۔ یکایک اٹھے، آنکھیں کھولیں اور فرمایا:

بوئے یار می آید

یار کی خوشبو آرہی ہے۔

یہ کہہ کر تیزی سے شہر سے باہر نکلے۔ معتقد اور ارادت مند بھی بھاری تعداد

---

[۵۹] لطائف اشرفی، ج ۲، ص ۹۵

میں ساتھ ہوئیے۔ شہر سے ایک کوس کے فاصلے پر سیّد اشرف کا استقبال کیا۔ سیّد اشرف کی نظر حضرت شیخ پر پڑی تو دوڑے دوڑے اور ان کے قدموں پر جاگرے۔ شیخ نے محبت سے اٹھایا اور گلے سے لگایا۔ پھر فرمایا:

چہ خوش باشد کہ بعد از انتظارے   بامید رسد امید وارے

خانقاہ میں لائے اور بڑی تعظیم سے پیش آئے۔ بیعت لی اور "جہاں گیر" کا لقب عطا کیا۔ مرشد کی طرف سے اس لقب پر سیّد اشرف فرماتے ہیں:

مرا از حضرت پیر جہاں بخش   خطاب آمد کہ اے اشرف جہاں گیر
کنوں گیرم جہان معنوی را   کہ فرمان آمد از شاہم جہاں گیر

لطائف اشرفی میں منقول ہے کہ ایک دفعہ سیّد اشرف جہاں گیر کمر باندھ رہے تھے۔ ادھر سے شیخ علاء الدین بھی تشریف لائے اور پوچھا۔ کیا کر رہے ہو؟ جواب دیا۔

میان برائے خدمت می بندم۔

خدمت خلق کے لیے کمر کس رہا ہوں۔

فرمایا۔

اگر می بندی محکم بہ بند کہ ہیچ درمیان نداری۔

اگر کمر کس رہے ہو تو مضبوط کسو تاکہ درمیان میں کوئی چیز باقی نہ رہے۔

عرض کیا

آرزوئے نفس از میان بیرون کشیدہ ام تا زندہ ام۔

اپنے اندر سے نفس کی خواہشات کو دور کر دیا ہے اور جب تک زندہ رہوں گا انہیں دور ہی رکھوں گا۔

شیخ نے یہ جواب سنا تو فرمایا۔

مبارک باد۔

بارہ سال شیخ احمد علاء الدین کی خدمت میں رہے اور اس اثنا میں باطنی و روحانی فیوض سے خوب خوب متمتع ہوئے۔

جون پور کا قصد اور ضلع اعظم گڑھ میں ورود

اب مرشد نے اپنے اس عظیم المرتبت خلیفہ کو علاقہ جون پور کی طرف تشریف لے جانے کی ہدایت کی۔ وہاں سے رخصت ہوئے تو بہت سے لوگ ہم سفر تھے اور اونٹ اور گھوڑے بھی خاصی تعداد میں ساتھ تھے۔ بعض لوگ درویشی کے ساتھ ان کی یہ شان امارت دیکھ کر معترض ہوئے تو فرمایا۔

ہیچ طویلہ در گل نزدہ ام، نہ در دل ۱۲۵

کوئی طویلہ نہ سطح زمین پر تعمیر کرتا ہوں، نہ دل کی گہرائیوں میں۔!

اسی اثنا میں ضلع اعظم گڑھ (یو۔ پی، ہندوستان) کے ایک قصبے محمد آباد گہنہ میں پہنچے۔ وہاں کے علما و فضلا ملنے کے لیے آئے تو دوران گفتگو میں بات چیت کا رخ خلفائے اربعہ رضوان اللہ علیہم کی طرف پھر گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ سید اشرف جہاں گیر نے خلفائے راشدین کی مدح و توصیف میں ایک رسالہ تحریر کیا تھا۔ اس میں انھوں نے دیگر خلفا کی بہ نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے زیادہ مدحیہ الفاظ استعمال کیے تھے۔ علما نے اس رسالہ کو موضوع بحث بنالیا اور ان پر شیعیت کا الزام عائد کیا۔ دوسرے دن جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد علما کا محضر ہوا، جس میں انھوں نے سید اشرف کے خلاف فتویٰ صادر کر دیا۔ لیکن محمد آباد گہنہ کے مفتی اور سب سے بڑے عالم دین مولانا سید خاں نے علما کے اس انداز کلام اور فتویٰ سے اختلاف کیا اور سید اشرف کی حمایت کی اور کہا۔ شیخ اشرف سید ہیں۔ اگر انھوں نے اپنے جد امجد کی شان میں زیادہ مدحیہ کلمات استعمال کیے ہیں تو اس میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟۔ مولانا سید خاں کے الفاظ کا یہ اثر ہوا کہ تمام علما خاموش ہو گئے اور سید اشرف نے مولانا کو دعائیں دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز میں قصبہ کے دیگر علما بھی ان کی نیکی اور تدین کا اعتراف کرنے لگے۔

---

۱۲۵ لطائف اشرفی، ج ۲، ص ۱۰۱

جون پور میں آمد اور قیام

محمد آباد گمنہ سے ظفر آباد پہنچے اور وہاں سے جون پور گئے۔ جون پور میں ایک مسجد میں قیام کیا، جہاں بہت سے لوگ شرف و زیارت اور حصول فیض کی غرض سے حاضر خدمت ہوئے۔

قاضی شہاب الدین سے ملاقات

ان کی آمد کی اطلاع قاضی شہاب الدین دولت آبادی کو ہوئی تو وہ بھی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ قاضی ممدوح کے حالات گزشتہ صفحات میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ ان کا اصل وطن تو غزنی تھا لیکن ان کے آبا و اجداد ہندوستان میں آ گئے تھے۔ انھوں نے دولت آباد میں پرورش پائی۔ اس دور کے چوٹی کے علما سے تعلیم حاصل کی اور علمی و عملی اعتبار سے شہرت و ناموری کی بلندیوں پر پہنچے۔ یہ متعدد علمی و فنی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

قاضی شہاب الدین ان سے ملنے آئے تو بہت متاثر ہوئے اور قلبی تعلق یہاں تک پہنچا کہ کبھی روزانہ اور کبھی دوسرے یا تیسرے روز ضرور آتے۔ سیّد اشرف جہاں گیر بھی ان کے علم و فضل کی فراوانی سے اثر پذیر ہوئے۔ ان کی معروف تصنیف "ارشاد" جو علم نحو سے متعلق ہے، سیّد اشرف کی نظر سے گزری تو تعجب و حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی اور کتاب کے متعلق فرمایا۔

اینکہ می گویند کہ سحر از ہندوستان راست آمدہ، غالباً ایں راست سحر بودہ است

یہ جو کہا جاتا ہے کہ جادو ہندوستان سے آیا ہے، غالباً یہ رائے صحیح ہے

روحانی فیوض

قاضی شہاب الدین نے ان سے باطنی اور روحانی فیوض حاصل کیے اور اس مرتبۂ بلند پر فائز ہوئے کہ شیخ اشرف نے ان کو خرقۂ خلافت پہنایا اور ملک العلما

---

۵۶۱ لطائف اشرفی، ج ۲، ص ۱۰۶

کا خطاب عطا کیا۔ لطائف اشرفی کے مصنف رقم طراز ہیں۔

حضرت قاضی خدمتے شائستہ و ملازمتے بایستہ شد و الباس خرقہ کردند و بخطاب ملک العلما مخاطب کردند...... ۲۱ھ

حضرت قاضی شہاب الدین دولت آبادی شیخ اشرف جہاں گیر کی خدمت و ملازمت میں رہے۔ شیخ نے خرقۂ خلافت ان کے زیب تن کیا اور ان کو ملک العلما کے خطاب سے سرفراز فرمایا......

سلطان ابراہیم شرقی کی عقیدت

اس زمانے میں جون پور کے اورنگ سلطنت پر ابراہیم شرقی متمکن تھا، جو بڑا نیک، علما و فضلا کا قدر دان اور علم پرور حکمران تھا۔ ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تو وہ انتہائی تکریم کرتا تھا اور دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ان کی رائے کو ترجیح دیتا تھا۔ ملک العلما نے اس سے شیخ اشرف سمنانی کے علم و فضل اور زہد و اتقا کا ذکر کیا تو بہت خوش ہوا اور اپنے امرا و وزرا اور اعوان و خوانین کی معیت میں کئی بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کی تفصیلات لطائف اشرفی میں مرقوم ہیں۔ اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

قاضی شہاب الدین نے شیخ اشرف سمنانی سے عرض کیا کہ آج سلطان شرف ملاقات سے مشرف ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن اس خادم کی خواہش ہوئی کہ آج یہ فقیر خدمت میں حاضر ہو۔ تو کل پھر سلطان کے ساتھ قدم بوسی کا شرف حاصل کرے گا۔ شیخ اشرف سمنانی نے فرمایا۔ اس فقیر کے نزدیک تم سلطان سے بہت بہتر ہو۔ اگر سلطان آتے ہیں تو آئیں دو وہ عالم ہیں۔ جب قاضی شہاب الدین کو رخصت کیا تو ان کے بارے میں معتقدین سے فرمایا کہ جس قدر اس شخص کو فضیلت حاصل ہے ہندوستان میں کسی دوسرے شخص کو کم حاصل ہے۔ دوسرے دن شیخ اشرف وظائف

۲۱ھ لطائف اشرفی، ج ۲، ص ۱۴۶۔

میں مشغول تھے کہ معلوم ہوا کہ سلطان ابراہیم خوانین اور دوسرے لوگوں کے ساتھ آرہا ہے جب یہ جماعت مسجد کے دروازے پر پہنچی تو حضرت قاضی نے سلطان سے عرض کی کہ اتنے ازدحام کے ساتھ حضرت سید کی ملاقات کے لیے جانا مناسب نہیں، ان کو تکلیف ہوگی۔ سلطان نیچے اتر آیا اور اپنی جماعت سے بیس اصحاب فضیلت اور اہل فراست کو منتخب کر کے حاضر خدمت ہوا اور حد سے زیادہ ادب و احترام سے پیش آیا۔ اس نے قلعہ جناد کی فتح کے لیے ایک بہت بڑا لشکر بھیج رکھا تھا، جس کے لیے وہ متردد تھا۔ اس نے حسبِ حال سید سمنانی کے سامنے یہ اشعار پڑھے:

دلی کان انور است از جام جمشید — روان روشن از خورشید باشد
چہ حاجت عرض کردن بر ضمیرش — کسے کو را یقین امید باشد

شیخ نے فرمایا:

اگر بہ یقین شد قدمت استوار — گرد ز دریا نم وز آتش برآر

سلطان رخصت ہونے لگا تو شیخ نے ایک مسند عطا کی، جس سے وہ بہت خوش ہوا۔ دربار میں پہنچے تو کہا۔

چہ سید یست عالی جناب و مقاصد مآب۔ الحمد للہ کہ در ہندوستان چنین مردم درآمدہ اند"

یہ سید کس قدر عالی جناب و مقاصد مآب ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس مرتبے کے لوگ بھی ہندوستان میں آئے ہیں۔

قلعہ فتح ہو چکا تو تین روز کے بعد چند آدمیوں کے ساتھ سلطان پھر حاضر خدمت ہوا۔ روٹی کا ٹکڑا اور شربت ساتھ لایا۔ لوگوں نے قلعہ کی فتح پر شیخ کو مبارک باد دی مگر شیخ نے کہا۔ سلطان کو مبارک باد دو کہ اس نے بند دروازے کو کھولا ہے۔ اب سلطان کی عقیدت بہت بڑھ چکی تھی۔ عرض کیا۔ یہ بندۂ عاجز تو جناب کے ہاتھ پر بیعت ہو چکا، بندہ زادے بھی حلقہ بیعت میں داخل ہوں گے۔ چنانچہ اسی وقت تین شہزادے شرف بیعت سے مشرف ہوئے۔ سلطان نے بہت نذرانے دیئے

کی کوشش کی لیکن شیخ نے قبول نہیں کیے۔ پھر اس نے ان سے وہیں مستقل طور پر سکونت پذیر رہنے کی درخواست کی۔ فرمایا۔ تمہاری سلطنت کی حدود سے باہر نہ جاؤں گا۔ اس جواب سے سلطان بہت خوش ہوا۔ وہ دو مہینے وہاں مقیم رہے۔ چھوٹے بڑے ہر قسم کے لوگ۔ ان کی بیعت سے سعادت اندوز ہوئے۔[۶۳]

اشاعتِ اسلام

جون پور سے روانہ ہو کر وہ گرد و نواح کے دیگر مقامات میں گئے اور لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کی۔ ایک مقام پر ان کا مقابلہ ایک ہندو جوگی سے ہوا۔ اس جوگی کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ ہوا میں اڑ سکتا ہے۔ مگر شیخ سے گفتگو ہوئی تو اتنا متاثر اور مرعوب ہوا کہ اس قسم کے تمام غلط دعووں سے تائب ہو گیا۔ اپنی مذہبی کتابیں جلا ڈالیں، اس کے پانچ ہزار چیلے تھے، ان سب کے ساتھ مسلمان ہو گیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اس جوگی نے بابا کمال پنڈت کے نام سے شہرت پائی۔ بعض تذکروں میں مرقوم ہے کہ جوگی سے مقابلہ کچھوچھہ کے مقام پر ہوا اور اس کی مڑھی میں خانقاہ بنوائی گئی۔[۶۴]

ایک مرتبہ بنارس گئے اور وہاں کے بت خانوں کے پجاریوں سے مناظرے کیے دونوں طرف سے کرامات اور خرقِ عادات کا اظہار ہوا۔ آخر میں وہاں کے ایک ہزار ہندو، شیخ کے قول و عمل سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔[۶۵]

ان ہی دنوں اجودھیا میں پہنچے اور وہاں کے ملوک و امرا نے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کا شرف حاصل کیا۔

ردولی میں

اثنائے سفر اور ضمنِ تبلیغ میں ردولی بھی گئے۔ وہاں شیخ صفی الدین اور شیخ نصیر الدین

---

۶۳ لطائف اشرفی، ج ۲، ص ۱۰۵، ۱۰۶

۶۴ بزم صوفیہ، ص ۴۵۱

۶۵ ایضاً ص ۴۵۸ بحوالہ لطائف اشرفی، ج ۱، ص ۲۱۲۔

سے ملاقات ہوئی جن کا شمار اس دَور کے عظیم المرتبت علما میں ہوتا تھا۔ یہ دونوں حضرات شیخ سے بہت فیض یاب ہوئے۔ شیخ صفی الدین کا درجہ تو علوم وفنون میں بہت بلند تھا۔ خود شیخ ان کی فراوانیٔ علم سے متاثر ہوئے۔ فرماتے ہیں۔

در بلادِ ہند کسے را کہ بفنون درخشندہ غرائب وشیون عجائب پیراستہ دیدم، وی بود۔[۶۶]

بلادِ ہند میں اگر میں نے کسی کو مختلف اور متنوع علوم وفنون میں پیراستہ اور آراستہ دیکھا ہے تو وہ (شیخ صفی الدین ردولوی) ہیں۔

قصبہ جائس میں

اسی دوران میں وہ جائس کے مقام پر پہنچے جو اس نواح میں بارونق اور خاصی آبادی پر مشتمل ایک قصبہ تھا۔ وہاں کے تین ہزار آدمی ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ قصبے میں ایک معروف عالم دین بھی فروکش تھے جن کا نام مولانا غلام الدین تھا۔ یہ علوم کی مختلف شاخوں پر عبور رکھتے تھے اور فقہ میں خاص طور پر ان کو درک حاصل تھا۔ یہ بھی شیخ اشرف جہاں گیر سے بیعت ہوئے اور خلیفہ مقرر کیے گئے۔ ان کے علاوہ ایک اور بزرگ تھے، جو شیخ کمال کے نام سے معروف تھے۔ ان کو بھی سید اشرف جہاں گیر کی طرف سے خلعتِ خلافت عطا کی گئی۔ یہ قصبہ جائس کے لوگوں کو روحانی تعلیم دیتے اور ان کی باطنی تربیت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے یہاں دعوت تھی اور دعوت کا انتظام قصبے کے کچھ لوگوں کے سپرد تھا۔ مگر عین وقت پر شیخ کمال کو معلوم ہوا کہ دعوت کا انتظام نہیں ہو سکا۔ شیخ کمال نے نہایت ذہنی کوفت میں اور شدید غصے میں آکر بد دعا دی کہ یہ لوگ جل کر خاک ہو جائیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اسی روز قصبے میں آگ بھڑک اٹھی اور تقریباً چار ہزار آدمی جل کر ہلاک ہو گئے۔ شیخ کمال اس حادثۂ جان گاہ سے بہت مغموم ہوئے اور سخت

---

[۶۶] لطائف اشرفی، ج ۱، ص ۴۰۴

ندامت کا احساس ہوا۔ مرشد یعنی سید اشرف جہاں گیر کے پاس کچھوچھہ پہنچے (جس کا نام اب روح آباد تھا) لیکن انھوں نے یہ کہہ کر ملنے سے انکار کر دیا کہ وہ میرے فرزندوں کو ندر آتش کر کے اور خانماں برباد کر کے مجھ سے کیا ملنے آئے ہیں۔ ایک عرصہ تک معتوب رہے مگر مرشد کے آستانے سے علیحدہ نہیں ہوئے۔ بالآخر بعض لوگوں کی سفارش پر ایک طشت میں ہزار چنگاریوں کی راکھ سر پر رکھ کر سید اشرف جہاں گیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تقصیر کی معافی چاہی۔ انھوں نے یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ تمھارا ایمان تو سلامت رہے گا لیکن تم اور تمھاری اولاد پریشان رہو گے[۶۷]

شیخ خیر الدین اور قاضی محمد سدھوری سے ملاقات

اب حضرت سید اس علاقے کے ایک مقام سدھورہ پہنچے جو معروف قصبہ تھا۔ اس قصبے میں شیخ خیر الدین اور قاضی محمد سدھوری دو مشہور علمائے دین اقامت گزیں تھے۔ انھوں نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ شیخ خیر الدین کا شمار اس عصر کے جید علما میں ہوتا تھا۔ ان کو فقہ اور اصول فقہ کے بعض مسائل کے بارے میں کچھ الجھن پیدا ہوئی تو ہم عصر علما کی طرف رجوع کیا اور ان سے چند سوالات کیے مگر کسی سے تسلی بخش جواب نہ پایا۔ پھر اس نواح میں شیخ اشرف جہاں گیر تشریف لائے تو ان سے ملاقات ہوئی اور ان سے ان سوالات کی تشریح کے لیے مستدعی ہوئے۔ شیخ نے اس انداز سے ان کی تشریح کی کہ شیخ خیر الدین پوری طرح مطمئن ہو گئے اور اسی وقت ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ بیعت کرنے والوں میں قاضی محمد سدھوری بھی تھے جو اپنے وقت کے بہت بڑے عالم دین تھے۔ لطائف اشرفی میں ان کے علم و فضل کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

قاضی محمد سدھوری بفنونِ علوم غریبہ و شیون معلوم عجیبہ پیراستہ بودند خصوص در علوم اصول مشار الیہ بودند[۶۸]

---

۶۷ بزم صوفیہ، ص ۴۷۵، بحوالہ لطائف اشرفی ج ۱، ص ۴۰۶۔

۶۸ لطائف اشرفی، ج ۱، ص ۴۰۹۔

قاضی محمد سدھوری یوں تو علوم کے تمام گوشوں اور فنونِ مختلفہ کے تمام پہلوؤں سے مزین تھے مگر اصولِ فقہ میں بالخصوص ان کو جو امتیاز و درک حاصل تھا، اس میں ان کی طرف اشارہ کیا جاتا تھا۔

ارباب حکومت سے تعلقات

شیخ اشرف جہاں گیر چوں کہ خود حکمراں رہ چکے تھے اور حکومت ان کو وراثت میں ملی تھی اس لیے اربابِ حکومت اور اصحابِ ثروت کے عادات و اطوار سے خوب آگاہ تھے اور ان کی نفسیات کے بارے میں پورا علم رکھتے تھے۔ لہذا ان سے اتنا ہی تعلق رکھتے تھے جتنا کہ ان کی اصلاح کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ ان سے کسی قسم کا لالچ ان کے ذہن میں نہ تھا۔ اگر مال و دولت کی حرص میں گرفتار ہوتے تو خود ہی اس کو کیوں ترک کرتے اور حکومت کو خیر باد کہہ کر فقر و درویشی کی راہوں پر قدم زن ہوتے۔

ان کے حلقۂ ارادت میں والی جون پور سلطان ابراہیم شرقی، والی اودھ نواب سیف خاں اور ان کے علاوہ بہت سے امراو وزرا اور خوانین شامل تھے، مگر کسی سے کبھی قسم کی دنیوی عزو جاہ کے متمنی نہیں ہوئے۔ ایک مرتبہ نواب سیف خاں نے اودھ کا ایک قریہ پیش کرنے کی درخواست کی، جس کی آمدنی اس دور کے مروجہ سکے کے لحاظ سے ایک لاکھ تنکہ تھی، مگر لینے سے انکار کر دیا اور اس کو قبول کرنا درویشی کی شانِ قناعت کے منافی سمجھا۔

چار نقصان دہ چیزیں

حکمرانوں سے زیادہ تعلق و ربط کبھی نہیں رکھا۔ البتہ ان کی عادات پر ہمیشہ نظر رہی اور کوشاں رہے کہ ان کی ظاہری اور باطنی حالت درست ہو اور وہ چار چیزوں سے بالخصوص دامن کشاں رہیں، جو ان کے لیے اخلاقی اور روحانی طور پر نہایت نقصان رساں ہیں۔ وہ چار چیزیں یہ ہیں۔

۱۔ سلاطین کا لذائذ دنیا میں مستغرق ہو جانا۔

۲۔ اپنے مقربین و مصاحبین سے بدخلقی کے ساتھ پیش آنا۔

۳۔ سزا دینے میں زیادتی کرنا۔

۴۔ رعیت پر ظلم کرنا۔[۶۹]

بادشاہوں اور حکمرانوں کے لیے نصیحت

شیخ اشرف جہاں گیر نے بادشاہوں اور حکمرانوں کو بڑی نصیحتیں اور ہدایتیں کی ہیں۔ فرماتے ہیں۔ بادشاہ اپنے اوقات اس طرح ترتیب دیں کہ فجر کی نماز کے بعد اشراق تک وظیفہ پڑھیں۔ پھر علماء و صلحا کی مجلس میں بیٹھیں اور چاشت کے وقت تک ان سے عدل و انصاف کے متعلق آیاتِ قرآنی کے مطالب پوچھیں۔ اس مجلس میں اپنے وزراء و ندما کو بھی شریک کریں۔ لوگ جو معروضات پیش کریں، ان کا مناسب جواب دیا جائے، حسبِ حال کاروائی کی جائے اور ہر شخص کے مدعا کو پورا کیا جائے۔ اس کے بعد دربارِ عام منعقد ہو جس میں رعایا اور مسلمانوں کے قضایا اور دعاوی پیش ہوں اور شریعت کے مطابق انصاف کے ساتھ فیصلہ ہو۔ مشائخ اور اصحابِ سلوک کے معروضات کو جہاں تک ممکن ہو سکے، کسی کے توسط سے سنا جائے۔ سادات، قضات اور مشائخ کی درخواستوں کو بادشاہ اور حکمران تک صدر پہنچائے اور اس گروہ کا صدر کسی ایسے شخص کو مقرر کیا جائے جو دیندار اور ہمدرد ہو، بلکہ ایسے شخص کو صوفی مشرب بھی ہونا چاہیے۔ وزیر میں یہ خصوصیت ہونی چاہیے کہ وہ تمام علوم و فنون سے آراستہ بھی ہو اور متدین اور نیک بھی ہو۔ وکالت کا منصب کسی ایسے شخص کے سپرد کرنا چاہیے جو پسندیدہ اخلاق کا حامل، نہایت عقلمند، سریع الفہم اور حاضر جواب ہو۔ اس قسم کے ہر شخص کو کوئی نہ کوئی مناسب منصب دینا چاہیے۔ تمام کاموں سے فارغ ہو کر قیلولہ کے وقت آرام کے لیے چلے جائیں۔ قیلولہ سے فارغ ہو کر نماز پڑھیں اور کبھی نماز ترک نہ کریں۔ ظہر کی نماز کے بعد جس قدر ہو سکے

۶۹؎ بزمِ صوفیہ، ص ۴۵۶۔ بحوالہ لطائف اشرفی، ج ۱، ص ۱۶۶۔

قرآن مجید کی تلاوت کریں۔ خصوصاً سورہ قد سمع اللہ (سورہ مجادلہ) کی مواظبت کریں۔ کیونکہ سلاطین اس سورۃ کی مواظبت کرتے آئے ہیں۔ سلطان محمود (غزنوی) انار اللہ برہانہ، برابر یہ سورۃ پڑھا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ مجھ کو دولت و شوکت اسی سورۃ کی بدولت نصیب ہوئی۔ حضرت (سلطان) ابراہیم شاہ (شرقی) بھی ایسا ہی فرماتے تھے۔ خود میں نے جب سلطنت چھوڑی تو پہلی چیز جو میں نے اپنے برادر عزیز محمد شاہ سے کہی، وہ یہ تھی کہ اس سورۃ کی برابر تلاوت کریں۔ کوئی کام شریعت کے خلاف انجام نہ دیں اور عدل و انصاف کے اصول میں ایک نقطہ سے بھی انحراف نہ کریں تاکہ سلطنت میں خلل واقع نہ ہو۔[۷۵]

ایک موقع پر ارکانِ دولت اور اعضائے سلطنت کے بارے میں فرمایا۔

تمام ارکانِ دولت اور اعوانِ مملکت الگ الگ عضو، الگ الگ حاسہ یا قوت کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر مستوفی، مشرب، ناظر، عارض، طغرائی، منشی، دبیر، حاجب، خازن، استاذالدار اور دوسرے عہدہ دار حواس خمسہ اور قوائے بشری مثلاً آنکھ، کان، ناک، زبان، لمس، فکر، وہم، حافظہ، حسِ مشترک کے مانند ہیں۔ امرائے سلطنت اپنی قوت، شوکت اور ہمت وغیرہ کے ساتھ اعضائے رئیسہ ہیں اور ادنیٰ درجے کے امرا ہاتھ، بازو، پنڈلی اور پاؤں کی مثل ہیں۔ حاشیہ نشین، قوم اور عام رعایا وغیرہ اپنے مدارج کے مطابق اس طرح ہیں، جس طرح کہ رگ، پٹھے اور اعصاب وغیرہ۔ جس طرح ایک انسان اپنے ہر عضو کا محتاج ہے اور اگر اس کا ایک عضو نہ ہو، یا ناقص ہو تو اس کا جسمانی نظام ناقص اور ادھورا رہتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جسم کا ہر عضو صحیح ہو اور اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک کام کرے۔ اسی طرح ایک بادشاہ اور حکمران کو چاہیے کہ ارکانِ دولت اور اصحابِ مناصب کو ان کی اہلیت و استعداد کے مطابق ان کی دیانت اور نیکی

۷۵؎ بزم صوفیہ، ص ۴۵۶ و ۴۵۷۔ بحوالہ لطائف اشرفی، ج ۲، ص ۱۶۷، ۱۶۸

سیرت کو معلوم کرکے اور اچھی طرح پرکھ کر ان کو مملکت کے مختلف حصوں میں مقرر کرے اور انھیں مکمل اختیار دے تاکہ وہ اپنے اپنے مفوضہ فرائض اور مقررہ امور کو کامل شرائط کے ساتھ ملک کے مصالح اور سلطنت کی بہبودی کے مطابق انجام دیں اور بادشاہ ان کے کاموں سے پوری طرح باخبر رہے اور ان کے بغیر امورِ مملکت کی انجام دہی میں نقص محسوس کرے۔[۱۷۵]

سیاحت

شیخ اشرف جہاں گیر بہت بڑے سیاح بھی تھے۔ جون پور سے رخت سفر باندھ کر انھوں نے مدینہ منورہ کی زیارت بھی کی۔ روم، بیت المقدس، شام، دمشق، عراق، ایران، بغداد وغیرہ ممالک و بلاد کا رخ بھی کیا۔ اپنے اصل وطن سمنان بھی گئے۔ غزنی، کابل، قندھار، ترکستان، بخارا، کربلا، نجف اور مشہد وغیرہ بھی گئے۔ برصغیر پاک و ہند کے بھی بہت سے علاقوں اور شہروں میں گھومے پھرے اور اثنائے سفر میں بے شمار علما و فقہا، زہاد و عباد اور اولیا و صلحا سے ملاقات کی۔ دوران سفر میں شہد گئے تو امیر تیمور بھی وہاں موجود تھا۔ وہ ان سے بہت ہی عقیدت و احترام سے ملا۔

تصنیفات

وہ علوم و فنون کی مختلف اصناف پر گہری نظر رکھتے تھے اور محض عالم ہی نہ تھے، مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ الاشرفیہ :

۲۔ مختصر فی النحو : یہ کتاب علم نحو سے متعلق ہے۔

۳۔ تعلیقات علی ہدایۃ الفقہ والاصول : اس کا تعلق فقہ اور اصول فقہ سے ہے۔

۴۔ مختصر فی اصول الفقہ : یہ اصول فقہ کے بارے میں ہے۔

---

[۱۷۵] لطائف اشرفی، ج۲، ص ۱۱۴

۵۔ شرح عوارف المعارف : یہ کتاب تصوف کے بارے میں ہے۔
۶۔ شرح فصوص الحکم : اس کا تعلق بھی علم تصوف سے ہے۔
۷۔ قواعد العقائد : یہ علم کلام میں ہے۔
۸۔ اشرف الانساب مختصر ؛
۹۔ بحر الانساب : یہ انساب و سیر کے سلسلے کی تصنیف ہے۔
۱۰۔ بحر الاذکار۔
۱۱۔ فوائد الاشرف و اشرف الفوائد۔
۱۲۔ بشارۃ الذاکرین۔
۱۳۔ تنبیہ الاخوان۔
۱۴۔ حجۃ الذاکرین۔
۱۵۔ الفتاویٰ الاشرفیہ۔
۱۶۔ تفسیر نور بخشیہ : قرآن مجید کی تفسیر ہے۔
۱۷۔ اوراد الاشرفیہ۔
۱۸۔ دیوان شعر : ان کا مجموعہ کلام۔
۱۹۔ مرأۃ الحقائق و کنز الدقائق۔
۲۰۔ رسالہ فی جواز سماع الغناء۔
۲۱۔ بشارۃ المریدین۔
۲۲۔ ارشاد الاخوان۔
۲۳۔ مکتوبات : مؤلف و جامع نظام الدین یمنی۔
۲۴۔ ملفوظات : جو نظام الدین یمنی نے لطائف اشرفیہ میں جمع کیے۔

وفات

ایک سو بیس برس کی عمر پا کر ۲۷ محرم ۸۰۸ھ کو کچھوچھہ میں وفات پائی اور

وہیں دفن کیے گئے۔ "اشرف المومنین" سے مادہ تاریخ نکلتا ہے۔[۲۷۲]

۱۶- شیخ اعظم ثانی لکھنوی

نویں صدی ہجری کے ایک اور عالم دین اور فقیہ شیخ اعظم ثانی بن شیخ ابو البقا بن شیخ موسیٰ بن شیخ ضیاء الدین کرمانی تھے۔ ان کا شمار اپنے وقت کے فحول علما اور جلیل القدر فقہا میں ہوتا تھا۔ ظاہری و باطنی علوم سے بہرہ یاب تھے۔ ان علوم کی تحصیل انھوں نے شیخ ابو الفتح جون پوری (متوفی ۱۳ ربیع الاول ۸۵۸ھ) سے کی۔ یہ شیخ ضیا لکھنوی اور شیخ سعد الدین خیر آبادی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ شیخ سعد اللہ کندوری (متوفی ۲۳ ربیع الثانی ۹۲۸ھ) کے معاصر تھے اور ان سے بدرجہ غایت تعلق خاطر رکھتے تھے۔ کہتے ہیں علم فقہ میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ مسائل فقہیہ سے متعلق زبان کو حرکت دینے تو بڑے مدلل اور واضح الفاظ میں تقریر کرتے۔ علم فقہ کے موضوع پر ان کے کئی رسالے بھی ہیں۔

ان کے پردادا شیخ ضیاء الدین ہلاکو خاں کے عہد میں کرمان سے برصغیر پاک و ہند میں تشریف لائے اور شاہ سمرقندی سے ملاقات کے لیے لکھنو پہنچے اور پھر ان سے اس درجہ محبت پیدا ہوگئی کہ ان ہی کی وجہ سے اس شہر میں متوطن ہوگئے۔

شیخ اعظم اپنے بعد تین بیٹے چھوڑ کر جنت کو سدھارے۔ جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں (۱) شیخ محمد عرف شیخ قاضی۔ (۲) شیخ احمد فیاض اور (۳) شیخ نصیر الدین۔ ان تینوں بزرگوں میں سے ہر ایک کی اولاد لکھنؤ اور دیوہ وغیرہ کے علاقوں میں موجود ہے۔

شیخ اعظم ثانی کی تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔[۲۷۳]

---

[۲۷۲] لطائف اشرفی۔ بزم صوفیہ۔ اخبار الاخیار، ص ۱۶۶ تا ۱۶۸۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۳۲ تا ۳۴

[۲۷۳] تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۳، ۲۴

شیخ اعظم ثانی لکھنوی کے حالات میں اگرچہ یہ مرقوم ہے کہ وہ فقیہ تھے، مسائل فقہ کو بڑے مدلل اور صاف انداز میں بیان کرتے تھے، اور فقہ سے متعلق انھوں نے کچھ رسائل بھی تصنیف کیے مگر ان کی کسی تصنیف کا علم نہ ہو سکا غالباً ابھی تک ان کی طباعت کی نوبت نہیں آئی۔

ب

۱۷۔ قاضی برہان الدین مالوی

قاضی برہان الدین مالوی حنفی المسلک تھے اور اپنے دور کے جیّد عالم اور فقیہ تھے۔ ان میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان کا شمار کبار مشائخ صوفیہ میں ہوتا تھا۔ ہوشنگ شاہ غوری کے عہد میں مالوہ کے دار السلطنت مانڈو میں تشریف لائے۔ چوں کہ علم و فضل اور تصوف و طریقت سے بہرہ یاب تھے اس لیے والی مالوہ ہوشنگ شاہ غوری ان سے بہت متاثر ہوا اور ان کے حلقۂ بیعت داخل ہونے کی سعادت حاصل کی۔ بادشاہ کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ان سے اثر پذیر ہوئے اور انھوں نے وہیں سکونت اختیار کر لی۔ قاضی برہان الدین نے ۸۱۵ھ میں وفات پائی اور یہ وہی سال ہے جس سال کہ ہوشنگ شاہ غوری عازم جاج نگر ہوا تھا[۴۲]۔

۱۸۔ شیخ بڈھن بہرائچی

شیخ بڈھن علوی بہرائچی اپنے وقت کے فقیہ اور مرد صالح تھے۔ شیخ حسام الدین فتح پوری سے تحصیل علم کی جو شیخ عبد المقتدر بن رکن الدین شریحی کندی کے تلمیذ رشید تھے۔ ان ہی سے طریقہ چشتیہ کے مطابق تصوف کی تعلیم حاصل کی، جس کی

---

[۴۲] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۴۲ ۔ گلزار ابرار اور مرأۃ سکندری۔

وجہ سے ان کا شمار اس دور کے مشہور مشائخ میں ہونے لگا۔ تمام طرقِ تصوف کے شناور تھے اور اس کے حصول کے لیے باقاعدہ مختلف صوفیہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ طریقہ مداریہ، طریقہ سہروردیہ اور اکثر طرقِ مشہورہ شیخ اجمل بن امجد حسینی بہرائچی جون پوری سے اخذ کیے۔ شیخ بڈھن سے شیخ محمد بن قاسم نے کسبِ علم اور اخذِ فیض کیا۔

۸ شوال المکرم ۸۸۰ھ کو وفات پائی۔[۷۵]

۱۹- قاضی تاج الدین نحوی

قاضی تاج الدین بلخی نحوی علومِ عربیہ اور علمِ نحو کے عالم اور مشہور فاضل تھے۔ شیخ محمود قریشی عشقی (ریند پوش ہند) کی نسل سے تھے۔ بلخ سے وارد ہند ہوئے اور لکھنوتی میں سکونت اختیار کی۔ یہ وہ عالمِ دین تھے جنھوں نے تمام عمر درس وافادہ میں صرف کر دی۔ ان کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا اور ان سے بے شمار لوگوں نے فیضِ علم حاصل کیا۔ ان کے اخلاف میں سے شیخ منجھن بن عبداللہ بن خیر الدین لکھنوتی کا اسمِ گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔[۷۶]

ان کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔ غالباً یہ کسی کتاب کے مصنف نہ تھے، البتہ بطور مدرس کے ان کا مرتبہ بہت بلند تھا اور علومِ عربیہ اور علمِ نحو کی تدریس میں ان کو بڑی دسترس حاصل تھی۔

۲۰- قاضی تاج الدین ظفر آبادی

قاضی تاج الدین ناصحی اداہمی عمری ظفر آبادی کا شمار اپنے عصر کے نامور فضلا کی

---

۷۵ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۴۳۔ بحوالہ المسالک المساکین

۷۶ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۴۷۔ گلزارِ ابرار، ص ۱۹۷۔

جماعت میں ہوتا ہے۔ یہ فقیہ اور عالم دین تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب مشہور بزرگ شیخ ابراہیم بن ادہم عمری سے ملتا ہے۔ ظفر آباد کی مسندِ قضا پر فائز ہوئے اور وہیں اقامت گزین ہو گئے۔ عمر کا آدھا حصہ درس و افادۂ عام میں گزرا۔ پھر تمام مصروفیتوں سے کنارہ کش ہو کر تصوف و طریقت کی راہ پر گامزن ہو گئے اور شیخ اسد الدین حسینی واسطی سے وابستگی اختیار کر لی اور پوری زندگی زہد و اتقا کی روح پرور فضا میں بسر کر دی۔ قرآن مجید کے حافظ تھے اور اس درجہ پُراثر اور دردناک لہجے میں تلاوت کرتے کہ لوگوں کے دل کھینچ لیتے تھے۔

۸۳۱ھ میں فوت ہوئے اور ظفر آباد میں دفن کیے گئے[۵۷]

معلوم ہوتا ہے یہ کسی ایسی کتاب کے مصنف تو نہ تھے جس سے ان کے فقہی مرتبہ کا اندازہ ہو سکتا ہو، البتہ فقہیات کی تدریس اور مسائلِ فقہیہ کے حل و کشود میں مرجعِ خلائق تھے۔

۲۱- شیخ تاج الدین نہروالی

شیخ تاج الدین بن یوسف بن احمد سوہی نہروالی گجراتی، فقہ اور علوم عربیہ کے جیّد علما میں سے تھے۔ اپنے والد گرامی قدر شیخ یوسف بن احمد سوہی ایرجی اور شیخ عبد اللہ بن محمود حسینی بخاری گجراتی سے اخذِ علم کیا۔ نہروالا میں مقبرۂ شیخ حسام الدین ملتانی میں ان کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ اس عالم و فقیہ سے خلقِ کثیر نے کسبِ علم کیا[۵۸]

ان کے بارے میں صرف یہی معلوم ہو سکا ہے کہ یہ اپنے دور کے نامور فقیہ اور مدرس تھے، اس سے زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکے اور یہ پتا نہیں چل سکا کہ یہ کسی کتاب کے مصنف بھی تھے یا نہیں۔

---

[۵۷] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۴۴، ۴۵۔ بحوالہ تجلی نور۔

[۵۸] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۴۵۔ گلزار ابرار، ص ۱۴۷۔

ج

۲۲۔ شیخ جلال الدین مانکپوری

شیخ جلال الدین بن اسماعیل عمری مانکپوری، شیخ حسام الدین مانکپوری کے جدِّ امجد تھے، نہایت فاضل شخص تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے جیّد علما میں سے تھے۔ تصوف میں بھی مرتبۂ کمال پہ فائز تھے۔ علوم ظاہری اور تصوف و طریقت کی تعلیم شیخ نظام الدین اولیا کے خلیفہ شیخ محمد سے حاصل کی۔ بہت بڑے عالم، ورع و تقویٰ میں بے مثال اور انتہا درجے کے عبادت گزار تھے۔ تعبّد و تورع کا یہ عالم تھا کہ رات کو دو حصّوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ رات کے حصۂ اول میں، جب لوگ بیدار ہوتے، یہ سو جاتے اور دوسرے حصّے میں، جب کہ لوگ میٹھی نیند کے مزے اڑا رہے ہوتے، یہ جاگ اُٹھتے اور شب کی تنہائیوں میں نماز تہجد میں مصروف ہو جاتے اور نماز فجر تک اللہ کی عبادت کرتے۔ ان کا معمول تھا کہ ہر رات اکتالیس[۴۱] مرتبہ سورہ یٰسین کی تلاوت کرتے۔ نماز چاشت کے بعد سے درس و تدریس میں مشغول ہو جاتے اور طلبا کو علومِ دینیہ کی تعلیم دیتے۔

شیخ جلال الدین کا ذریعہ معاش، کتابت تھا۔ قرآن مجید کی کتابت کر کے دہلی بھیجتے، جس کا ہدیہ سکۂ رائج الوقت پانچ سو ٹنکہ وصول ہوتا۔ بغیر وضو قلم ہاتھ میں نہ پکڑتے۔ جن دنوں شہر میں چوروں اور ڈاکوؤں کا زور ہو جاتا، گوشت کھانا بند کر دیتے کہ کہیں یہ گوشت چوری کے جانور کا نہ ہو۔

شیخ جلال الدین مانکپوری، شیخ نظام الدین اولیا کے خلیفہ شیخ محمد کے عقیدت مند تھے۔ شیخ محمد وہ بزرگ تھے جو بادشاہوں جیسا لباس پہنتے، دولت مندوں کی طرح زندگی بسر کرتے اور ملوک و سلاطین کے ہاں آمد و رفت رکھتے تھے۔

منقول ہے کہ ایک مرتبہ شیخ محمد مانک پور تشریف لے گئے۔ ملاقات کے لیے قاضی شہر اور ان کے لڑکے بھی آئے اور دل میں یہ ٹھانی کہ شیخ محمد ہمارے لیے

اگر مصری مہیا کر دیں، تو ہم ان کو صاحب کشف و کرامت جانیں۔ اب شیخ محمد نے مولانا جلال الدین مانکپوری سے کہا۔

مدعیان برائے امتحان می آیند، پارۂ بنات حاضر آرند

کچھ لوگ ہمارا امتحان لینے آرہے ہیں، تھوڑی سی مصری لے آؤ۔

قاضی اور اس کے لڑکے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مجلس میں مصری موجود پائی، جسے دیکھ کر بہت شرمندہ ہوئے۔

قاضی کو جب یقین ہو گیا کہ شیخ محمد فی الواقع بہت بڑے بزرگ ہیں تو عرض گزار ہوا کہ

در خانۂ بندہ مہمان شوید۔

اس بندۂ عاجز کے گھر مہمان کی حیثیت سے تشریف لے جایے۔

شیخ نے فرمایا۔

شیخ فرمود چہل سال ست کہ طعام از خانۂ قاضیان نمی خورم۔

چالیس سال سے کسی قاضی کے گھر سے کھانا نہیں کھایا۔

لیکن جب یہ محسوس کیا کہ ان الفاظ سے قاضی شہر کے دل کو تکلیف پہنچی ہے تو فرمایا۔ آپ کے لڑکے کی محکمہ انصاف سے کوئی آمدنی تو نہیں ہوتی ہے۔ عرض کیا جی نہیں۔ فرمایا۔ یہ لڑکا اپنی ملکیت سے کھانا مہیا کرے تو ہم ضرور کھائیں گے۔[۱۷۹]

قاضی جلال الدین مانکپوری اگرچہ بہت بڑے فقیہ اور عالم دین تھے، مگر ان کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چل سکا۔ البتہ یہ واقعہ ہے کہ وہ طلبا کو کتب فقہ کی باقاعدہ تعلیم دیتے تھے۔ اور ان کے معلوماتِ فقہیہ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

۲۳۔ مولانا جمال الدین کشمیری

مولانا جمال الدین کشمیری بہت بڑے عالم اور محدث تھے۔ ان کا شمار حدیث

---

[۱۷۹] اخبار الاخیار، ص ۱۷۸۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳۔ ص ۹۴۔

فقہ، اصول اور علوم عربیہ کے جلیل القدر علما میں ہوتا ہے۔ شیخ علی بن شہاب حسینی ہمدانی کے ساتھ وارد کشمیر ہوئے اور پھر ان کے حکم سے وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ اس زمانے میں سرزمین کشمیر کی عنانِ حکومت سلطان قطب الدین شاہ مرزا کے ہاتھ میں تھی اور شیخ علی بن شہاب نے اس کی تعلیم کے لیے ان کو کشمیر میں اقامت گزین ہونے کا حکم دیا تھا۔

مولانا جمال الدین نے تمام علائق دنیوی سے منقطع ہو کر اپنے آپ کو درس و افادہ کے لیے وقف کر دیا تھا اور ان کے شب و روز طلبا کو علومِ دینیہ سے بہرہ ور کرنے میں بسر ہوتے تھے۔

مشہور عالم ملا کمال الدین ان کے بھائی تھے۔ بابا فتح اللہ حقانی ان کے شیخ اور استاذ تھے۔ تلامذہ کی وسیع جماعت میں شیخ ابوالفقرا نصیر الدین بھی شامل ہیں۔ جنھوں نے ان سے اخذِ علم کیا اور حدیث کی سند حاصل کی۔ اپنے وقت کے بہت سے اکابر مشائخ نے بھی ان سے استفاضہ کیا، جن میں مشہور عالم وصوفی بابا نصیب الدین اور شیخ اسماعیل چشتی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا جمال الدین کا معمول تھا کہ وہ اکثر شیخ نور الدین کی قبر پر جاتے اور ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے تھے۔ ایک دن شیخ نصیر الدین نے کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ

فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم [۵۸۰]

یعنی عالم اسی نسبت سے عابد پر فضیلت رکھتا ہے، جس طرح کہ میں، تم میں کے ادنی صحابی پر شرف و فضیلت رکھتا ہوں۔

---

۵۸۰ جامع ترمذی۔ ابواب العلم۔ باب فی فضل الفقہ علی العبادۃ ۔ اس حدیث میں "عالم" سے مراد وہ عالم ہے جو عابد بھی ہو۔ اور "عابد" سے وہ عابد مراد ہے جو پوری طرح عالم اور دین کے تقاضوں سے آگاہ نہ ہو۔

اس فرمانِ نبوی کی روشنی میں آپ کی فضیلت شیخ نورالدین سے زیادہ ہے۔ مولانا جمال الدین نے فرمایا۔ میں نے ایک روز خواب میں دیکھا کہ شیخ نورالدین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ اے جمال! یہ شیخ نورالدین ہے، جو کام اس نے کیا ہے وہ کسی نے نہیں کیا۔

مولانا جمال الدین ہر وقت طلبا کی تعلیم و تدریس میں مشغول رہتے۔ گوشت بہت کم کھاتے اور نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لباس میں کسی قسم کے تکلف کے عادی نہ تھے۔ ایک قمیص پہنتے اور بے تکلفی سے بوریا پر بیٹھتے۔

منقول ہے کہ مولانا جمال الدین کے شیخ اور استاذ بابا فتح اللہ حقانی کی ایک لڑکی ان (مولانا جمال الدین) کے عقد میں تھی اور دوسری ان کے بھائی ملا جمال الدین کے عقد میں۔!

ان کی قبر کشمیر میں نہر بھٹ کے کنارے ہے[۵۸۱]

یہ وہ محدث و فقیہ اور عالمِ دین ہیں جنھوں نے تمام عمر حدیث و فقہ اور علومِ دینیہ پڑھانے میں صرف کر دی، مگر غالباً اس موضوع سے متعلق کوئی تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی۔ یا اگر کوئی تصنیف ہے بھی تو ہمیں اس علم نہیں ہو سکا۔

شیخ علی بن شہاب حسینی ہمدانی

اب سوال یہ ہے کہ شیخ علی بن شہاب الدین حسینی ہمدانی کون بزرگ تھے جن کی معیت میں مولانا جمال الدین مرحوم سرزمین کشمیر میں تشریف لائے اور پھر مستقل طور سے یہیں اقامت گزین ہو گئے۔

بات یہ ہے کہ وادیٔ کشمیر میں جن بزرگانِ دین نے اسلامی تعلیمات کی ترویج و تبلیغ کے لیے اہم کردار ادا کیا، ان میں سید علی ہمدانی کا اسم گرامی خاص طور سے

---

۵۸۱ روضۃ الابرار۔ از محمد دین کشمیری۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۳، ص ۵۰، ۵۱۔ حدائق الحنفیہ، ص ۳۲۶۔

قابلِ ذکر ہے۔ بہت سے لوگ ان کو علی ثانی کے نام سے یاد کرتے ہیں، مگر باشندگان کشمیر انھیں شاہ ہمدان یا امیر کبیر کے القاب سے ملقب کرتے ہیں۔ یہ ہمدان کے اس علوی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو ان کی ولادت سے قبل کم و بیش دو سو سال سے ہمدان میں فرد کش تھا اور جس کے افراد مختلف اوقات میں ہمدان کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے تھے۔

تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق ان کی تاریخ ولادت ۱۲ رجب ۷۱۴ھ (۱۲ اکتوبر ۱۳۱۴ء) ہے[۵۹۲] مگر شیخ کے ایک معاصر مؤرخ نے ان کی سالِ ولادت ۷۱۳ھ تحریر کی ہے[۵۹۳]

ان کے والد محترم سید شہاب الدین حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے فرزند نامدار حضرت زین العابدین کی اولاد سے تھے۔ والدہ مکرمہ کا نام فاطمہ تھا، جن کا سلسلہ نسب تیرھویں پشت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے۔

سید شہاب الدین ہمدان کے والی تھے اور اپنے زمانے کے امرا و وزرا سے ان کے گہرے مراسم تھے لیکن بیٹے کو باپ کی ان مصروفیات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ بچپن ہی سے دنیوی معاملات سے گریزاں تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے ماموں سید علاء الدولہ سمنانی (متوفی ۷۳۶ھ) سے حاصل کی۔ قرآن مجید بھی ان ہی سے حفظ کیا اور منقولات و معقولات کے حصول کے لیے بھی ان ہی کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھے۔ بارہ سال کے ہوئے تو سید سمنانی نے ان کو اپنے ایک شاگرد اور مرید شیخ ابو البرکات تقی الدین علی دوستی کے حوالے کر دیا مگر چند روز کے بعد اپنے دور کے مشہور صوفی شیخ محمود مزدقانی کی خدمت میں چلے گئے۔ علم حدیث شیخ نجم الدین

---

۵۹۲ تحائف الابرار، ص ۱۱۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۸۰۔ بروکلمان۔ تکملہ، ج ۲، ص ۳۱۱۔

۵۹۳ خلاصۃ المناقب۔

ابو المیامن محمد بن احمد الموفق سے حاصل کیا۔ بہت سے بلاد و ممالک کی سیاحت کی اور بارہ حج کیے۔ ۷۷۳ھ میں ختلان گئے تو بعض روایات کے مطابق ماوراء النہر میں امیر تیمور سے کسی معاملے میں اختلاف ہوگیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے سات سو سیّدوں اور مریدوں سمیت سرزمین ایران کی سکونت ترک کرکے ربیع الاوّل ۷۷۴ھ میں کشمیر جا پہنچے۔ اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ کشمیر آچکے تھے۔ آپ کے اپنے مرید اور قریبی رشتہ دار سیّد حسین سمنانی کے ہاں مقیم ہوئے اور چھ ماہ کے بعد حج بیت اللہ کی غرض سے عازم حجاز ہوگئے۔ بعد ازاں ۷۸۱ھ میں کشمیر آئے۔

سیّد علی ہمدانی بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ تحائف الابرار کی روایت کے مطابق ان کی تعداد ایک سو ستر تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام ذخیرۃ الملوک ہے۔ یہ بڑی ضخیم کتاب ہے اور دس جلدوں کو محیط ہے۔ اردو، لاطینی، ترکی اور فرانسیسی زبانوں میں اس کے تراجم چھپ چکے ہیں۔ اس میں توحید کی معرفت، اوامر و نواہی، انسان کے فرائض و حقوق، دین حقانی، معرفت الٰہی، امورِ جہاں بانی اور وظائف و اوراد وغیرہ سے متعلق تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

اس کتاب میں جا بجا قرآن مجید سے استنباط، احادیث سے استشہاد اور بزرگانِ دین کے اقوال سے استناد کیا گیا ہے۔ ذخیرۃ الملوک کے علاوہ ان کی تصنیفات میں رسالہ مشارب الاذواق، رسالہ اصطلاحات الصوفیہ، مرآۃ التائبین، مکتوباتِ امیریہ، رسالہ فتحیہ، رسالہ شرح حل مشکل، رسالہ اورادِ فتحیہ، رسالہ واردات، رسالہ مناجات، رسالہ مودۃ القربیٰ۔ منازل السالکین، اربعین اور السبعین فی فضائل امیر المومنین، مجمع الاحادیث، شرح اسمائے حسنیٰ، رسالہ قدوسیہ، رسالہ معرفت زاہد اور رسالہ اعتقادیہ خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔

سیّد علی ہمدانی فقہی مسلک کے اعتبار سے شافعی تھے۔ اسلام کے سچے اور مخلص مبلغ تھے۔ اہل دل سے انتہائی محبت رکھتے تھے، درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے، طبیعت میں جلال اور جمال دونوں صفات موجود تھیں۔ خلافِ شرع

بات دیکھ کر بہت جلد طیش میں آجاتے اور اس ضمن میں مریدوں کو سخت الفاظ میں تنبیہ کرتے، علمائے دین کو ان کی لغزشوں کی اصلاح کی طرف توجہ دلاتے، حاکموں کو ارتکاب خطا پر سخت الفاظ میں ٹوکتے اور عذاب الٰہی سے ڈراتے۔ تبلیغ دین کے سلسلے میں اتنے حساس تھے اور اس درجہ جذبات میں آجاتے کہ بڑی سے بڑی مخالفت کی بھی پرواہ نہ کرتے۔ ان کے مختلف اوصاف کی بنا پر دولت شاہ نے ان کو تیموری دور کا سلطان العرفا والسادات لکھا ہے۔

صاف گوئی اور حق بیانی میں اس قدر جرأت مند تھے کہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر والی ملک تک کو سر دربار ٹوک دیتے۔ ایک مرتبہ حاکم بلخ نے آگ میں گرم کیے ہوئے آہنی گھوڑے پر سوار کرانے کی دھمکی دی لیکن سید ہمدانی اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ اسی طرح ان کی حق گوئی سے تنگ آکر چند عالموں نے ان کو زہر کھلا دیا، جان تو بچ گئی مگر اس کا اثر عمر بھر باقی رہا۔

ہمدان، ختلان اور کشمیر ان کی تعلیمات کے مرکز تھے۔ ان میں کشمیر تو بے دینی کا گھر تھا۔ یہاں انھوں نے تبلیغ اسلام کے لیے اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں۔ ان سے قبل اگرچہ شرف الدین بلبل شاہ (۷۲۷ھ)، سید جلال الدین بخاری (۷۴۷ھ)، سید تاج الدین اور ان کے ساتھی سید حسین سمنانی اور سید یوسف وادی کشمیر میں تشریف لے آئے تھے اور ان بزرگان دین کی تبلیغی مساعی سے باشندگان کشمیر کسی حد تک اسلام سے متعارف بھی ہو گئے تھے لیکن ان کے اندر عقیدۂ توحید میں رسوخ، اسلامی شعار سے وابستگی اور دینی امور سے محبت، سید علی ہمدانی کی تبلیغی مساعی کی بدولت پیدا ہوئی۔

مسلمانوں کے علاوہ کشمیری ہندوؤں کو بھی ان کی تبلیغ نے بہت متاثر کیا اور وہ کثیر تعداد میں حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ سب سے پہلے دو ہند و سنیاسیوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد تو بے شمار لوگ اس نعمت سے متمتع ہوئے اور پوری وادیٔ کشمیر میں اسلام کے نعرے گونجنے لگے۔ بقول مفتی غلام سرور لاہوری۔

احکامِ شریعتِ غرا بطفیل آں محبوبِ کبریا در کشمیر رواج یافتند و ہزارہا گمراہان

لایعقل رہ براہ آور دند ۵۸۴ؑ

تحائف الابرار کی روایت کے مطابق سینتیس [۳۷] ہزار غیر مسلم ان کی تبلیغ سے مسلمان ہوئے۔

اس عظیم مبلغ اسلام نے تہتر سال کی عمر پاکر ۶ ذی الحجہ ۷۸۶ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا اور کشمیر میں دفن کیے گئے۔ بعض روایات کے مطابق وفات کے وقت "یا اللہ یا رفیق یا حبیب" کے الفاظ وردِ زبان تھے۔ ایک روایت یہ ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا وظیفہ پڑھتے ہوئے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اسی لیے ان کی قبر پر یہ اشعار مرقوم ہیں:

حضرت شاہ ہمدان کریم — آیۂ رحمت ز کلام قدیم
گفت دم آخر و تاریخ شد — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سید علی ہمدانی کی پوری زندگی اسلام کی تبلیغ اور توحید کی ترویج میں بسر ہوئی ۵۸۵ؑ

ح

۲۴- قاضی حماد الدین گجراتی

قاضی حماد الدین بن محمد اکرم گجراتی، حنفی المسلک تھے۔ جید عالم اور فقیہ تھے ان کا شمار اپنے دور کے مشہور افاضل میں ہوتا تھا۔ علاقہ گجرات کے شہر نہر والہ کے قاضی القضاۃ تھے۔ ان کے کہنے سے اس زمانے کے بہت بڑے فقیہ مفتی رکن الدین ناگوری نے فتاویٰ حمادیہ تصنیف کیا۔ اس کے مقدمہ میں مصنف نے ان کے علم و فضل اور وسعتِ معلومات کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب میں

۵۸۴ؑ خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۲۹۵۔

۵۸۵ؑ مفتاح التواریخ، ص ۹۵۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۸۔ حدائق الحنفیہ، ص ۲۹۷، ۲۹۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۸۷ تا ۹۰۔ ادبی دنیا (کشمیر نمبر)، ص ۳۰۵ تا ۳۱۳۔

شہر نہر والہ میں آیا تو وہاں کی مسند قضا پر جمال الملت والدین قاضی حماد الدین متمکن تھے۔ میں ان سے ملا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت بڑے عالم و فاضل اور مجتہد ہیں، حق و باطل کے درمیان حدِّ فاصل ہیں اور شریعت کو اساس و بنیاد ٹھہرا کر فیصلے کرتے ہیں، اس لیے کوئی شخص ان کے سامنے غلط بیانی سے کام لینے اور خلافِ واقع بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ذہنی پاکیزگی، معرفت و شعور، تجربہ اور مہارت کی نعمت سے بھی متمتع ہیں۔ فتاویٰ حمادیہ کی تصنیف کے وقت وہ پینتیس سال سے نہر والہ کے منصب قضا پر فائز تھے اور جمہور فقہا کے اقوال اور فتاویٰ کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ انھوں نے یعنی قاضی حماد الدین بن اکرم نے فتاویٰ حمادیہ کی ترتیب و تالیف پر قاضی رکن الدین اور ان کے بیٹے مولانا داؤد کو مقرر کیا اور انھوں نے مختلف کتب فتاویٰ اور فقہا کی تصنیفات جمع کر کے فتاویٰ حمادیہ کے نام سے ایسی کتاب تصنیف کی جو معتمد علیہ روایات کی حامل اور عقل و درایت کی میزان پر پوری اترتی ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور غیر مطبوعہ ہے اور مخطوطے کی صورت میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری، انڈیا آفس لائبریری لندن، مانچسٹر لائبریری، کتب خانہ خدیویہ مصر، رام پور لائبریری، بانکی پور لائبریری اور کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔[۵۸٦]

خ

۲۵- مولانا خواجگی دہلوی

مولانا خواجگی بن محمد دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ شیخ معین الدین عمرانی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان سے فقہ و اصول اور علوم عربیہ کی

---

۵۸٦ فتاویٰ حمادیہ کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو: برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ، ص ۱۲٦ تا ۱٦٦۔ شائع کردہ۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور۔

تعلیم حاصل کی اور ان علوم میں درجۂ اجتہاد پر پہنچے۔ ان کا شمار نویں صدی ہجری کے جلیل القدر علما کی جماعت میں ہوتا تھا۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے۔ طویل عرصہ تک دارالسلطنت دہلی میں ان کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ اس زمانے میں جن حضرات نے ان سے اخذِ علم کیا، ان میں ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی کا اسمِ گرامی خاص طور سے لائقِ تذکرہ ہے۔

مولانا خواجگی، جہاں جید عالمِ دین تھے، وہاں تصوف وطریقت سے بھی قلبی لگاؤ رکھتے تھے اور اس باب میں شیخ نصیر الدین محمود اودھی چراغ دہلی کے فیض یافتہ تھے۔

مولانا خواجگی دہلی ہی میں تھے کہ شیخ محمد بن یوسف حسینی دہلوی المعروف بہ سید محمد گیسو دراز نے خواب دیکھا کہ عنقریب ارضِ ہند پر مغل حملہ آور ہوں گے جو کھیتی باڑی کو تباہ اور مال و مویشی کو ہلاک کر دیں گے اور بے شمار انسانی جانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے [۵۸۶] یہ خواب انھوں نے مولانا خواجگی سے بیان کیا تو وہ اپنے تلمیذِ رشید مولانا شہاب الدین دولت آبادی کو ساتھ لے کر دہلی سے نکلے اور کالپی چلے گئے۔ مولانا خواجگی تو کالپی ہی میں سکونت پذیر ہو گئے مگر مولانا شہاب الدین جون پور تشریف لے گئے۔ جون پور کے تختِ حکومت پر سلطان ابراہیم شرقی متمکن تھا جو بڑا نیک دل اور علم و علما کا قدر دان حکمران تھا۔ اس نے مولانا شہاب الدین کی علمی قابلیت سے متاثر ہو کر ان کو جون پور کا قاضی القضاۃ مقرر کر دیا۔ اس نے کئی بار مولانا خواجگی سے مستقل طور سے جون پور میں سکونت اختیار کرنے کی درخواست کی۔ وہ اس کے کہنے سے جون پور تو گئے مگر کچھ عرصہ کے بعد واپس کالپی تشریف لے گئے اور بقیہ زندگی وہیں بسر کی۔

---

[۵۸۶] تیمور نے ۸۰۱ھ میں ہندوستان پر حملہ کیا اور وہی کچھ ہوا جو انھوں نے خواب میں دیکھا تھا۔ خواب کے علاوہ حالات بھی ایسے ہی پیدا ہو گئے تھے۔

مولانا خواجگی جس زمانے میں، دہلی میں مولانا معین الدین عمرانی سے تعلیم حاصل کرتے تھے، ان کا معمول تھا کہ درس کے بعد شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کی خدمت میں بھی جاتے لیکن مولانا عمرانی اس عام مخالفت کی بنا پر جو علمائے دین کو فقرا و صوفیا سے ہوتی ہے، چراغ دہلی کے مرتبہ کے قائل نہ تھے اور کبھی ان کی ملاقات کو نہ گئے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا عمرانی کو اس درجہ شدید کھانسی ہوگئی کہ معالجوں نے اس کو ناقابل علاج قرار دے دیا اور وہ ان کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر مولانا خواجگی نے استاذ سے عرض کیا۔

مولانا خواجگی بعرض رسانیدہ کہ چہ شود اگر مخدوم جہت ملاقات شیخ قدم رنجہ فرمایند و استمداد ہمت نمایند کہ از برکتِ صحبت و نظر ایشاں شفا حاصل شود۔

مخدوم محترم۔ اس میں کیا مضائقہ ہے کہ آپ چراغ دہلی کی ملاقات کے لیے تشریف لے چلیں۔ ان سے دعا کی درخواست کی جائے۔ ممکن ہے، ان کی برکتِ صحبت و نظر سے صحت حاصل ہو جائے۔

پہلے تو مولانا نے یہ مشورہ قبول فرمانے سے انکار کیا مگر جب بیماری سے زیادہ پریشان ہوئے تو رضامندی ظاہر کر دی اور چراغ دہلی سے ملنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ دروازے سے نکل کر ابھی خانقاہ میں گئے ہی تھے کہ چراغ دہلی گھر گئے اور کھانا، جو چاول اور دہی پر مشتمل تھا، منگوایا اور مولانا کے سامنے رکھا۔ ظاہر ہے یہ دونوں چیزیں کھانسی کے مریض اور بلغمی مزاج والے شخص کے لیے سخت مضر ہیں، اس لیے مولانا نے انکار کیا مگر چراغ دہلی نے سخت اصرار کے ساتھ کھانا ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

شیخ فرمود کہ میل کنید بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر تناول فرمایئے

انھوں نے کھانا شروع کیا مگر جب دسترخوان سے اُٹھے تو کھانسی نے بہت

ہی زور پکڑا۔ شیخ کے حکم سے طشت منگوایا گیا اور وہ تمام بلغمی مادہ جس سے کھانسی ہوتی تھی، طشت میں آرہا اور مولانا مکمل طور سے صحت یاب ہو گئے۔

اس واقعہ کے بعد مولانا عمرانی کا شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کی ملاقات سے انکار، ارادت مندی میں بدل گیا۔ مولانا کو شیخ سے بے انتہا عقیدت پیدا ہوگئی اور وہ ایک دوسرے سے مسرت افزا جذبات کے ساتھ ملنے لگے۔

مولانا خواجگی نے ۹۰۸ھ میں شہر کالپی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔[۵۸۸]

مولانا خواجگی کا شمار نویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند کے ان فقہائے گرامی قدر میں ہوتا ہے جن کی کسی تصنیف کا ہمیں علم نہیں ہو سکا۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ وہ عمر بھر درس و تدریس میں مشغول رہے اور طلبا کو علم فقہ اور دیگر علوم عربیہ کی تعلیم سے بہرہ مند کرتے رہے۔

۲۶۔ مولانا خواجگی کڑوی

شیخ خواجگی بن احمد بن شمس الدین عریفی ملتانی کا لقب شیخ شمس الدین تھا۔ بہت بڑے عالم اور اپنے عصر کے فاضل شخص تھے۔ اسماعیل بن جعفر صادق رحمہ اللہ کی اولاد سے تھے۔ علم و معرفت کے لیے شیخ علاء الدین حسینی جیوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ایک عرصہ تک ان سے وابستہ رہے۔

شیخ خواجگی کڑوی حدیث اور فقہ میں بھی کامل مہارت رکھتے تھے اور تصوف و طریقت کی بھی تمام منزلیں طے کر چکے تھے۔ تصوف و سلوک کے موضوع سے متعلق ان کی ایک تصنیف بھی ہے جس کا نام المرید و المراد ہے۔ حدیث رسول اللہ

---

[۵۸۸] اخبار الاخیار، ص ۱۴۳، ۱۴۴۔ مآثر الکرام، ص ۱۶۸۔ گلزار ابرار، ص ۳۵۹، ۳۶۰۔ تاریخ الاولیا، ج ۲، ص ۲۱۰، ۲۱۱۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۳۷۸، ۳۷۹۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۵۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۶۳، ۶۴۔ تاریخ شیراز ہند، جون پور، ص ۶۵۶ تا ۶۵۸۔

صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے قلبی لگاؤ اور دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ شیخ حسن صغانی لاہوری کی معروف تصنیف مشارق الانوار سے چالیس احادیث کتاب کی صورت میں جمع کیں جن کا نام الاربعین رکھا۔ ان کی یہ اربعین بہت ہی مقبول ہوئی۔

شیخ احمد بن محمد حسینی کڑوی نے اپنی بعض تصنیفات میں یہ واقعہ تحریر کیا ہے کہ عالم رؤیا میں ان کے والد مکرم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا اور حضورؐ سے عرض گزار ہوئے کہ آپؐ ان کے جدّ امجد کی اربعین سماعت فرمائیں اور اس میں مندرج احادیث کی تصحیح کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ احادیث تم نے کس کتاب سے نقل کی ہیں۔؟ عرض کیا، صغانی کی مشارق الانوار سے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مشارق الانوار کی تمام احادیث صحیح ہیں۔ آنحضرتؐ کی طرف سے اس بشارت پر انھوں نے الحمد للہ کہا اور اللہ کی ثنا بیان کی اور پھر شروع سے آخر تک پوری مشارق الانوار زبانی یاد کر لی۔

مولانا خواجگی کڑوی اپنے دور کے معروف اور بہترین شاعر بھی تھے۔

اس عظیم عالم و فقیہ اور نامور صوفی و سالک نے ۱۸ محرم ۸۹۸ھ کو وفات پائی۔ ان کی قبر شہر کڑہ میں دریائے گنگا کے کنارے ہے اور اس پر ان ہی کے یہ دو شعر مکتوب ہیں:

برائے خدا اے عزیزانِ من　　نویسید بر گورِ من این سخن

کہ چوں خواجگی درّۃِ خاک شد　　نکو شد ز حکم جہاں پاک شد [۵۹]

مولانا خواجگی کڑوی کے حالات میں تذکرہ نگاروں نے اس بات کی تو صراحت کی ہے کہ وہ اپنے دور کے نامور اور معروف فقیہ تھے مگر اس موضوع کے بارے میں نہ ان کی کسی کتاب کا ذکر کیا ہے اور نہ ان کی دیگر فقہی کاوشوں کی نشان دہی کی ہے۔

---

۵۹ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۶۴، ۶۵

معلوم ہوتا ہے یہ کتب فقہیہ پر عبور رکھتے تھے اور ان کتابوں کی تدریس و تعلیم کے فرائض بھی انجام دیتے تھے مگر کسی فقہی کتاب کے مصنف نہ تھے۔

۷۲- مولانا خواجہ مانکپوری

نویں صدی ہجری کے خطۂ ہند میں جن بلند پایہ علمی شخصیتوں کا ظہور ہوا، ان میں مولانا خواجہ مانکپوری کی ذاتِ گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہے۔ یہ مولانا خواجہ بن جلال الدین عمری مانکپوری ہیں جو مولانا حسام الدین مانک پوری کے والد اور عالم و زاہد شخص تھے۔ ان کا شمار فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے جیّد اور نامور علما کی جماعت میں ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنے والد گرامی قدر شیخ جلال الدین عمری اور دیگر علمائے عصر سے اخذِ علم کیا۔ نہایت قانع، نیک اور متورع بزرگ تھے۔ ان کے بارے میں ایسے عجیب و غریب واقعات کتابوں میں مرقوم ہیں کہ اس مادی دور میں ان کو ماننا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے

ان متعدد واقعات میں سے ایک یہ ہے کہ یہ خود اور ان کے اہلِ خانہ تین روز سے فاقے کی حالت میں تھے کہ ایک شخص ایک فتویٰ پوچھنے آیا اور سونے کا ایک سکّہ ساتھ لایا۔ شیخ نے اس کو فتوٰی تو دے دیا مگر سونے کا وہ ٹکڑا واپس کر دیا۔ اس پر اہلِ خانہ نے ان پر خفگی کا اظہار کیا لیکن شیخ خاموش رہے اور کسی کو کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں ایک شخص ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ "امیر عین الدین آتے ہیں اور آپ کو سلام کہتے ہیں۔ وہ کچھ دعائیں پڑھ رہے تھے کہ بعض مشکل الفاظ سامنے آئے، جو اُن کی سمجھ سے بالا ہیں۔ امیر نے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہاں کوئی عالمِ دین ہے؟ لوگوں نے آپ کا نام لیا۔ وہ آپ کو یاد کرتے ہیں اور آپ سے مشکل الفاظ سمجھنا چاہتے ہیں۔"

امیر عین الدین کے پیغام پر مولانا خواجہ اس کے پاس گئے اور جو مشکل اس کو درپیش تھی وہ حل کر دی۔ اس پر امیر بہت خوش ہوا اور اس نے اس قدر سونا بھی

دیا جتنا کہ انھوں نے واپس کردیا تھا اور ساتھ ہی کپڑے اور کھانے کی چیزیں بھی پیش کیں۔ یہ ان کے صبر کا بدلہ تھا جس پر اہلِ خانہ اور دیگر لوگوں نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا۔ اس پر اپنے گھر والوں سے شیخ نے کہا۔

چوں ہمت کردیم و مال مشکوک باز گردانیدیم، خدائے تعالیٰ مارا از وجہ او حلال عطا کرد۔

کہ ہم نے ہمت کر کے مالِ مشکوک واپس کردیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ سے ہمیں مالِ حلال عطا کردیا۔[۵۹]

مولانا خواجہ بن شیخ جلال الدین عمری کا شمار بھی ان ہی فقہائے کرام میں ہوتا ہے، جن کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔ غالباً یہ بھی فقہا کی اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے جو تصنیف و تالیف میں نہیں بلکہ درس و تدریس میں مشغول و منہمک رہتی تھی۔

۲۸- شیخ خوند میر پٹنی

شیخ خوند میر کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ شیخ خوند میر بن سید بڈھا بن یعقوب بن محمود حسینی پٹنی گجراتی۔ سرزمین گجرات (کاٹھیاوار) میں پیدا ہوئے اور اپنے چچا شادی بن یعقوب سے علم فقہ کی تعلیم حاصل کی اور ان ہی سے تصوف و طریقت کا علم اخذ کیا۔ پھر پٹن سے احمد آباد منتقل ہو گئے اور وہاں کے مشہور علماء و صوفیا یعنی شیخ عبداللہ بن محمود حسینی بخاری گجراتی اور شیخ عبدالفتاح سے کسبِ فیض کیا۔ شیخ عبدالفتاح نے شیخ علاء الدین سے اور انھوں نے شیخ محمد بن یوسف حسینی (نزیل گلبرگہ) سے استفاضہ کیا تھا۔

شیخ خوند میر کا شمار اس دور کے اصحاب فضل و صلاح میں ہوتا ہے۔ وہ باوقار اور بلند مرتبت بزرگ تھے۔ ان سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا۔

---

[۵۹] اخبار الاخیار، ص ۱۷۸- تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۷، ۵۸- نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۶۵، ۶۶

۱۰ ربیع الثانی ۸۷۴ھ میں فوت ہوئے[۹۱]
ان کی کسی تصنیف کا پتہ نہیں چل سکا۔

۲۹۔ شیخ خضر بن حسن بلخی

شیخ کا نسب نامہ یہ ہے۔ خضر بن حسن بن مبارک بن عثمان بن محی الدین عمری ادہمی بلخی۔ بعض حضرات نے ان کے سلسلۂ نسب کو مشہور بزرگ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچایا ہے لیکن صاحب نزہۃ الخواطر مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی مرحوم کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے[۹۲]

شیخ خضر بن حسن اپنے عصر کے ممتاز عالم دین تھے اور علم حدیث میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے۔ یہ وارد ہند ہوئے اور جون پور تشریف لے گئے۔ لکھنو میں بھی ان کا سلسلۂ تدریس جاری رہا۔ ان کی علمی خدمات کی بنا پر ملیح آباد کے مضافات میں ان کو متعدد دیہات عطا کیے گئے تھے۔

جن حضرات نے ان سے اخذ علم کیا، ان میں ان کے فرزند گرامی قدر شیخ قطب الدین کا اسم گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہے[۹۳]

ان کا شمار علمائے کرام کی اس جماعت میں ہوتا ہے جن کی تصنیفات اور علمی سرگرمیوں کی تفصیلات سے تاریخ کے اوراق خالی ہیں۔

د

۳۰۔ مفتی داؤد بن رکن الدین ناگوری

مفتی داؤد بن رکن الدین بن حسام الدین ناگوری حنفی المسلک تھے اور فقہ

۹۱ھ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۶۷۔ بحوالہ مرآۃ احمدی
۹۲ھ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۱۱۹، ۱۲۰ —— ۹۳ھ نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۶۸

اصول اور علوم عربیہ کے جید عالم علاقہ گجرات کے ایک شہر نہروالہ کی مسند افتا پر فائز تھے۔ فقہ کی مشہور کتاب فتاویٰ حمادیہ ان کے والد مکرم شیخ رکن الدین ناگوری کی تصنیف ہے، لیکن جیسا کہ شیخ موصوف نے اس کے مقدمہ میں وضاحت کی ہے، اس کی ترتیب و تصنیف میں ان کے بیٹے مفتی داؤد بھی ان کے شریک تھے اور اس سلسلے میں انھوں نے ان کی بہت مدد کی[۹۴]

ر

۱۳۱- قاضی رضی الدین ردولوی

قاضی رضی الدین بن نصیر الدین بن نظام الدین حنفی ردولوی، ملک العلما قاضی شہاب الدین احمد بن عمر زاولی دولت آبادی کے نواسے تھے اور علم و فضل کے بلند مرتبہ پر فائز۔ جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ اپنے نانا قاضی القضاۃ شہاب الدین دولت آبادی کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو کر حصول علم کی منزلیں طے کیں اور ایک عرصہ تک ان سے وابستہ اور منسلک رہے۔ یہاں تک کہ سب مروجہ علوم حاصل کر لیے اور اپنے تمام معاصرین اور اقران میں فقہ و اصول، علم کلام اور علوم عربیہ میں ممتاز گردانے گئے۔

یہ سلطان ابراہیم شرقی کا عہد حکومت تھا اور وہ علما و فقہا کا بہت ہی قدردان تھا۔ وہ ان کے علوم دینیہ پر عبور اور فقاہت سے اس درجہ متاثر ہوا کہ ان کو شہر ردولی کا قاضی مقرر کر دیا۔ پھر یہ وہیں اقامت گزین ہو گئے اور فرائض قضا کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ درس و تدریس میں بھی مشغول رہے۔ ان سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا۔[۹۵]

---

۹۴ مقدمہ فتاویٰ حمادیہ و نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۶۸ - اس ضمن میں مفصل معلومات کے لیے ملاحظہ ہوں، حالات شیخ رکن الدین ناگوری۔

۹۵ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۷۱، بحوالہ انوار الصفی۔

یہ وہ نامور فقیہ اور عالم دین تھے جنھوں نے غالباً کوئی تصنیف تو اپنی یادگار نہیں چھوڑی مگر بحیثیت قاضی اور مدرس کے علم فقہ کی خوب اشاعت کی اور اس سلسلے میں بہت شہرت پائی۔

۳۲۔ شیخ رکن الدین جون پوری

شیخ رکن الدین جون پوری کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ رکن الدین بن صدرالدین بن شرف الدین بن جلال الدین بن محمود بن جابر بن شیخ عبداللہ انصاری ہروی ثم ہندی جون پوری۔

شیخ رکن الدین جون پوری اپنے زمانے کے مشہور رجال فضل و صلاح میں سے تھے اور معروف فقیہ بھی! ان کے والد شیخ صدرالدین، سلطان خضر بن سلیمان کے ایام حکومت میں دہلی آئے اور وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ والد کی وفات کے بعد شیخ رکن الدین دہلی سے جون پور منتقل ہو گئے۔ اس زمانے میں جون پور کے تخت حکومت پر سلطان ابراہیم شرقی متمکن تھا اور جون پور کو علما و مشائخ کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ شیخ رکن الدین نے وہاں شیخ تاج الدین جھونسوی (غالباً یہ جھانسوی ہے) سے تصوف و طریقت کا درس لیا۔ پھر شیخ جلال الدین حسین بن احمد حسینی بخاری وارد جون پور ہوئے تو انھوں نے ان سے بھی استفاضہ کیا۔ جون پور آنے کے بعد شیخ رکن الدین کے نام کے ساتھ "جون پوری" کی نسبت کا اطلاق ہونے لگا اور اس نواح میں انھیں بڑی قبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے عقیدت مندان کو سجدہ کرتے تھے لیکن وہ ان کو اس سے روکتے نہ تھے۔ یہ فعل چوں کہ شرک لغیراللہ کے مترادف تھا، اس لیے ملک العلما قاضی شہاب الدین کو سخت ناگوار گزرا۔ انھوں نے شیخ رکن الدین کو اس سے کئی مرتبہ ٹوکا اور کہا کہ وہ اپنے مریدوں کو اس فعل شرک کے ارتکاب سے روکیں۔

شیخ عبدالعزیز جون پوری سیرۃ الاولیا میں رقم طراز ہیں کہ کبیر موحد ہندی جون پور

آئے، تو قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے تلامذہ اور اصحاب ارادت نے ان کو پریشان کرنا شروع کردیا۔ لیکن شیخ رکن الدین نے ان کی حمایت کی اور پھر ان سے جون پور سے نکل جانے کے لیے کہا۔

شیخ رکن الدین سے جن لوگوں نے استفادہ کیا، ان میں شیخ عبدالملک جون پوری، قاضی محمد بن علا منیری اور خلق کثیر شامل ہے

شیخ موصوف نے ۱۱ ربیع الثانی ۸۷۴ھ کو وفات پائی۔ ان کی قبر جون پور کے محلہ تاڑتلا میں ہے[96]

یہ بزرگ اگرچہ صوفی اور صاحب طریقت ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کے فقیہ بھی تھے اور تذکرہ نویسوں نے بھی ان کا شمار فقہا میں کیا ہے، مگر ان کی کسی تصنیف اور فقہی کاوشوں کا علم نہیں ہوسکا۔ معلوم ہوتا ہے ان کی فقہی سرگرمیاں محض درس و تدریس تک محدود تھیں۔ تصنیف و تالیف سے دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ یا اگر کوئی تصنیف تھی بھی تو ہمارے احاطۂ معلومات سے باہر ہے۔

۲۳ - شیخ رکن الدین دہلوی

شیخ رکن الدین بن شہاب الدین صوفی حنفی المسلک تھے۔ فقیہ اور مرد صالح تھے۔ ان کا شمار مشاہیر مشائخ چشتیہ میں ہوتا تھا۔ دارالسلطنت دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں۔ ان کے والد گرامی شیخ شہاب الدین دہلوی اپنے دور کے عالم دین بھی تھے اور معروف صوفی اور صاحب طریقت بھی۔ انھوں نے ان ہی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور ان ہی سے تصوف و طریقت کی تعلیم حاصل کی۔ والد کی وفات کے بعد ان کی جگہ مسند مشیخت پر متمکن ہوئے اور بڑی شہرت پائی۔

جن حضرات نے شیخ رکن الدین سے فیض حاصل کیا، ان میں صاحب تمہیدات

---

۹۶ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۶۹، ۷۰۔ بحوالہ گنج ارشدی

مسعود بیگ کا نام قابل ذکر ہے[۹۷]

سوال یہ ہے کہ یہ مسعود بیگ کون بزرگ تھے؟۔ ان کا اصلی نام شیر خاں تھا اور یہ سلطان فیروز کے اقربا میں سے تھے۔ نہایت عمدہ قسم کا شاہانہ اور امیرانہ لباس زیب تن کرتے تھے۔ لیکن اچانک جذب کی ایسی کیفیت پیدا ہوتی کہ کپڑے پھاڑ ڈالتے اور گریبان چاک کر دیتے۔ عام طور سے طبیعت پر حالتِ سکر طاری رہتی اور کسی سے بات نہ کرتے۔ توحید اور تصوف کے موضوع پر ان کی کئی تصنیفات ہیں جن میں تمہیدات اور مرآۃ العارفین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

مسعود بیگ جہاں بہت بڑے صوفی اور صاحب طریقت بزرگ تھے، وہاں بہترین شاعر بھی تھے۔ ان کے مجموعۂ کلام میں قصائد، غزل وغیرہ ہر قسم کے اشعار موجود ہیں[۹۸]

۳۴۔ شیخ رکن الدین ظفر آبادی

شیخ رکن الدین قریشی ظفر آبادی کا شمار اکابر فقہائے حنفیہ میں ہوتا ہے۔ یہ وہ عالم دین تھے جو تفسیر، حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ میں بدرجہ غایت عبور رکھتے تھے۔ صاحب نزہۃ الخواطر علامہ سید عبدالحی حسنی لکھنوی، مناقب درویشیہ کے حوالے سے ان کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک لاکھ احادیث زبانی یاد تھیں۔ ان کی نیکی اور تدین کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ روزے سے رہتے اور مشکوک لقمہ حلق سے نیچے نہ اترنے دیتے۔

علم و فضل کی فراوانیوں کے علاوہ انھیں تصوف و طریقت سے بھی گہرا لگاؤ تھا اور شیخ اسدالدین حسینی ظفر آبادی سے فیض یافتہ تھے۔ ان کی معیت میں جہاد فی سبیل اللہ میں بھی کوشاں رہے اور ظفر آباد ہی کو مستقل طور سے اپنا مسکن بنا لیا تھا۔

---

[۹۷] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۷۰۔ گلزار ابرار، ص ۹۷

[۹۸] تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۶

شیخ رکن الدین کی وفات ۸۲۰ھ میں ہوئی۔ ان کے بعض عقیدت مندوں نے تاریخ وفات "رکن الدین افتاد" سے نکالی ہے۔[۹۹]

ان کا شمار بھی ان اصحاب علم بزرگوں میں ہوتا ہے جن کی کسی تصنیف کا ذکر تذکرہ نگاروں نے نہیں کیا۔ اور پھر یہ ضروری بھی نہیں کہ ہر فقیہ یا عالم دین لازماً صاحب تصنیف بھی ہو۔ بعض علمائے عظام نے قلم و قرطاس سے ناتہ نہیں جوڑا بلکہ فقط درس و تدریس ہی کو اپنا مشغلہ قرار دیے رکھا اور ان کے نزدیک خدمتِ دین کا اصلی اور بنیادی طریق یہی تھا جیسا کہ بے شمار علما اب بھی اس پر عمل پیرا ہیں۔ معلوم ہوتا ہے شیخ رکن الدین ظفر آبادی بھی ان ہی حضرات میں سے تھے۔

۳۵۔ مفتی رکن الدین ناگوری

علامہ مفتی رکن الدین ناگوری بن حسام الدین ناگوری کا شمار ان فقہامیں ہوتا ہے، جو فقہ اور اصول میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ یہ علاقہ گجرات (کاٹھیاواڑ) کے ایک معروف شہر نہروالہ میں منصب افتا پر فائز تھے۔ ان کی تصنیف فتاویٰ حمادیہ ہے جو ایک ضخیم کتاب ہے۔ یہ کتاب انھوں نے قاضی حماد الدین بن محمد اکرم گجراتی کے حکم سے تصنیف کی جو نہروالہ کے قاضی القضاۃ اور اپنے زمانے کے مشہور فاضل اور نامور فقیہ تھے۔ اس کتاب کی تصنیف و ترتیب کے مراحل مفتی رکن الدین نے اپنے بیٹے مفتی داؤد کی اعانت و شرکت میں طے کیے۔ یہ فقہ کی نہایت اہم کتاب ہے جو ان دونوں فقہا۔۔۔ مفتی رکن الدین ناگوری اور ان کے بیٹے مفتی داؤد۔ نے تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ کی دو سو سولہ کتابوں سے استفادہ کر کے مکمل کی۔ اس کی پوری تفصیل کتاب کے مقدمے میں بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب "الحمد للہ الذی نور قلوب الموحدین بنور التوحید والایمان" کے الفاظ سے

۹۹ھ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۷۰، ۷۱۔ بحوالہ تجلی نور

شروع ہوتی ہے۔ اس کی تصنیف میں جن کتب فقہ سے استفادہ کیا گیا ہے، مقدمہ کتاب میں ان کے نام درج کیے گئے ہیں۔ جن میں ہدایہ، الکافی، شرح مجمع البحرین، شرح وقایہ، شرح طحاوی، تحفۃ الفقہا، المحیط، الواقعات حسامی، فتاویٰ ابرہانی، فتاویٰ تاتارخانی، جواہر الفتاویٰ، جامع الفتاویٰ، فتاویٰ ولوالجی، الخلاصہ، خزانۃ الفقہ، فتاویٰ سمرقند، فتاویٰ قراخانی، فتاویٰ النوازل، فتاویٰ الصیرفی، زاد الفقہا، دستور القضاۃ، الذخیرہ، المبسوط، فتاویٰ الابانہ، حاشیہ بزدوی، فتاویٰ الناطفی وغیرہ کتب فقہ کے علاوہ مشکوٰۃ المصابیح اور تفاسیر میں سے معالم التنزیل، تفسیر کبیر، تفسیر شیخ شہاب الدین سہروردی اور تفسیر کشاف وغیرہ شامل ہیں۔

فتاویٰ حمادیہ، اگرچہ فقہ احناف سے متعلق مسائل کو محیط ہے۔ تاہم اس میں ان کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو فقہ امام شافعی پر محتوی ہیں۔

فتاویٰ حمادیہ کے مقدمے سے واضح ہوتا ہے کہ مفتی ابوالفتح رکن الدین بن حسام الدین ناگوری کا اصل وطن نہروالہ نہیں تھا بلکہ وہ کسی دوسری جگہ سے جا کر نہروالہ میں متوطن ہوئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں نہروالہ میں گیا تو دیکھا کہ یوں تو اس شہر کے تمام لوگ بہترین عادات و اطوار کے حامل ہیں مگر وہاں کے قاضی القضاۃ حماد الدین بن محمد اکرم تو نہایت نیک، معرفت و شعور سے بہرہ ور، تجربہ و مہارت میں یگانہ اور ذہنی و قلبی اعتبار سے مجسمہ خلوص ہیں۔ وہ پینتیس سال سے نہروالہ کی مسند قضا پر فائز ہیں۔ ان کے رعب و دبدبہ اور ذاتی و علمی وجاہت کا یہ عالم ہے کہ کوئی شخص ان کے سامنے جھوٹی شہادت دینے اور غلط بیانی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ تنفیذِ احکام میں بے مثل کردار کے مالک ہیں اور دعاوی و مقدمات کے فیصلے جمہور فقہائے اقوال اور فتاویٰ کے مطابق کرتے ہیں۔ ان کے والد گرامی قاضی محمد اکرم بھی عالم و فقیہ اور متورع و متقی ہیں۔

ان ہی قاضی حماد الدین نے مفتی رکن الدین اور ان کے بیٹے مولانا داؤد کو یہ خدمتِ علمی انجام دینے پر مامور کیا اور کہا کہ وہ ایک ایسی کتاب مرتب کریں جو

ان مسائل فقہی پر مشتمل ہو جن پر جمہور فقہا کا اجماع ہے اور جس کے مندرجات عقل و درایت کی میزان پر پورا اترتے ہیں۔ چنانچہ بڑی محنت اور تلاش و کاوش سے انھوں نے ایک کتاب مرتب کی جس کو قاضی حماد الدین کی طرف منسوب کر کے فتاوی حمادیہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ فتاوی حمادیہ میں دو سو سولہ کتابوں سے مسائل مستنبط و مستخرج کیے گئے ہیں، جن میں سے چند کتابوں کے نام گزشتہ سطور میں بیان کیے جا چکے ہیں۔

نویں صدی ہجری کی یہ فقہی کتاب، جو ارض ہند میں مرتب کی گئی، اب بھی دنیا کے مختلف کتب خانوں میں مخطوطے کی صورت میں موجود ہے۔ جہاں تک ہمارے معلومات کا تعلق ہے، اس قلمی کتاب کے دنیا کی حسب ذیل سات لائبریریوں میں چودہ نسخے محفوظ ہیں۔

۱۔ اس کا ایک نسخہ پاکستان میں ہے جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے شیرانی کلکشن میں موجود ہے۔ اس کا نمبر ۳۹۰۹ ہے۔ یہ ۴۳۰ اوراق کو محیط ہے۔ سطور فی صفحہ ۲۱ سے ۲۳ تک ہیں۔ کتاب کے اکثر حصے اچھی حالت میں ہیں اور آسانی سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ آخر کے بعض مقامات کرم خوردہ ہیں۔ شروع میں غلام علی رضوی کی مہر ہے۔

۲۔ انڈیا آفس لائبریری لندن میں اس کے تین نسخے ہیں، جن کے نمبر علی الترتیب ۱۶۸۹، ۱۶۹۰ اور ۱۶۹۱ ہیں۔ پہلا نسخہ خط نسخ میں ہے جو اٹھارھویں صدی میں دہلی میں لکھا گیا۔ اس کے مختلف مقامات پر حواشی بھی ہیں۔ دوسرے نسخے کا سال کتابت ۱۸۲۲ء ہے۔ یہ خط نستعلیق میں ہے اور دہلی کا کتابت شدہ ہے۔ اس کے بعض مقامات پر حواشی ہیں اور کچھ صفحات ضائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا نسخہ ۱۶۹۰ء کا مکتوبہ ہے۔ یہ بھی خط نستعلیق میں ہے اور اس کے بھی چند مقامات پر حواشی ہیں جو مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے ہیں اور بہت سے فقہی نکات پر مشتمل ہے۔[1]

---

[1] کیٹلاگ آف انڈیا آفس لائبریری، ج ۲، جز ۲۔ فقہ ص ۲۷۲، ۲۷۳۔

۳- کتب خانہ خدیویہ مصر میں اس کے دو نسخے ہیں - اس کا ایک نسخہ خطِ نسخ میں ہے اور کاتب ابراہیم بن محمد از نوطی ہے - اس کی کتابت جمعرات کے روز ۳ ربیع الاول ۱۲۰۷ھ کو مکمل ہوئی [101] دوسرے نسخے کے بارے معلومات حاصل نہیں ہو سکے۔

۴- مانچسٹر لائبریری میں بھی یہ کتاب موجود ہے - اس کا کاتب بدھ کے روز بعد از اشراق ۲۵ صفر ۱۲۰۹ھ (۱۷۹۴ء) کو اس کی کتابت سے فارغ ہوا - اس نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے :

احقر العباد جعفر بن مرحوم قاضی غلازیول -

اس کے ابتدا اور آخر میں ایک مہر ہے جس میں ۱۲۰۴ھ / ۱۷۸۹ء و مبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہٗ احمد اور احمد بن محمد درویش کے الفاظ کندہ ہیں - یہ کتاب ہندوستان کے بہترین خطِ نسخ میں لکھی گئی ہے - الفاظ صاف اور نمایاں ہیں اور بالکل آسانی سے پڑھے جا سکتے ہیں [102]

۵- بانکی پور لائبریری میں بھی یہ کتاب موجود ہے اور اس کا نمبر ۲۲۷۳ ہے - یہ نسخہ ناقص الآخر ہے - تاریخ کتابت درج نہیں - غالباً بارھویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے - [103]

۶- رام پور لائبریری میں اس کے دو نسخے ہیں - ایک نسخے کا نمبر ۳۶۲ ہے اور خطِ نسخ میں ہے - صفحات ۵۹۰ ہیں - دوسرا نسخہ خطِ نستعلیق میں ہے - صفحات ۷۱۰ ہیں اور نمبر ۳۶۳ ہے [104]

۷- کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں اس کے چار نسخے ہیں جن کے نمبر علی الترتیب

---

[101] فہرست کتب خانہ خدیویہ - مصر، ج ۳، ص ۸۸

[102] کیٹلاگ مانچسٹر لائبریری - حصہ عربی فقہ - کالم نمبر ۳۲۴، ۳۲۶ - کتاب نمبر ۲۰۴

[103] کیٹلاگ آف بانگی پور لائبریری، ج ۱۹، جز ۲، ص ۲۰

[104] فہرست کتب عربی - کتب خانہ رام پور، ص ۳۳۲، مطبوعہ مئی ۱۹۰۲ء

۱۸، ۱۹، ۱۰۵ اور ۱۰۶ ہیں۔ نمبر ۱۸ بہت عمدہ خط نسخ میں ہے۔ سن تحریر اور نام کاتب مرقوم نہیں۔ البتہ ابتدائے کتاب میں سال خریداری ۱۲۵۹ھ لکھا ہے۔ غالباً تیرھویں صدی ہجری کے شروع کا مکتوبہ ہے۔ کل اوراق ۳۱۴ ہیں اور ہر صفحہ کی ۲۳ سطور ہیں۔

نسخہ نمبر ۱۹ آدھا خطِ نسخ میں ہے اور آدھا نستعلیق میں۔ مگر بظاہر ایک ہی شخص کا کتابت شدہ معلوم ہوتا ہے۔ ۱۰۸۴ھ کا مکتوبہ ہے۔ کاتب کا نام مرقوم نہیں۔ کل اوراق ۱۵۷ ہیں اور سطور فی صفحہ ۲۷ ہیں۔

نسخہ نمبر ۱۰۵ خطِ نستعلیق میں ہے۔ نام کاتب اور سالِ کتابت درج نہیں۔ جملہ اوراق ۲۴۲ ہیں اور سطور فی صفحہ ۲۵۔

نسخہ نمبر ۱۰۶ خط نستعلیق میں ہے۔ نام کاتب اور سالِ کتابت درج نہیں۔ البتہ وسطِ کتاب اور آخر میں ایک مہر ثبت ہے جس پر قاضی معین الدین کے الفاظ کندہ ہیں۔ ورق اوّل پر سالِ خرید ۱۲۰۷ھ مرقوم ہے۔ بظاہر یہ نسخہ گیارھویں صدی ہجری کے وسط کا کتابت شدہ معلوم ہوتا ہے۔ کل اوراق ۴۰۰ اور سطور فی صفحہ ۱۷ ہیں۔[۱۰۵]

کتب خانہ خدیویہ مصر کی کتب فہرست میں یہ الفاظ بھی لکھے ہیں کہ یہ کتاب ۱۲۴۱ھ میں ہندوستان میں چھپ چکی ہے۔

بانکی پور لائبریری کے کیٹلاگ میں مرقوم ہے کہ یہ کتاب ۱۲۴۱ھ میں کلکتہ میں شائع ہو چکی ہے۔

کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں یہ الفاظ درج ہیں کہ یہ کتاب ہندوستان میں چھپ چکی ہے۔

فتاویٰ حمادیہ فقہ کی ایک اہم کتاب ہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں اس کا جو نسخہ موجود ہے وہ ان سطور کے راقم کی نظر سے گزر چکا ہے۔ یہ کتاب حسبِ ذیل مضامین و مندرجات پر مشتمل ہے۔

۱۰۵۔ فہرست شروح بعض کتب نفیسہ قلمیہ (حصہ دوم) مخزونہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن، ص ۱۳۲، ۳۴

کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم، کتاب الحج، کتاب النکاح، کتاب الطلاق، کتاب العتاق، کتاب الایمان، کتاب الحدود والسرقہ، کتاب السیر، کتاب اللقیط و اللقطۃ، کتاب الاباق، کتاب المفقود، کتاب الشرکۃ، کتاب الوقف، کتاب البیوع، کتاب الکفالۃ کتاب الحوالۃ، کتاب الدعویٰ، کتاب الاقرار، کتاب الصلح، کتاب المضاربۃ، کتاب الودیعۃ، کتاب العاریۃ، کتاب الہبۃ، کتاب الاجارۃ، کتاب الاکراہ، کتاب الحجر، کتاب الغصب کتاب الشفعۃ، کتاب القسمۃ، کتاب المزارعۃ، کتاب الصید والذبائح، کتاب الاضحیۃ، کتاب الاستحسان، کتاب احیاء الموات والشرب، کتاب الرہن، کتاب الجنایات، کتاب الوصایا، کتاب الفرائض۔

فہرست مضامین سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں حصہ عبادات بھی ہے اور حصہ معاملات بھی! یہ کتاب برصغیر پاک و ہند کا ایک اہم علمی اور فقہی سرمایہ ہے[۱۰۶]

نہروالہ کے قاضی القضاۃ قاضی حماد الدین گجراتی، فتاویٰ حمادیہ کے مصنف کے معاون، مفتی داؤد بن مفتی رکن الدین ناگوری، فتاویٰ حمادیہ کے مصنف مفتی رکن الدین ناگوری اور قاضی حماد الدین گجراتی کے والد مکرم قاضی محمد اکرم گجراتی کے مفصل حالات معلوم نہیں ہو سکے جو معلوم ہو سکے ہیں وہ علامہ سید عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ کی تصنیف نزہۃ الخواطر میں مرقوم ہیں اور یہ اسی قدر ہیں، جس قدر کہ فتاویٰ حمادیہ کے مقدمہ میں مندرج ہیں[۱۰۷]

ز

۳۷- شیخ زین الدین عربی

شیخ زین الدین بن بدر الدین صوفی عربی، عالم و فاضل بزرگ تھے اور فقہ

---

[۱۰۶] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: راقم الحروف کی تصنیف "برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ" مقالہ فتاویٰ حمادیہ، ص ۱۲۶ تا ۱۶۶

[۱۰۷] ملاحظہ ہو: نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۵۱، ۶۸، ۷۱، ۱۵۷۔

تصوف اور فنون ادبیہ میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ سلوک و طریقت میں بھی درجۂ ممتاز پر فائز تھے اور اس ضمن میں شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری سے فیض یافتہ تھے۔ طویل عرصہ ان کی صحبت و ملازمت میں بسر کیا تھا۔ فارسی زبان میں ان کی ایک تصنیف بھی ہے جو راحۃ القلوب کے نام سے موسوم ہے۔ یہ کتاب ان کے شیخ (شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری) کے حالات و ملفوظات پر مشتمل ہے اور حمد و سپاس بے قیاس الخ کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے [۱۰۸]

ان کا شمار بھی نویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند کے ان علمائے عظام کی جماعت میں ہوتا ہے، جنھوں نے علم فقہ باقاعدہ اساتذہ سے پڑھا تھا اور اس میں اپنا ایک مقام بھی رکھتے تھے لیکن اس موضوع میں ان کی کوئی تصنیف ہم تک نہیں پہنچی اور بعد میں ان کا زیادہ تر وقت اصحاب طریقت و تصوف ہی کی صحبت و ملازمت میں گزرا۔

س

۳۷۔ شیخ سارنگ لکھنوی

شیخ سارنگ صوفی دہلوی ثم لکھنوی، حنفی المسلک تھے۔ اپنے وقت کے مرد صالح اور فقیہ تھے۔ ابتدا میں سلطان فیروز شاہ دہلوی والی ہند کے معزز امرا میں سے تھے۔ علاقہ مالوہ میں ملک ہند کا شہر سارنگ پور ان ہی نے تعمیر اور آباد کیا، جس نے بعد میں بڑی شہرت حاصل کی۔

شیخ سارنگ سلطان فیروز شاہ کے حلقۂ امرا میں شامل تھے کہ ایک مشہور بزرگ شیخ قوام الدین بن ظہیر الدین عباسی کُردی سے منسلک ہو گئے اور ان کی صحبت و ملازمت سے اس درجہ اثر پذیر ہوئے کہ ان پر جذب و سکر کی کیفیات

---

۱۰۸ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۷۲، ۷۴۔

طاری ہونے لگیں۔ اسی اثنا میں حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا اور حرمین شریفین کی زیارت سے متمتع ہوئے۔ بعد ازاں دیگر مشائخ کی خدمت میں بھی طویل عرصہ تک رہے۔

ان کی وفات ۱۶ شوال ۸۵۵ھ کو ہوئی۔ قبر صوبہ یوپی کے موضع مجھگوہ میں ہے جو مضافات بسوہ میں واقع ہے فنلہ

۳۸- شیخ سراج الدین کالپوی

شیخ سراج الدین حنفی صوفی کالپوی سراج الحریق کے نام سے معروف تھے۔ اپنے دور کے فقیہ اور صالح بزرگ تھے۔ مولانا خواجگی دہلوی کالپی کے شاگرد تھے۔ طریقت و تصوف سے بھی لگاؤ تھا اور اس سلسلے میں مخدوم جہانیاں جہاں گشت شیخ جلال الدین حسین بن احمد حسینی بخاری سے فیض یافتہ تھے فنلہ

شیخ سراج الدین کالپوری، وہ بزرگ ہیں جنھیں علم فقہ سے لگاؤ اور تعلق تو تھا مگر غالباً اس موضوع سے متعلق کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔

۳۹- شیخ سراج الدین گجراتی

شیخ سراج الدین بن علامہ کمال الدین دہلوی گجراتی، عابد و زاہد بھی تھے اور فقیہ بھی۔ اپنے والد مکرم علامہ کمال الدین دہلوی سے علم فقہ کی تکمیل کی اور ان ہی سے طریقہ چشتیہ کے مطابق تصوف میں لگاؤ پیدا ہوا۔

علامہ کمال الدین کا اصل مشغلہ درس و تدریس تھا۔ شیخ سراج الدین نے بھی والد کی وفات کے بعد مسند درس کو رونق بخشی اور ان سے ان کے بیٹے

فنلہ اخبار الاخیار، ص ۱۵۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۳، ص ۷۶، ۷۷۔ الفوائد السعدیہ

فنلہ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۷۷۔ خزینۃ الاصفیاء۔ اخبار الاخیار، ص ۶۳، ۶۴۔

شیخ علم الدین اور دوسرے لوگوں نے استفادہ کیا۔
شیخ سراج الدین کی وفات ۱۹ جمادی الاولیٰ ۸۱۷ھ کو سرزمین گجرات کے مشہور شہر نہر والہ میں ہوئی اور وہیں دفن کیے گئے [۱۱۱]
یہ برصغیر پاک و ہند کے وہ فقیہ نامدار ہیں جنھوں نے اگرچہ اس علم میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ تاہم ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے جنھوں نے ان سے باقاعدہ یہ علم حاصل کیا۔

۴۰۔ شیخ سعد الدین خیرآبادی

شیخ سعد الدین بن قاضی بڈھن بن شیخ محمد قدوائی انامی خیرآبادی، بہت بڑے عالم اور اپنے وقت کے نامور بزرگ تھے۔ فقہ، اصول فقہ، علوم عربیہ، نحو اور تصوف میں یگانۂ روزگار تھے۔ ان کے والد قاضی بڈھن خیرآباد کے منصب قضا پر متعین تھے۔ سعد الدین ابھی عالم طفولیت ہی میں تھے کہ سایۂ پدری سر سے اٹھ گیا۔ باپ کی وفات کے بعد آغوش مادر میں تربیت پائی اور حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر اس دور کے عظیم فقیہ اور عالم دین شیخ محمد اعظم بن ابوالبقا لکھنوی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے اور علم حاصل کیا۔ حصول علم کے بعد طریقت و تصوف کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے لیے شیخ محمد مینا [۱۱۲] بن قطب الدین لکھنوی کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھے۔ پورے بیس سال ان کی خدمت میں حاضر رہے اور اس راہ کی تمام منازل پر عبور حاصل کیا۔ حتیٰ کہ شیخ کی وفات کے بعد لکھنؤ شہر میں ان کی مسند خلافت پر متمکن ہوئے اور عرصہ دراز

---

[۱۱۱] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۷۷۔ بحوالہ مجمع الابرار
[۱۱۲] ان کا اسم گرامی شیخ محمد تھا لیکن شاہ مینا کے نام سے معروف تھے۔ سال وفات ۸۷۰ھ ہے اور شاہ مینا روڈ، متصل میڈیکل کالج روڈ لکھنؤ میں مدفون ہیں۔

تک لوگوں پر راہِ تصوف کی کٹھن منزلوں کے پوشیدہ راز منکشف فرماتے رہے۔ بعد ازاں لکھنؤ سے خیر آباد منتقل ہوگئے اور وہاں ایک بہت بڑی خانقاہ تعمیر کی جس کو تصوف و طریقت کے مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

جو حضرات ان کے فیضِ صحبت سے تصوف کی راہوں پر گام فرسا ہوئے اور جنھوں نے ان سے انسلاک اختیار کر کے اس چشمۂ صافی سے سیراب ہونے کا شرف حاصل کیا، ان میں شیخ عبدالصمد بن علم الدین سائنپوری، شیخ اللہ داد رغنوی، شیخ صفی الدین، شیخ مبارک سندیلوی، شیخ سالار، سید صفی الدین انبالوی، شیخ اللہ دیا اور بہت سے حضرات شامل ہیں۔

شیخ سعد الدین خیر آبادی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو صرف تصوف و طریقت ہی کے حوالے نہیں کر دیا تھا بلکہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف سے بھی پورا تعلق رکھا۔ ان کی تصنیفات کا دائرہ بہت وسیع تھا جس میں علم فقہ، اصول فقہ، علم نحو اور علم تصوف وغیرہ سب علوم شامل ہیں۔ شرح بزدوی، شرح حسامی، شرح کافیہ، شرح مصباح اور شرح رسالہ ملکیہ ان کی مشہور مصنفات ہیں۔ شرح جامی پر بھی ان کے مفید حواشی ہیں۔

شیخ سعد الدین علم و فضل کی فراوانی کے علاوہ بہت بڑے مہمان نواز بھی تھے۔ جو کچھ آتا لوگوں میں تقسیم کر دیتے اور کوئی چیز اپنے پاس نہ رکھتے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جس دن وہ فوت ہوئے، گھر میں کفن کے لیے بھی کچھ موجود نہ تھا۔

برصغیر پاک و ہند کے اس معروف فقیہ اور جید عالم دین نے ۸۰۲ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور خیر آباد میں دفن کیے گئے۔[113]

---

[113] اخبار الاخیار، ص ۱۹۳، ۱۹۴۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۴۰۱، ۴۰۲۔ ابجد العلوم ص ۸۹۴۔ انوار العارفین، ص ۵۸، ۵۹، ۴۴۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۷۵، ۷۶۔ تاریخ الاولیا، ج ۲، ص ۲۲۶، ۲۲۷۔ سبحۃ المرجان، ص ۴۲۔ ماثر الکرام، دفتر اوّل، ص ۱۷۴۔ عین الولایت لسراج الہدایت، ص ۴۵ – ۵۲۔ حدائق الحنفیہ، ص ۳۳۶۔ سیر العلما، ص ۱۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۷۸ – ۷۹۔

۴۱۔ شیخ سعد الدین لکھنوی

شیخ سعد الدین بن شیخ الاسلام سعد اللہ بن قاضی سماء الدین بکری، بجنوری لکھنوی، صالح عالم دین اور شیخ وقت تھے۔ ان کے پانچ بھائی اور تھے جو ان سے عمر میں چھوٹے تھے۔ یہ اپنے باپ کے چھوٹے بیٹے تھے جو بعض امور میں اپنے دیگر بھائیوں سے مختلف رجحانات رکھتے تھے۔ لکھنو سے چار میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں پیدا ہوئے جو بجنور کے نام سے موسوم تھا اور اسی گاؤں میں نشوو نما پائی۔ حصولِ علم کے بعد درس و تدریس کی صورت میں علوم دینیہ کی نشر و اشاعت اور افادۂ عام میں مشغول ہو گئے۔ ان کے حلقۂ درس کی وسعتوں کا یہ حال تھا کہ دور دراز کے علاقوں سے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور علمی استفادہ کرتے۔ جامع علوم ظاہری اور ماہر علوم باطنی تھے۔ تدریس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ طلبا ان سے بہت متاثر ہوتے اور ان کے مباحثِ علمیہ کو نہایت غور سے سنتے۔ منتہی اور ذہین طلبا بالخصوص ان کی طرف رجوع کرتے۔

شیخ سعد الدین شاعر بھی تھے۔ سعدی تخلص کرتے تھے اور بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔ ان کے چند اشعار یہ ہیں:

چوں داری مونسے چوں قل ہو اللہ خطی در کش بگرد ماسوی اللہ

چوں دوست موافق است سعدی سہل است جفائی ہر دو عالم

گریہ بر عیوب کس نکنی خندہ بر عیب دیگراں چہ زنی

اس نامور عالم دین نے ۲۹ جمادی الاولیٰ ۸۸۱ھ کو وفات پائی۔ ان کے ایک شاگرد نے "مخدوم قطب الاولیا" تاریخ وفات نکالی ہے[1]۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند، ص ۷۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۳، ص ۷۹۔

۴۲۔ شیخ سعد اللہ کنتوری

شیخ سعد اللہ بن محمد متوکل کنتوری۔ مرد صالح اور اپنے وقت کے فقیہ تھے۔ مہد علم اور آغوش دین میں پرورش پائی۔ والد مکرم شیخ محمد متوکل اور شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی سے استفاضہ کیا اور اپنے دور کے مشہور مشائخ میں سے گردانے گئے۔ بڑے عابد و زاہد اور قناعت پسند تھے۔ اپنی ضروریات کا دامن بہت ہی محدود اور مختصر کر لیا تھا۔

ایک روایت کے مطابق انھیں شیخ اشرف جہاں گیر بن ابراہیم سمنانی سے بھی شرف اجازہ حاصل تھا۔ اس معروف عالم دین نے اپنے والد گرامی شیخ محمد متوکل کی زندگی ہی میں ۸۰۶ھ کو انتقال کیا[۱۱۵]

نویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند کے یہ وہ عالم دین اور فقیہ تھے جن کی علم فقہ یا دیگر موضوع سے متعلق کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔ ان کا شمار فقہائے برصغیر کی اس جماعت میں ہوتا ہے جو مسائل فقہیہ اور کتب فقہ پر تو عبور رکھتے تھے اور طلبا کو اس کا درس بھی دیتے تھے مگر اس باب میں ان کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چلتا۔

۴۳۔ شیخ سلام اللہ مندوی

شیخ سلام اللہ مندوی عالم کبیر اور شیخ الوقت تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے جلیل القدر علما میں سے تھے۔ حاکم مالوہ محمود شاہ خلجی کے عہد کے عالم دین تھے اور یہ حکمران ان کے علم و فضل کی ہمہ گیری سے حد درجہ متاثر تھا۔ وہ ان کی انتہائی تکریم کرتا تھا اور اس نے ان کو سید العلما کا خطاب دیا تھا[۱۱۶]

---

۱۱۵ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۸۰۔ بحوالہ البحر الزخار و خزینۃ الاصفیا۔

۱۱۶ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۸۱۔ بحوالہ تاریخ فرشتہ

ان کا شمار بھی غالباً نویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند کے ان ہی فقہا اور اصولیین میں ہوتا ہے جو کتب فقہ اور مسائل فقہ پر عبور رکھنے کے باوجود اس اہم موضوع سے متعلق کسی کتاب کے مصنف نہیں تھے۔ یا تھے بھی تو ہمیں ان کی کسی تصنیف کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہیں۔

۴۴۔ قاضی سناء الدین غزنوی

قاضی سناء الدین کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ سناء الدین بن نظام الدین بن صدر الدین حسین زینبی غزنوی ثم مچھلی شہری۔ یہ عالم و فقیہ اور شیخ وقت تھے۔ غزنی میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ اپنے والد شیخ نظام الدین کے ساتھ ۸۱۷ھ میں وارد ہند ہوئے اور مچھلی شہر میں سکونت اختیار کی۔ شیخ نظام الدین چوں کہ علم و فضل سے بہرہ ور تھے، اس لیے انھیں مچھلی شہر کا قاضی مقرر کیا گیا۔ ان کی وفات کے بعد وہاں کی مسند قضا ان کے بیٹے قاضی سناء الدین کے سپرد کی گئی، جن کا شمار اس دور میں فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے جید علما میں ہوتا تھا۔[۱۷۱]

قاضی سناء الدین غزنوی کا اسم گرامی بھی برصغیر پاک و ہند کے ان ہی فقہائے کرام میں شامل ہے جن کی کسی تصنیف کا سراغ نہیں مل سکا۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ فقہ اور اس کے متعلقات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تذکرہ نگار انھیں فقیہ اور اصولی قرار دیتے ہیں۔

ش

۴۵۔ شیخ شمس الدین اودھی

شیخ شمس الدین اودھی گجراتی، نیک طینت اور خوش خصال فقیہ تھے۔ ان کا شمار

---

[۱۷۱] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۸۲

ان بلند بخت فقہائے ہند میں ہوتا ہے جو فضل و صلاح میں ممتاز درجہ پر فائز تھے۔ ایک گاؤں "اونہ" کے رہنے والے تھے، جو سرزمین گجرات میں، اعمال سورت میں واقع تھا۔ ان کی تاریخ ولادت کا علم نہیں ہو سکا۔ البتہ تذکروں میں تاریخ وفات مرقوم ہے، جو یکم شعبان ۸۰۴ھ ہے[۱۱۸]

شیخ شمس الدین اونوی گجراتی کا شمار برصغیر پاک و ہند کے ان فقہائے کرام میں ہوتا ہے، جو اگرچہ علم وفضل اور فقہ و دانش کے اعتبار سے بلند مرتبے کے حامل تھے، مگر انھوں نے اس موضوع کے بارے میں کوئی کتاب اپنی یادگار نہیں چھوڑی۔

۴۶۔ شیخ شہاب الدین اودھی

شیخ شہاب الدین اودھی عالم و فقیہ تھے اور قاضی قدوۃ الدین اسرائیلی اودھی کی اولاد سے تھے۔ ذکاوت فکر اور حدت ذہن کا یہ حال تھا کہ لوگ "انھیں" پرکالۂ آتش کہتے تھے۔ انھوں نے طریقہ مداریہ کے امام شیخ بدیع الدین مدار مکنپوری سے علم طریقت حاصل کیا اور پھر یہ کیفیت طاری ہوئی کہ منصب قضا چھوڑ دیا اور کتابیں دریائے گنگا میں غرق کر دیں۔ ان کی قبر سرزمین اودھ کے ایک قریہ "بڑا گاؤں" میں ہے[۱۱۹]

نویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند کے اس عالم دین اور ماہر فقہ کے حالات کا افسوس ہے، اس سے زیادہ علم نہیں ہو سکا۔

ص

۴۷۔ مولانا صدر جہان گجراتی

مولانا صدر جہان گجراتی اپنے وقت کے شیخ اور بہت بڑے فاضل تھے۔ ان کا

---

[۱۱۸] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۴۲۔ بحوالہ مرآۃ احمدی [۱۱۹] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۸۷

شمار اس دور کے جید علمائے فقہ، مشہور ماہرین اصول اور معروف اصحاب کلام میں ہوتا ہے۔ درس و تدریس اور افادۂ عوام ان کا اصل مشغلہ تھا۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا جن میں شیخ احمد بن برہان بن ابو محمد غوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔[۱۲۰]

ان کے معاصرین میں شیخ محمد بن عبد اللہ حسینی بخاری کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔[۱۲۱] بعض مسائل میں یہ شیخ محمد بن عبد اللہ پر سخت تنقید کرتے تھے۔ بعد میں ان سے ملاقات ہوئی اور چند مسائل کلامیہ میں باہمی گفتگو کا موقع ملا تو یہ ان کے فضل و کمال سے متاثر ہوئے اور ان کا اعتراف کیا۔[۱۲۲]

---

۱۲۰ شیخ احمد بن برہان بن ابو محمد بن ابراہیم بن محمد غوری گجراتی، شاہان غوریہ کی نسل سے تھے۔ گجرات میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ شیخ صدر جہان گجراتی سے علم حاصل کیا اور شیخ محمد بن عبد اللہ حسینی بخاری سے طریقت و تصوف کا درس لیا۔ ایک عرصہ تک ان کی ملازمت و صحبت سے فیض یاب ہوتے رہے، یہاں تک کہ مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ ان سے بے شمار لوگوں نے ظاہری اور باطنی فیوض حاصل کیے۔ اپنے شیخ (محمد بن عبد اللہ حسینی بخاری) کی وفات کے بعد چونسٹھ (۶۴) سال کی عمر پاکر ۲۲ ربیع الاول ۸۲۸ھ کو فوت ہوئے اور احمد آباد کے قریب تاج پور میں دفن کیے گئے۔ بعض لوگوں نے ان کی تاریخ وفات "آخر الاولیاء" نکالی ہے۔ (نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۵۰۔

نیز ملاحظہ ہو: مرأت احمدی۔

۱۲۱ شیخ محمد بن عبد اللہ بن محمود بن حسین حسینی بخاری، کو سراج الدین ابو البرکات گجراتی بھی کہتے ہیں۔ یہ شاہ عالم کے نام سے مشہور تھے۔ ۱۷ ذی القعدہ [illegible]ھ کو گجرات میں پیدا ہوئے۔ وہیں پہلے پڑھے اور شیخ سراج الدین علی گجراتی اور دیگر علما سے تعلیم حاصل کی۔ اپنے والد شیخ احمد بن عبد اللہ مغربی سے طریقت کا درس لیا۔ بڑے بارعب اور صاحب عز و جاہ بزرگ تھے۔ ملوک و امرا ان کے سامنے گردن جھکا کر پورے ادب کے ساتھ دو زانو ہو کر بیٹھتے تھے۔ ۲۰ جمادی الاخری ۸۸۰ھ کو ترسیٹھ (۶۳) سال کی عمر پاکر انتقال کیا۔ (نزہۃ الخواطر، ج ۳ ص ۱۳۸، ۱۳۹۔ بحوالہ مرأت احمدی)

۱۲۲ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۸۹۔ بحوالہ مرأت احمدی۔

۴۸- شیخ صفی الدین ردولوی

شیخ صفی الدین بن نصیر الدین بن نظام الدین ردولوی - نویں صدی ہجری کے دیارِ ہند کے عظیم المرتبت عالم اور فاضل کبیر تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ ان کے جدِ امجد شیخ نظام الدین اصلاً غزنی کے باشندے تھے جو ہلاکو خاں کے زمانے میں بعہد سلطان علاء الدین خلجی ہندوستان تشریف لائے اور دہلی میں اقامت گزین ہوئے۔ ان دنوں قاضی شہاب الدین احمد بن شمس الدین عمر دولت آبادی بھی دہلی میں قیام پذیر تھے اور ان کا آبائی وطن بھی غزنی تھا اور یہ سب لوگ قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔ بعد ازاں دہلی پر مغل حکمران تیمور لنگ کے حملے کا خطرہ پیدا ہوا تو قاضی شہاب الدین اور شیخ نظام الدین دہلی کی سکونت ترک کرکے جون پور چلے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب جون پور کے تختِ حکومت پر سلطان ابراہیم شرقی متمکن تھا اور یہ بادشاہ بڑا نیک، رحم دل اور علم و علما کا قدر دان تھا۔ اس بادشاہ نے ان کی بہت پذیرائی کی اور ان کے اکرام و احترام میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ شیخ نظام الدین علم و فضل سے بھی بہرہ ور تھے اور نیکی و صالحیت کے زیور سے بھی آراستہ تھے۔ ان کے بیٹے شیخ نصیر الدین بھی علم اور تقویٰ کی دولت سے مالا مال تھے۔ اس سے اثر پذیر ہو کر قاضی شہاب الدین نے اپنی ایک بیٹی شیخ نصیر الدین کے عقد میں دے دی۔ ان کی اس بیٹی سے شیخ نصیر الدین کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے، جن کے نام صفی الدین، فخر الدین اور رضی الدین تھے۔ ان تینوں کی تربیت ان کے نانا قاضی شہاب الدین کے ہاں ہوئی اور ان ہی سے انھوں نے اخذِ علم کیا۔ ان تینوں بھائیوں میں سے شیخ صفی الدین اپنے دور میں ارضِ ہند کے بلند پایہ عالم تھے اور علم و حکمت میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔

یہ بحرِ طریقت کے بھی شناور تھے اور اس سلسلے میں شیخ اشرف جہاں گیر بن ابراہیم سمنانی سے تعلقِ ارادت رکھتے تھے جنھوں نے اپنے اس مرید کے علم و تحقیق کی

وسعت پذیری اور ہمہ گیری سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ میں نے بلادِ ہند میں صفی الدین سے بڑھ کر علوم و فنون کے مختلف گوشوں میں مہارت و عبور رکھنے والا اور کوئی شخص نہیں دیکھا۔ اس ضمن میں مولانا سیّد عبدالحی لکھنوی نے لطائف اشرفیہ کے حوالے سے نزہۃ الخواطر میں ان کے یہ الفاظ درج کیے ہیں:

ما رأیت فی بلاد الهند من یتحلی بغرائب الفنون و عجائب الشئون غیر الصفی۔[۱۲۲۳]

میں نے بلادِ ہند میں صفی الدین کے علاوہ ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جو علوم و فنون کے عجائب و غرائب سے آراستہ ہو۔

یہ علوم متداولہ میں متبحر کامل تھے اور کتب عربیہ و فارسیہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ پھر متون کے علاوہ شروح پر بھی ان کی عمیق نگاہ تھی۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ بہت بڑے مصنف اور فنون کی مختلف کتابوں کے شارح تھے۔ چنانچہ درج ذیل کتابیں ان کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

۱۔ دستور المبتدی: یہ علمِ صرف کی مشہور کتاب ہے جو باقاعدہ درسِ نظامیہ میں شامل اور دینی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس میں علم صرف کے مسائل اور مختلف قواعد بہترین اور آسان پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب انھوں نے اپنے لڑکے شیخ ابوالمکارم اسماعیل کے لیے تصنیف کی۔

۲۔ حل التراکیب کافیہ: یہ علم نحو سے متعلق علامہ ابنِ حاجب کی معروف کتاب کافیہ کے بعض پیچیدہ اور مشکل مسائل کی شرح ہے۔

۳۔ غایۃ التحقیق: یہ کتاب کافیہ کی مفصل اور بہترین شرح ہے۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس کی تعریف کی ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

وھو شرح ممزوج، اولہ الحمد للہ الذی انعم علینا بنعمہ العظام الخ۔

۱۲۲۳ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۹۰

وھو من تلامذۃ الھندی، ذکرہ فیہ ومدح حاشیتہ وقال ان شروح الکافیۃ لیست بوافیۃ الاحواشی استاذنا شہاب الدین احمد بن عمر الدولت آبادی، وکثیر من الناس اکتفوا بما فہموہ من ظاہرھا فانہ حقق فیھا وسماھا غایۃ التحقیق[۱۲۴]

یعنی کافیہ کی یہ شرح مختلف مسائلِ نحو کا امتزاج ہے۔ اس کا آغاز الحمد للہ الذی انعم علینا بنعمہ العظام ..... الخ کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ شیخ صفی الدین ردولوی شیخ شہاب الدین (دولت آبادی) ہندی کے تلامذہ میں سے تھے۔ اس نسبتِ تلمذ کا انھوں نے ذکر بھی کیا ہے اور حاشیہ کتاب میں ان کی تعریف بھی کی ہے اور لکھا ہے کہ کافیہ کی تمام شرحیں ملا کر بھی کافی ثابت نہیں ہو سکتیں۔ کافیہ کو سمجھنے کے لیے صرف ہمارے استاذ شیخ شہاب الدین احمد بن عمر دولت آبادی کی شرح ہی کفایت کرتی ہے۔ غایۃ التحقیق میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اہلِ علم کی اکثریت نے اس کو کافی سمجھا ہے۔ اس میں مصنف نے بہت تحقیق سے کام لیا ہے۔ اور اس کا نام ہی غایۃ التحقیق رکھا ہے۔

شیخ صفی الدین ایک عرصہ تک درس و تدریس میں مشغول رہے اور بے شمار حضرات نے ان سے کسب علم کیا۔

اس ممتاز عالم، مصنف اور فقیہ نے ۱۳ ذی القعدہ ۸۱۹ھ کو وفات پائی[۱۲۵]

۴۹۔ شیخ صلاح الدین گجراتی

شیخ صلاح الدین بن طالب گجراتی، فقیہ اور شیخ صالح تھے۔ پہلے ان کے والد مذہباً ہندو تھے اور بُت پرستی کرتے تھے۔ ان کا نام توکا جیو تھا۔ وہ شیخ احمد بن عبداللہ مغربی کے ہاتھ پر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی بھی مسلمان

---

۱۲۴ کشف الظنون، ج ۲، ص ۱۳۷۵۔

۱۲۵ تذکرہ علمائے ہند، ص ۹۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۸۹، ۹۰۔ بحوالہ انوار الصفی۔

ہو گئیں۔ اس وقت وہ حاملہ تھیں، ان کے لڑکا پیدا ہوا تو اس کی اطلاع شیخ احمد بن عبداللہ مغربی کو دی اور ان سے درخواست کی کہ وہ خود ہی بچے کا نام رکھیں۔ چنانچہ شیخ نے اس کا نام صلاح الدین رکھا، جو آگے چل کر بہت بڑے عالم اور فقیہ ہوئے۔ والدین نے بچے کی بہتر طریق سے تربیت کی اور اس کو حصولِ علم کے لیے وقف کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ برصغیر پاک و ہند کے بہت بڑے عالم اور فقیہ ہوئے اور علم و معرفت میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔

انھوں نے ۱۳ ربیع الاول ۸۹۵ھ کو وفات پائی [۱۲۶]

ض

۵۰- شیخ ضیاء الدین رفاعی

شیخ ضیاء الدین رفاعی دیگلوری، علم و فقاہت میں ممتاز درجہ پر فائز تھے اور مشاہیر اصحاب فضل و صلاح میں سے تھے۔ ہندوستان آئے تو شیخ سعید الدین بن نجم الدین حسینی رفاعی کے پوتے شیخ جمع سے اخذ فیض کیا۔ شیخ ضیاء الدین نے دیگلور کے مقام پر سکونت اختیار کی جو اقلیم دکن کے علاقہ ناندیڑ میں ایک گاؤں ہے۔

انھوں نے ۸۰۲ھ میں انتقال کیا [۱۲۷]

ان کی کسی فقہی تصنیف کا تو علم نہیں ہو سکا، البتہ تذکرہ نگاروں نے انھیں عالم و فقیہ قرار دیا ہے۔

ع

۵۱- شیخ عبدالرحمٰن ہندی

شیخ عبدالرحمٰن بن احمد بن عبدالملک قریشی ہندی، اپنے زمانے کے شیخ اور

---

۱۲۶ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۹۰، ۹۱۔ بحوالہ مرآت احمدی و تاریخ الاولیا

۱۲۷ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۹۱۔ بحوالہ مہر جہاں تاب۔

جلیل القدر عالم تھے۔ دیار ہند سے ترک وطن کر کے مکہ مکرمہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ ان کا لقب وجیہہ الدین اور باپ کا لقب عمدۃ الدین تھا۔ بڑے باخبر، متدین اور متین بزرگ تھے۔ فقہ حنفی کے عظیم عالم تھے۔ ۷۷۵ھ میں یا اس سے کچھ عرصہ پہلے یا بعد مکہ مکرمہ گئے اور پھر وہیں مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی۔ وہیں شادی کی اور اللہ نے اولاد بھی عطا کی۔ جمعرات کے روز ۱۳ ربیع الاول ۸۲۷ھ کو وفات پائی اور قبرستان معلٰی میں دفن کیے گئے[۱۲۸]۔

۵۲۔ شیخ عبدالرزاق کچھوچھوی

شیخ عبدالرزاق کا سلسلۂ نسب بارھویں پشت سے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے، جو یہ ہے۔ عبدالرزاق بن عبدالغفور بن احمد بن محمد بن موسیٰ بن علی بن محمد بن حسین بن احمد بن محمد بن صالح بن عبدالرزاق بن شیخ عبدالقادر جیلانیؒ۔

شیخ عبدالرزاق شیخ اشرف جہاں گیر بن ابراہیم سمنانی کی خالہ کی بیٹی کے لڑکے تھے۔ خراسان میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ بارہ سال کی عمر کو پہنچے تو شیخ سید اشرف سمنانی کی صحبت و ملازمت اختیار کر لی اور وہ انھیں ہندوستان لے آئے۔ پھر ان ہی کے ہاں تربیت پائی اور علم و معرفت کی بلندیوں پر فائز ہوئے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جو اپنے دور کے صالح اور نامور فقیہ تھے۔ سید اشرف جہانگیر کی وفات کے بعد چالیس برس تک ان کی مسند پر زینت افروز رہے۔ ۷ ذی القعدہ ۸۴۸ھ کو کچھوچھہ کے مقام پر داعی اجل کو لبیک کہا اور وہیں دفن کیے گئے[۱۲۹]۔

۵۳۔ مولانا عبدالغنی مندوی

مولانا عبدالغنی مندوی ایک فاضل بزرگ، جید عالم دین اور جلیل القدر

---

[۱۲۸] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۹۱۔ بحوالہ طرب الاماثل

[۱۲۹] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۹۲۔ بحوالہ لطائف الاشرفیہ

انسان تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ سلطان احمد شاہ بہمنی کے عہد میں علاقہ برار کے عہدۂ صدارت پر متمکن تھے۔ ملوک و امرا کے نزدیک بڑی قدر و منزلت کے حامل تھے اور ہر اعتبار سے لائق تکریم سمجھے جاتے تھے۔ حق گو، دیانت دار اور بلند کردار تھے[130]۔

نویں صدی ہجری کے برصغیر کے اس نامور فقیہ کی نہ تو تاریخ وفات کا علم ہو سکا ہے اور نہ ان کی کسی تصنیف کا پتا چلا ہے۔ ان کا شمار فقہائے کرام کی اس جماعت میں ہوتا ہے جو اگرچہ کسی فقہی کتاب کے مصنف تو نہ تھے مگر مسائل فقہ پر عبور رکھتے تھے۔

۵۴۔ شیخ عبداللطیف ملتانی پٹنی

شیخ عبداللطیف بن جمال الدین بن سراج الدین بن صدر الدین عمری ملتانی ثم پٹنی گجراتی۔ شیخ وقت، عابد و زاہد اور عالم و فقیہ تھے۔ طریقت و سلوک سے گہری وابستگی رکھتے تھے اور اس ضمن میں شیخ برہان الدین عبداللہ بن محمود حسینی بخاری کے فیض یافتہ تھے۔ فقر و توکل ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ مستغنی المزاج تھے اور علائق دنیوی سے منقطع ہو کر زہد و عبادت میں مشغول ہو گئے تھے۔

مولانا سید عبدالحی لکھنوی نزہۃ الخواطر میں مرأت احمدی کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

وله تسعة كتب من المصنفات لم أقف على أسمائها[131]

کہ انھوں نے نو کتابیں تصنیف کیں لیکن مجھے ان کے ناموں کا علم نہیں ہو سکا۔

نویں صدی ہجری کے اس جلیل القدر ہندی فقیہ کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ ۴ رمضان المبارک کو فوت ہوئے، مگر یہ پتا نہیں چل سکا کہ کس سن میں راہی جنت فردوس ہوئے[132]۔

---

[130] تاریخ فرشتہ، ج ۲ ص ۵۰۱، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۹۳۔

[131] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۹۴۔ بحوالہ مرأت احمدی۔ [132] ایضاً

۵۵۔ شیخ عبداللطیف گجراتی

شیخ عبداللطیف بن محمود قرشی گجراتی، داور الملک کے خطاب سے مشہور تھے۔ سلطان محمود بن محمد گجراتی کے امرا میں سے تھے۔ صالح فقیہ، شیخ وقت اور عالم دین تھے۔ تصوّف سے بھی لگاؤ تھا اور شیخ محمد بن عبداللہ حسینی بخاری سے شرف ارادت و مصاحبت حاصل تھا۔ ایک عرصہ تک ان سے انسلاک رہا اور فیض یاب ہوئے۔ پھر ایک ایسا دور آیا کہ سلوک و تصوف کے سوا تمام امور سے قطع تعلق کر لیا۔

اس صوفی اور زاہد فقیہ کے متعدد کشوف و کرامات اور عجیب و غریب واقعات تذکروں میں مرقوم ہیں۔ انھیں ۱۳ ذی القعدہ ۸۹۰ھ کو شہید کیا گیا۔ بعض حضرات نے لفظ "ذی قعدۃ" سے تاریخ وفات نکالی ہے[۳۲]۔

ان کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چل سکا۔

۵۶۔ شیخ عبداللہ بن محمود حسینی بخاری

شیخ عبداللہ کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ عبداللہ بن محمود بن حسین بن احمد بن حسین حسینی بخاری۔ یہ شیخ برہان الدین کے لقب سے ملقب تھے اور کنیت ابو محمد تھی۔ لوگوں میں شیخ برہان الدین ابو محمد اوچی گجراتی کے نام سے معروف تھے اور ارض برصغیر کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ اپنے جدّ امجد شیخ جلال الدین حسین جہانیاں جہاں گشت کی وفات سے چار سال بعد ۱۴ رجب ۷۹۰ھ کو اوچ میں پیدا ہوئے۔ ابھی کاروان حیات نے دس ہی منزلیں طے کی تھیں کہ والد بزرگوار شیخ محمود وفات پا گئے۔ والد کی وفات کے دو سال بعد ۸۰۲ھ میں بارہ سال کی عمر کو پہنچے تو والدہ مکرمہ اپنے اس بیٹے کو پٹن کے مقام پر لے گئیں جو علاقہ گجرات میں واقع تھا اور جس کو اس زمانے میں علم و فضل اور

---

[۳۲] نزہۃ الخواطر، ج۴، ص ۹۴ بحوالہ مرآۃ سکندری۔

زہد و عبادت کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں مولانا علی شیر گجراتی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان سے اخذِ علم کیا۔ سلطان احمد شاہ گجراتی نے شہر احمد آباد تعمیر کیا تو پٹن سے احمد آباد منتقل ہو گئے اور کئی دن دریائے سابرتی کے کنارے مقیم رہے۔ بعد ازاں وہاں سے بٹوہ نام کے ایک گاؤں میں چلے گئے اور پھر تمام عمر وہیں سکونت اختیار کیے رکھی۔

شیخ عبداللہ بن محمود متعدد اوصاف کے حامل تھے۔ نیک، عالم اور فقیہ بھی تھے اور ساتھ ہی بارعب، بلند مرتبت اور صاحبِ عزّ و شان شیخ تھے۔ تصوف و طریقت سے کامل وابستگی رکھتے تھے اور کئی مشہور طریقوں سے منسلک تھے۔

اس رفیع المنزلت فقیہ اور معروف شیخ نے اٹھتر سال کچھ مہینے عمر پا کر ذی الحجہ ۸۵۷ھ کو اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کا سفر اختیار کیا۔[۱۳۴]

۵۷- شیخ عبداللہ ملتانی

شیخ عبداللہ ملتانی بن یوسف قریشی ملتانی اپنے دور کے معروف رجالِ فضل و صلاح میں سے تھے۔ شیخ صالح اور مشہور فقیہ تھے۔ سلطان بہلول لودھی کے عہد میں دہلی آئے۔ ان کی نیکی و مشیخت اور علم و فقاہت سے متاثر ہو کر سلطان بہلول لودھی نے اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دے دی تھی۔ اس سے ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام رکن الدین رکھا۔ رکن الدین اتنے جیّد عالم تھے کہ دہلی میں شیخ الاسلام کے منصب بلند پر فائز ہوئے۔ پھر ان کے لڑکے ابوالفتح بن رکن الدین ہوئے جو زہد و عبادت اور علم و فضل کے اعتبار سے اپنے دور میں مرجع خلائق تھے۔

شیخ عبداللہ ملتانی نے ۲۲ صفر ۹۰۰ھ کو وفات پائی۔[۱۳۵]

---

۱۳۴ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۹۶ تا ۹۸۔ بحوالہ مرأت احمدی

۱۳۵ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۹۸۔ بحوالہ بحر زخار

برصغیر پاک وہند کے اس فقیہ کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چل سکا۔

۵۸۔ مولانا عبدالملک جون پوری

مولانا عبدالملک العادل بن عماد الملک عمرادہمی جون پوری، جون پور میں پیدا ہوئے اور صغر سنی ہی میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے حلقۂ درس میں داخل ہوگئے۔ اور حصول علم کو اپنا مطمح نظر ٹھہرا لیا۔ طویل عرصہ تک ان سے منسلک رہے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے اور پھر درس وتدریس کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا۔ مسند افتا کو زینت بخشی اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔ بہت بڑے عالم اور فاضل بزرگ تھے۔ نحو اور علوم عربیہ میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ اکابر علمائے عصر میں شمار کیے جاتے تھے۔ اپنے استاذ و شیخ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے مدرسہ میں مسند تدریس پر متمکن تھے اور اس دور میں کوئی دوسرا عالم تدریس کے سلسلے میں ان کا حریف نہ تھا۔

ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ متعدد علمی شخصیتوں نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل کیا، جن میں ہدایہ اور بزدوی کے شارح شیخ الہداد (اللہ داد) خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔

مولانا عبدالملک جون پوری علوم و فنون پر عمیق نظر رکھتے تھے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی شرح کافیہ پر (جو شرح ہندی کے نام سے معروف ہے) مولانا عبدالملک جون پوری نے حواشی تحریر کیے۔

اس جلیل القدر عالم دین نے بعہد سکندر لودھی ۱۲ ربیع الاول ۹۰۷ھ کو جون پور میں وفات پائی اور اپنے خاندانی قبرستان مبارک محلہ کٹ گھرہ میں مدفون ہوئے[۳۶]۔

۳۶؎ نزہۃ الخواطر ج ۴، ص ۹۸، ۹۹۔ بحوالہ تجلی نور۔ تاریخ مشاہیر ہند جون پور، ص ۶۲۸، ۶۲۹۔

۵۹- شیخ عثمان حسینی گجراتی

شیخ عثمان حسینی گجراتی، خطہ گجرات کے مشہور مشائخ میں سے تھے اور اپنے عصر کے نامور فقیہ اور مرد صالح تھے۔ طریقت و تصوف کے بھی دلدادہ تھے اور اس ضمن میں شیخ برہان الدین عبداللہ بن محمود حسینی بخاری سے استفاضہ کیا تھا اور طویل عرصہ تک ان سے منسلک رہے تھے، جس کے نتیجے میں مرتبۂ کمال کو پہنچے اور مرجع خلائق قرار پائے۔ ان کی نیکی اور خلوص کی بنا پر ان کے شیخ نے ان کو شمع برہانی کا لقب دیا اور اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا۔

احمد آباد کے قریب ایک گاؤں عثمان پور کے نام سے موسوم تھا جو ان ہی کی طرف منسوب تھا۔ یہ گاؤں دریائے سابرتی کے کنارے واقع تھا۔ وہاں ایک دینی مدرسہ بھی تھا جس میں طلبا دینیات کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ کہتے ہیں عثمان پور کا گاؤں شیخ عثمان ہی نے آباد کیا تھا اور یہ اسی میں سکونت پذیر تھے۔ ان کی قبر بھی اسی گاؤں میں ہے۔

منقول ہے کہ حاکم گجرات سلطان محمود بن محمد ان سے انتہائی مخلصانہ تعلقِ ارادت، بے حد عقیدت اور بدرجہ غایت حسن ظن رکھتا تھا۔ اکثر ان سے قرآن و حدیث اور سلوک و تصوف کا درس لیتا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ عام طور پر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کے لیے بہت عزت و احترام کا اظہار کرتا۔ صرف سلطان محمود بن محمد ہی نہیں، اس سے پہلے حکمران، اس کا اہل و عیال، اس کے خاندان کے تمام افراد، ارکانِ دولت اور اس کے اہل کار اور عمالِ حکومت بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، ان سے پیش آئند مسائل دریافت کرتے اور مختلف اوقات میں پڑھنے کے لیے وظائف و اوراد پوچھتے اور ان کی مجلس میں دو زانو ہو کر بیٹھتے تھے۔

سلطان محمود کی عقیدت و احترام کا تو یہ حال تھا کہ اس کے ذاتی کتب خانے کی اکثر کتابیں شیخ کے پاس ان کے مدرسے میں رہتیں اور شیخ باقاعدہ ان کا مطالعہ فرماتے

اور طلبا کو ان کے مطالعہ کی تلقین کرتے۔

شیخ عثمان گجراتی نے ماہ جمادی الاولیٰ ۸۶۳ھ میں وفات پائی[۱۳۷]

معلوم ہوتا ہے شیخ عثمان اپنے مدرسہ میں باقاعدہ فرائض تدریس انجام دیتے تھے اور لوگوں کی روحانی اور باطنی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی علمی اور ظاہری تربیت کا بھی ان کے ہاں پورا اہتمام تھا۔

۶۰۔ شیخ عزیز اللہ مندوی

شیخ عزیز اللہ بن یحییٰ بن لطف اللہ عمری مندوی، شہاب فرخ شاہ عمری کابلی کی اولاد سے تھے۔ سال ولادت ۸۶۷ھ ہے۔ شیخ کامل، عالم اجل اور فقیہ عصر تھے۔ عفت و طہارت کی گود میں پیدا ہوئے اور بلند مرتبت حضرات کی آغوشِ تربیت میں تعلیم پائی۔ شیخ رکن الدین مودود گجراتی سے اخذ فیض کیا اور عرصہ دراز تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے، یہاں تک کہ مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ پھر احمد آباد اور بلادِ دکن کا سفر کیا اور مندو میں اقامت گزین ہوئے۔

نہایت زاہد اور متوکل علی اللہ تھے۔ قناعت، عفاف اور توکل میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ بے نیازی کا یہ عالم کہ نہ کسی کی نذر قبول کرتے اور نہ کل کے لیے کوئی چیز بطور ذخیرہ کے گھر میں رہنے دیتے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک دن پتا چلا کہ بیوی نے روٹی کا ایک ٹکڑا گھر میں رکھ لیا ہے اور وہ اس کو دودھ میں ڈال کر بیٹی کو کھلانا چاہتی ہیں۔ اس سے شیخ نے دل میں شدید تکلیف محسوس کی اور حکم دیا کہ روٹی کے اس ٹکڑے کو گھر سے نکال دیا جائے اور کسی کو دے دیا جائے، بطور ذخیرہ کے بالکل نہ رکھا جائے، اس سے اللہ پر بھروسے میں کمی پیدا ہوتی ہے۔

شیخ عزیز اللہ مندوی کے پانچ بیٹے تھے، جن کے نام یہ تھے۔ رحمت اللہ، سعد اللہ

---

[۱۳۷] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۹۹۔

سن سرمست، نصر اللہ اور شہید اللہ۔
شیخ موصوف پچاسی سال عمر پاکر ۲۲ صفر ۸۵۲ھ کو فوت ہوئے۔[۹]

۶۱۔ مولانا علاء الدین جون پوری

مولانا علاء الدین عطاء الملک بن عماد الملک عمری جون پوری اپنے عصر کے فاضل اور عالم شخص تھے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے شاگرد تھے اور طویل عرصے تک ان کی خدمت میں رہنے کا شرف حاصل کیا تھا۔ قاضی شہاب الدین نے ان کی ذہانت اور علمی قابلیت سے متاثر ہو کر ان کے لیے علم نحو کی معروف کتاب کافیہ ابن حاجب کی مفصل و بسیط شرح تصنیف کی اور پھر ان کو باقاعدہ درساً درساً یہ کتاب پڑھائی۔ مولانا علاء الدین کا شمار اپنے دور کے مشہور اور نامور اساتذہ فن میں ہوتا تھا۔ تمام علوم کے ماہر تھے۔ تقریباً بیس برس کی عمر میں مسند افتا و تدریس پر فائز ہو گئے تھے پھر اس قابلیت سے خدمات انجام دیں کہ ان کا شمار اکابر علمائے عصر میں ہونے لگا۔

مولانا علاء الدین جون پوری مصنف اور بعض فنی کتابوں کے شارح و محشی بھی تھے۔ اس سلسلے میں اپنے استاذ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی شرح کافیہ پر ان کا حاشیہ خاص طور سے علمی اور فنی اہمیت کا حامل ہے۔

نویں صدی ہجری کے دیار ہند کے اس نامور عالم دین نے جون پور میں وفات پائی اور اپنے خاندانی قبرستان کٹ گڑھ میں دفن کیے گئے۔[۱۰]

۶۲۔ شیخ علاء الدین گوالیاری

شیخ علاء الدین قریشی گوالیاری فاضل اور متدین بزرگ تھے۔ مشائخ چشتیہ میں

---

[۹] نزہت الخواطر ج ۳ ص ۱۰۰۔ گلزار ابرار ص ۱۰۶، ۱۰۵، مجمع الابرار۔

[۱۰] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۰۲ بحوالہ تجلی نور۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۶۲۹، ۶۳۰۔

سے تھے۔ قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی کے تلمیذ تھے۔ بہت مدت تک شہر گوالیار کی مسندِ افتا پر فائز رہے اور عظمت و وجاہت کی اعلیٰ منازل کو پہنچے۔ پھر ایک وقت آیا کہ تمام علائق دنیوی سے دامن کشاں ہو کر تصوف و طریقت کی راہ پر گامزن ہو گئے اور شیخ محمد بن یوسف حسینی دہلوی (خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ) سے وابستگی اختیار کر لی۔ عرصہ تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے اور اخذ فیض کیا۔ مرتبۂ کمال کو پہنچے تو آخر شعبان ۸۰۱ھ میں شیخ نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کر دیا لیکن سکونت گوالیار ہی میں اختیار کیے رکھی اور خاصی مدت وہاں مقیم رہے۔ پھر کالپی تشریف لے گئے۔ چنانچہ مختلف اوقات میں گوالیار اور کالپی دونوں مقامات پر رہا، اس لیے بعض تذکرہ نگاروں نے وطن کے اعتبار سے ان کو گوالیار کی طرف منسوب کیا ہے اور بعض نے کالپی کی طرف۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلے گوالیار میں اقامت رکھتے تھے، بعد میں کالپی چلے گئے تھے اور اسی کو مسکن قرار دے لیا تھا۔ انھوں نے ماہ محرم ۸۴۲ھ میں وفات پائی۔[1]

۶۴۔ شیخ علی بن اسعد دہلوی

شیخ علی بن اسعد بن اشرف بن علی حسینی۔ انھیں علاء الدین ابو عبداللہ دہلوی کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے اور اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ پھر شیخ جلال الدین حسین بخاری (جہانیاں جہاں گشت) ۷۷۷ھ میں دہلی گئے تو ان کی صحبت و ملازمت سے سعادت اندوز ہوئے۔ بعد ازاں وہ ۷۸۱ھ میں دہلی گئے تو دوبارہ ان سے منسلک ہونے کا شرف حاصل کیا۔ انہی سے درسِ طریقت لیا اور جب تک وہ دہلی میں قیام فرما رہے، یہ ان سے الگ نہیں ہوئے۔ ان سے متفق، مجمع البحرین، نصف حصہ قدوری، کچھ حصہ ہدایہ، حسامی، بزدوی، عقیدۂ نسفیہ، منظومہ، مفصل، تیسیر، تفسیر مدارک التنزیل، عوارف المعارف، التعرف، رسالہ مکیہ

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۰۲۔ بحوالہ خورشید جاہی۔

چند رسائل تصوف، مشارق الانوار، مصابیح السنہ اور بعض دیگر کتب و رسائل پڑھے اور کچھ اوراد و وظائف بھی سیکھے اور ان سب کا باقاعدہ تحریری طور پر سند و اجازہ حاصل کیا۔

شیخ علاء الدین دہلوی، فقیہ و عالم ہونے کے علاوہ مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات میں یہ کتابیں موجود ہیں۔

خلاصۃ الالفاظ۔

جامع العلوم۔ اور

دو جلدوں میں بزبانِ فارسی اپنے شیخ کے ملفوظات جمع کیے[1]

٦٤۔ شیخ علی بن احمد مہائمی

شیخ علاء الدین ابوالحسن علی بن احمد شافعی مہائمی کوکنی علامۂ دوراں، فاضلِ اجل، امام کبیر اور شیخ وقت تھے۔ نہایت اونچے مرتبے کے شافعی المسلک عالم دین تھے جو نوائت سے تعلق رکھتے تھے، جس کو بعض لوگ نوائط (بالطاء) بھی کہتے ہیں۔ لفظ نوائت، ضوابط کے وزن پر ہے اور ایک قوم کا ملکی نام ہے جو بلادِ دکن اور بلادِ گجرات (انڈیا) وا شہا میں مقیم ہے۔ ایک روایت کے مطابق نوائت قبیلہ قریش کا وہ گروہ ہے، جس کے آبا و اجداد حجاج بن یوسف کے زمانے میں اس کے مظالم سے تنگ آ کر مدینہ منورہ کی سکونت ترک کر کے بحر ہند کے ساحلی علاقوں میں آ گئے تھے اور پھر وہیں مستقل طور سے اقامت گزین ہو گئے تھے۔

مہائم، انطائم کے وزن پر ہے۔ یہ ناحیہ گجرات میں بحر ہند کے کنارے کوکن کی ایک بندرگاہ ہے۔ شیخ علی بن احمد وہیں کے باشندے تھے۔

علی بن احمد ٧٧٦ھ میں پیدا ہوئے اور مشہور اساتذۂ عصر سے تعلیم حاصل کی۔ بحر ہند کے ساحلی علاقوں میں شوافع کثیر تعداد میں آباد تھے اور اپنے مسلک و عقیدہ میں نہایت

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ٣، ص ١٠٣، ١٠٤۔

راسخ اور مشہور تھے۔ اب بھی ان علاقوں میں زیادہ تر شافعی المسلک لوگ فروکش ہیں۔
شیخ احمد بھی ان ہی حضرات میں سے تھے اور اپنے وقت کے جلیل القدر عالم اور عظیم
المرتبت فقیہ تھے اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں۔

۱۔ تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان فی تفسیر القرآن: جس کو تفسیر رحمانی اور تفسیر مہائمی بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک بے نظیر تفسیر ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آیات قرآنی کا باہم ربط ثابت کیا گیا ہے اور دیگر آیات میں بعض بڑے مفید اور معلومات افزا مباحث آگئے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ قاہرہ (مصر) میں دو جلدوں میں بھوپال کے وزیر جمال الدین مرحوم کے خرچ پر شائع بھی کی گئی تھی۔

۲۔ الزوارف فی شرح العوارف: یہ تصوف کی مشہور کتاب عوارف المعارف کی شرح ہے۔

۳۔ خصوص النعم فی شرح الفصوص: فصوص مصنفہ شیخ صدر الدین قونوی کی شرح ہے۔

۴۔ اجلاء البصر فی الرد علی استقصاء النظر: یہ ابن المطہر حلی کی کتاب استقصاء النظر کے رد میں ہے۔

۵۔ النور الاظہر فی کشف سر القضاء و القدر۔

۶۔ الضوء الازہر فی شرح النور الاظہر: یہ کتاب نمبر ۵ کی شرح ہے۔

۷۔ اجلۃ التائید فی شرح ادلۃ التوحید۔

۸۔ انعام الملک العلام باحکام حکم الاحکام: یہ اسرار فقہ اور محاسن شریعت کے موضوع سے متعلق ہے۔

۹۔ کتاب لمعات العراقی کا ترجمہ اور اس کی شرح۔

۱۰۔ رسالہ جام جہان نما کا ترجمہ۔

۱۱۔ آراء الدقائق فی شرح مرآۃ الحقائق: یہ رسالہ جام جہان نما کی شرح ہے۔

۱۲۔ شرح الفصوص: یہ فصوص الحکم کی ایک بے نظیر شرح ہے۔

۱۳۔ فقہ شافعی کے بارے میں ایک رسالہ۔

۱۴۔ وجوہ اعرابِ قرآن کے بیان میں ایک عجیب و غریب رسالہ۔

ان کے علاوہ اور بھی متعدد کتب و رسائل ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے اس عظیم شافعی المسلک فقیہ، جید عالم دین اور شہرۂ آفاق مصنف نے ۹۵ سال کی عمر میں جمعہ کے روز ۲۸ جمادی الاخریٰ ۸۳۵ھ کو وفات پائی۔[۱۴۱]

۶۵۔ شیخ علی بن احمد زمزمی

شیخ علی بن احمد کا سلسلۂ نسب یہ ہے: علی بن احمد بن علی بن محمد بن داؤد بیضاوی۔ ان کا لقب نور الدین اور کنیت ابو الحسن ہے۔ اور انھیں نور الدین ابو الحسن مکی معروف بہ زمزمی کہا جاتا ہے۔ ان کی پیدائش تو ہندوستان میں ہوئی مگر بچپن ہی میں انھیں مکہ مکرمہ لے جایا گیا اور وہیں نشو و نما پائی۔ قرآن مجید حفظ کیا اور فقہ حنفی سے متعلق کتابیں پڑھیں۔ فرائض و حساب کا علم اپنے عمّ محترم بدر الدین حسین بن علی زمزمی سے حاصل کیا۔ اس علم میں بڑی دسترس رکھتے تھے اور فقہ میں عمدہ اسلوب کے حامل تھے۔

کاروباری سلسلے میں شیراز گئے۔ پھر کئی مرتبہ اسی ضمن میں یمن اور ہند میں بھی ان کا آنا جانا رہا۔ ہند کے دورانِ سفر میں بعض مرتبہ گلبرگہ کے قریب بھی پہنچے۔ ان کی موت بھی دوران سفر ہی میں واقع ہوئی، وہ اس طرح کہ عدن سے ہندوستان جا رہے تھے کہ سمندر میں غرق ہوگئے۔ یہ حادثہ رمضان المبارک ۸۲۴ھ کو پیش آیا۔[۱۴۲]

۶۶۔ قاضی علم الدین شاطبی

قاضی علم الدین بن عین الدین بن نجم الدین صدیقی شاطبی گجراتی، قرأت، تجوید، فقہ

---

[۱۴۱] ابجد العلوم، ص ۸۹۳، ۸۹۴۔ حدائق الحنفیہ، ص ۳۱۷۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۷۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، ص ۳۹ تا ۴۱۔ مآثر الکرام۔ دفتر اول ص ۱۲۳، ۱۲۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۰۵، ۱۰۶۔

[۱۴۲] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۰۶، ۱۰۷۔ بحوالہ طرب الاماثل۔

اور علوم عربیہ کے جلیل القدر علما میں سے تھے۔ طریقت و سلوک سے تعلقِ خاطر تھا اور اس سلسلے میں شیخ صدر الدین محمد حسینی بخاری سے فیض یافتہ تھے۔ عرصہ تک ان سے وابستگی اختیار کیے رکھی۔ پھر سیر و سیاحت کو نکلے تو سرزمین ہند میں داخل ہوئے اور گجرات میں سکونت اختیار کی۔ گجرات میں درس و تدریس اور افادۂ عام ان کا اصل مشغلہ تھا۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے، جن میں خود ان کے بیٹے مودود بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ قاضی خاں نہروالی اور علما و مشائخ کی کثیر تعداد نے ان سے اخذِ علم کیا۔

انھوں نے سوموار کے دن ۲۰ رمضان المبارک ۸۶۰ھ کو اٹھاسی[۹۹] سال کی عمر میں وفات پائی۔[۱۴۴]

۶۷۔ مولانا عماد الدین غوری

مولانا عماد الدین غوری، علاقہ نارنول کے اکابر مشائخ میں سے تھے۔ ان کے ایک بزرگ کا نام بھی شیخ عماد الدین غوری تھا۔ یہ ان ہی کی نسل سے تھے۔ ان کو سلطان محمد تغلق نے صرف اس لیے قتل کرا دیا تھا کہ انھوں نے اس کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا تھا۔[۱۴۵]

---

[۱۴۴] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۰۸

[۱۴۵] مولانا عماد الدین غوری، سلطان محمد شاہ تغلق کے زمانے میں ایک راست گو اور حق شناس منبحر عالمِ دین تھے۔ محمد تغلق نے ایک روز غرورِ سلطنت میں ان سے کہا کہ جب فیضِ خدا منقطع نہیں ہوا ہے تو فیضِ نبوت کیوں کر منقطع ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی دعوائے نبوت کرے اور معجزہ بھی دکھا دے تو اس کی تصدیق کرنی چاہیے یا نہیں؟ بادشاہ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مولانا عماد الدین غوری کی حمیتِ دین جوش میں آ گئی اور اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ گُہ مخور چہ می گوئی۔ (گوہ نہ کھاؤ۔ کیا کہہ رہے ہو) بادشاہ یہ الفاظ برداشت نہ کر سکا۔ حکم دیا کہ اس کو ذبح کر دیا جائے اور اس کی زبان گدی سے کھینچ دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً (تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۷)

ان کے آباؤ اجداد اور اصل عرب تھے، کچھ عرصہ حلب میں رہے تھے، وہاں سے غور آئے اور وہاں سے ان کے ایک بزرگ سلطان شہاب الدین غوری کے ہمراہ عازم ہند ہوئے۔

مولانا عماد الدین غوری کی زندگی درحقیقت دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ جس میں عالم شباب کا کچھ حصہ بھی شامل ہے، کھیل کود اور پہلوانی کرنے میں گزرا۔ یہ اپنے دور کے بہت بڑے پہلوان تھے، مگر چوں کہ آباؤ اجداد متقی و پرہیز گار تھے، اس لیے لوگ ان کو اس حرکت پر ملامت کرتے اور روکتے تھے۔ ایک روز یہ کشتی کے لیے اکھاڑے میں اُترے تو دیکھا کہ مدمقابل ان سے بہت زیادہ زور دار اور قوی ہیکل پہلوان ہے مگر انھوں نے اس کو پچھاڑ دیا۔ اب یہ فتح کے نشے میں چور تھے۔ نہایت فخر و غرور کے عالم میں گھر کو لوٹے۔ چال اور انداز کا یہ حال تھا کہ گویا اب ان کے رعب میں زمین پھٹ جائے گی یا یہ پہاڑوں کی بلندیوں کو چھونے لگیں گے۔ اسی حال میں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک صاحب علم و دل بزرگ ملے۔ انھوں نے ان کو سختی سے کچھ باتیں کہیں اور ان حرکتوں پر ملامت کی۔ اس بزرگ کی باتوں کا ان پر اس درجہ اثر ہوا کہ بڑے نادم ہوئے اور اسی وقت سب سے کنارہ کش رہنے کا فیصلہ کر لیا اور لہو و لعب کی زندگی ترک کر دی۔ شیخ محمد نارنولی کی قبر پر گئے۔ وہاں بیٹھ گئے اور پورے بارہ سال دنیا اور اس کے معاملات سے علیحدگی اختیار کیے رکھی۔ اعمال صالحہ، تقویٰ و طہارت، ذکر الٰہی، تلاوتِ قرآن، فرائض اور سنن و نوافل کی ادائیگی کو اپنی زندگی کا معمول ٹھہرا لیا۔ اور تمام وقت اسی کام میں صرف ہونے لگا۔ ایک حجرے میں معتکف ہو گئے، بلا ضرورت اس سے باہر نہ نکلتے اور زندگی کے معمولات کو اپنے اسلاف کے قالب میں ڈھال لیا۔ فقہ اور دیگر علوم میں کامل مہارت پیدا کر لی اور درس و تدریس کو نصب العین حیات قرار دے لیا۔

شیخ احمد بن امجد الدین شیبانی کہتے ہیں کہ میں نے ان کو اپنے بچپن کے زمانے میں دیکھا اور ان سے ملا تو اتباعِ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی راہِ سنت سے باہر قدم نہ رکھتے

تھے۔ کوئی کام ہوتا، اس کو سب سے پہلے سنت نبوی کے پیمانے سے ناپتے۔ فقر و فقرا سے بہت محبت رکھتے اور نادار کی مدد کرتے تھے۔[۱۴۶]

برصغیر پاک و ہند کے اس نامور عالم اور جلیل القدر فقیہ کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا اور نہ ان کی تاریخ ولادت یا وفات ہی کا پتا چل سکا ہے۔ صرف اس قدر معلوم ہوا ہے کہ یہ نویں صدی ہجری کے دیارِ ہند کے قابلِ فخر بزرگ تھے اور علم و فقاہت اور طریقت و مشیخت کے اعتبار سے اونچے خاندان کے فرد تھے۔

۶۸- شیخ عین الدین بیجاپوری

شیخ عین الدین بن محمد بن عین الدین بیجاپوری، معروف عالم و فقیہ اور مشہور شیخ تھے۔ علم و معرفت کے سلسلے میں شیخ اویس بن محمد بن سراج جنیدی کے شاگرد اور فیض یافتہ تھے، اور طویل عرصہ تک ان کی خدمت میں رہ کر مرتبہ کمال کو پہنچے تھے۔ ان کی وفات ۸۳۵ھ میں ہوئی۔[۱۴۷]

برصغیر کے اس نامور فقیہ کی کسی تصنیف کے بارے میں معلومات نہیں حاصل ہوئیں۔ غالباً یہ ان ہی فقہائے گرامی قدر میں سے تھے جن کو تصنیف و تالیف سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ البتہ مسائلِ فقہیہ اور کتبِ فقہ پر وہ گہری نظر رکھتے تھے۔

غ

۶۹- شیخ غوث الدین گجراتی

شیخ غوث الدین قادری بغدادی ثم گجراتی، شیخ وقت اور عالم و فقیہ تھے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے مشہور مشائخِ کرام میں ہوتا تھا۔ یہ درحقیقت بغداد کے رہنے والے

---

[۱۴۶] اخبار الاخیار، ص ۲۰۰، ۲۰۱۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۵۰، ۱۵۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۰۸، ۱۰۹۔

[۱۴۷] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۱۱۔ بحوالہ محبوب ذی المنن

تھے۔ ہندوستان آئے تو سلطان محمود بیگڑہ کے عہد میں احمد آباد میں سکونت پذیر ہو گئے۔ وہاں ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا، اس میں طویل عرصہ تک درس دینے اور طلبا کو علومِ دینیہ کی تعلیم سے بہرہ اندوز کرتے رہے۔ پھر حرمین شریفین تشریف لے گئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ وہاں سے پھر ہندوستان آ گئے۔

یہ بہت بڑے عالم، محدث، فقیہ اور زاہد تھے۔ ان کا اصل کام درس و تدریس اور تشنگانِ علم کی علمی تشنگی دور کرنا تھا۔ ان سے شیخ یعقوب بن خوند میر گجراتی اور خلقِ کثیر نے کسبِ علم کیا۔

اس نامور فقیہ اور عالمِ دین نے ۲۲ صفر ۸۹۵ھ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[۱۴۸]

ف

۷۰۔ شیخ فتح اللہ اودھی

شیخ فتح اللہ بن نظام الدین صوفی اودھی، علم و صالحیت میں یگانۂ روزگار تھے اور ان کا شمار فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں اس عصر کے جید علمائے کرام میں ہوتا تھا۔ سالہا سال تک دہلی کی جامع مسجد میں منار شمسی کے قریب، مسندِ درس و افادہ پر متمکن رہے۔ پھر علمی مباحث و مشاغل کو ترک کر کے شیخ صدر الدین احمد بن شہاب دہلوی کے حلقۂ ارادت میں شریک ہو گئے اور ذکر و مراقبہ کو اصل مشغلہ قرار دے لیا۔ مدت تک اس میں مصروف رہے، بہت ریاضت کی مگر ابوابِ کشف و شہود وا نہ ہوئے اور قلب کی دنیا پر مساعیِ سلوک کا قطعی طور سے کوئی اثر ظاہر نہ ہوا۔ اس کی شکایت اپنے مرشد شیخ صدر الدین سے کی تو انھوں نے ترکِ درس اور کتابوں سے کنارہ کش ہو جانے کا حکم دیا اور فرمایا، علومِ ظاہری سے تعلقِ خاطر کی فراوانی، علومِ باطنی کی راہوں پر گام فرسا ہونے میں رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے، اس رکاوٹ کو دور کرنا چاہیے۔

۱۴۸؎ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۱۱۔

مرشد کے حکم کی تعمیل کی گئی مگر باب معرفت اب بھی پوری طرح نہ کھلا اور آنکھوں سے آنسو جاری نہ ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض نفیس اور عمدہ کتابیں ہنوز باقی تھیں۔ اور زیر مطالعہ تھیں۔ مرشد کے فرمان سے ان کتابوں کی رفاقت بھی ترک کردی گئی تو فتوحات روحانی کے بند کواڑ کھلنے لگے۔ کہتے ہیں، ادھر انھوں نے کتابیں دریا کی لہروں کے سپرد کرنا شروع کیں اور وہ غرق ہونے لگیں اور ادھر آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش شروع ہوگئی اور پھر کامل دلجمعی اور فراغت قلب سے سلوک و طریقت کی منزلیں طے کرنے لگے۔ کیوں کہ اب لوح ضمیر نقش ماسوی اللہ سے پاک ہو چکا تھا اور اقلیم قلب نے علوم ظاہری کے تسلط سے نجات حاصل کر لی تھی۔

اس صاحب دل صوفیہ سے بے شمار لوگوں نے اکتساب فیض کیا، جن میں صاحب آداب السالکین شیخ محمد بن قاسم اودھی اور شیخ محمد بن عیسیٰ جون پوری خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔

ان کے کچھ رسائل و مکاتیب بھی ہیں جو انھوں نے اپنے اصحاب عقیدت کے نام تحریر کیے تھے۔

فرمایا کرتے: خیر الاعمال ادومھا وان قل۔

کہ بہتر اعمال وہ ہیں جو ہمیشہ کیے جائیں، اگرچہ کم ہوں۔

ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

یک دوست پسند کن چو یک دل داری
گر مذہب مردمان عاقل داری

انھوں نے ۲۷ ربیع الثانی ۸۲۱ھ کو وفات پائی۔[۱۴۹]

۷۱- امیر فضل اللہ شیرازی

علامہ فضل اللہ بن فیض اللہ حسینی شیرازی اپنے دور کے عظیم انسان تھے۔

---

۱۴۹ اخبار الاخیار، ص ۱۶۸- خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۳۸۰- تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۹- نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۱۲، ۱۱۳-

علم و فضل میں منفرد حیثیت کے حامل تھے۔ نکاتِ علمیہ اور مسائلِ دقیقہ کو سلجھانے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ذکاوت و فطانت میں بے مثال تھے۔ علامہ سعد الدین عمر بن مسعود تفتازانی کے شاگرد تھے۔ والیِ دکن سلطان علاء الدین حسن بہمنی کے ایامِ حکومت میں ہندوستان آئے۔ سلطان سے ملاقات ہوئی تو وہ ان کی علمی قابلیت سے اس درجہ متاثر ہوا کہ انھیں اپنے تین بیٹوں ـ محمد، محمود اور داؤد ـ کا معلم مقرر کردیا۔ بعد سلطان محمود شاہ بہمنی کا دورِ حکومت آیا تو وہ ان کا شاگرد تھا، اس نے ان کو سید صدر الشریف سمرقندی کی جگہ، گلبرگہ کے منصب صدارت پر فائز کردیا۔ اس عہدہ پر وہ کئی سال متعین رہے۔ بعد ازاں ۸۰۰ھ میں فیروز شاہ بہمنی تختِ نشینِ دکن ہوا تو اس نے ان کو وکیلِ سلطنت کا عہدۂ جلیلہ عطا کیا پھر تا دمِ واپسیں اسی عہدہ پر فائز رہے۔

یہ باقاعدہ فقیہ تو نہ تھے لیکن ہیئت، ہندسہ اور باقی علوم حکمیہ کے جلیل القدر عالم تھے۔ علاوہ ازیں بڑے مدبر، سیاست دان، عاقل و فہیم اور صاحب فراست تھے۔ ان میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ بہادر و شجاع، جنگ جو اور ماہر حرب بھی تھے۔ پھر اصابتِ فکر، حلاوتِ منطق، عذوبتِ لسان اور رزانتِ عقل میں بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ غرض بہت سے فضائل و کمالات کے مالک تھے۔ متعدد مہمات میں شرکت کی اور کامیاب رہے۔ سلطان کی معیت میں چوبیس مرتبہ کفار کے ساتھ جہاد کیا اور توکل علی اللہ حسن تدبیر، عزم و حزم، مہارتِ حربی اور بسالت و شجاعت کی بنا پر بہت سے قلعے اور شہر فتح کیے۔

ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ان کے ساتھ فوج بہت کم تعداد میں تھی۔ سلطان نے ان کو راجہ دیو رائے کے مقابلے میں جنگ کے لیے بھیجا۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو اس انداز سے راجہ کی فوج کے ساتھ لڑایا اور ایسی جنگی تدابیر سے کام لیا کہ حریف تنگ آگیا اور قریب تھا کہ شکست کھا جائے، مگر اس نے دھوکے سے ان کو قتل کرادیا۔ یہ ۸۲۰ھ کے لگ بھگ کا واقعہ ہے[150]۔

---

[150] تاریخ فرشتہ، ج ص نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۱۴، ۱۱۵

۷۲- مولانا فخرالدین جون پوری

مولانا فخرالدین بن نصیرالدین بن نظام الدین جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ حنفی المسلک تھے۔ علامہ قاضی شہاب الدین احمد دولت آبادی کے نواسے تھے اور بڑے عالم و فاضل تھے۔ تمام علوم مروجہ اپنے نانا قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے حاصل کیے اور عرصہ تک ان کی خدمت میں رہے، تاآنکہ فقہ، اصولِ فقہ، علمِ کلام اور علوم عربیہ میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔[۱۵۱]

۷۳- قاضی فخرالدین مالاباری

قاضی فخرالدین ابوبکر بن قاضی رمضان شالیانی مالاباری، شافعی المسلک تھے، اور ان کا شمار اپنے دور کے اونچے درجے کے فقہائے عظام اور علمائے محققین میں ہوتا ہے۔ شہر کالی کوٹ کے قاضی تھے، جو علاقہ مالابار کی ایک بڑی بندرگاہ تھی۔ منصبِ قضا کے علاوہ خدمتِ تدریس بھی انجام دیتے اور تشنگانِ علم کی علمی پیاس بجھاتے تھے۔ اس دور کے مفتی بھی تھے اور لوگ پیش آمدہ مسائل کے لیے ان ہی کی طرف رجوع کرتے اور ان ہی سے فتویٰ لیتے تھے

ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسعت پذیر تھا، جن میں صاحب ہدایۃ الاذکیا شیخ زین الدین بن علی مالاباری کا اسم گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہے۔ انھوں نے ان سے فقہ اور اصولِ فقہ وغیرہ علوم کی تحصیل کی۔ اپنی کتاب مسلک الابصار میں ان کی اور ان کے لڑکے کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے:

الامام الجلیل المفتی البادع فی البلاغۃ امام الدیار الملیباریا۔[۱۵۲]

افسوس ہے برصغیر پاک و ہند کے نویں صدی ہجری کے اس عظیم المرتبت شخص

---

۱۵۱ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۱۵ ۱۵۲ ایضاً، ص ۱۱۵، ۱۱۶

نفتیہ کے مفصل حالات کا علم نہیں ہو سکا۔ نہ ان کی کسی تصنیف تک ہی ہماری رسائی ہو سکی ہے اور نہ ان کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا پتا چل سکا ہے۔ صرف اتنی بات معلوم ہے کہ یہ نویں صدی ہجری کے شافعی المسلک عالم وفقیہ تھے۔

ق

۷۴۔ شیخ قطب الدین ظفر آبادی

شیخ ابوالغیب قطب الدین بن نور الدین حسینی واسطی ظفر آبادی ۸۰۲ھ میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید اپنے والد مکرم سے حفظ کیا اور مختصرات بھی ان ہی سے پڑھیں۔ پھر قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور تمام کتب درسیہ ان ہی سے پڑھیں۔ چار سال ان کی خدمت میں حاضر رہے حتیٰ کہ علمائے صالحین اور فقہائے عصر میں سے گردانے گئے۔

بعد ازاں اپنے والد بزرگ وار شیخ نور الدین سے طریقت و تصوف کا درس لیا، حرمین شریفین کا قصد کیا اور حج و زیارت سے سعادت اندوز ہوئے۔

نہایت عبادت گزار، عظیم الورع، حسن اخلاق کے مالک، بہت متواضع، انتہائی منکسر المزاج، لوگوں کے خادم اور ان کو فائدہ پہنچانے والے تھے۔ خلق کثیر نے ان سے اخذ علم اور کسب فیض کیا۔

اس گوناگوں اوصاف کے حامل فقیہ اور درویش منش عالم دین نے ۲۰ جمادی الآخری ۸۶۹ ہجری کو ظفر آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔[۱۵۳]

ان کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔

۷۵۔ شیخ قطب الدین بن خضر بلخی

شیخ قطب الدین بن خضر بن حسن بن مبارک ادہمی بلخی، فاضل دوراں اور شیخ

---

۱۵۳ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۱۹، ۱۲۰۔ بحوالہ تجلی نور

وقت تھے۔ حدیث کے جید عالم تھے اور اس کے تمام گوشوں پہ گہری نگاہ رکھتے تھے
فقہ سے بھی تعلق تھا، لیکن درجہ اختصاص حدیث ہی میں حاصل تھا۔ ان کے والد گرامی
قدر شیخ خضر بھی مشہور عالم تھے اور اس بیٹے نے ان ہی سے اخذِ علم کیا تھا۔ والد کی وفات
کے بعد مسندِ تدریس پر فائز ہوئے اور عرصہ تک درس و افادۂ عام میں مصروف رہے۔
شیخ قطب الدین سے ان کے لڑکے شیخ عبدالقادر نے تعلیم حاصل کی تھی۔[۱۵۴]

نہ ان کی تاریخ ولادت و وفات کا علم ہو سکا ہے اور نہ کسی تصنیف کا پتا چل
سکا ہے۔

۷۶۔ مولانا قیام الدین ظفرآبادی

مولانا قیام الدین قریشی ظفرآبادی، عالم و فقیہ اور شیخ تھے۔ حنفی المسلک تھے۔
فقہ اور اصولِ فقہ کے متبحر علما میں سے تھے۔ اصلاً دہلی کے باشندے تھے مگر یہ اور
شیخ اسد الدین حسینی واسطی دہلی سے ظفرآباد منتقل ہو گئے تھے اور پھر وہیں رہائش
اختیار کر لی تھی۔ مولانا قیام الدین مدتِ مدید تک ظفرآباد میں درس و افادہ میں مصروف
رہے اور طلبا کی علمی خدمت انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں علمی بحث و اشتغال سے
کلیتہً کنارہ کش ہو گئے، اپنے لیے ترک و تجرید کی زندگی پسند کر لی، دنیوی معاملات
سے انزوا و انقطاع اختیار کر لیا اور گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ سے لو لگا لی۔[۱۵۵]

اس عظیم فقیہ اور صوفی نے ۱۳ ذی القعدہ ۸۱۷ھ کو انتقال کیا۔

ک

۷۷۔ شیخ کبیر الدین ناگوری

شیخ کبیر الدین کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ کبیر الدین بن فرید الدین بن عبدالعزیز بن
حمید الدین سعیدی سوالی ناگوری۔ عالم دین اور زاہد و عابد تھے۔ نیکی کی وجہ سے ان

---

[۱۵۴] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۲۰۔ [۱۵۵] ایضاً، ص ۱۲۰، ۱۲۱، بحوالہ تجلیِ نور۔

کا شمار اس دور کے علمائے ربانی میں ہوتا تھا مصنف بھی تھے اور مدرس و معلم بھی۔ علم نحو میں خصوصاً عبور حاصل تھا۔ نحو کی کتاب مصباح کی نہایت عمدہ شرح سپرد قلم کی، جس کا نام "الدہن" رکھا۔ پہلے ناگور میں فروکش تھے لیکن اس فتنہ کی وجہ سے جو کفار کے ہاتھوں ناگور میں پیدا ہوا، آخر عمر میں گجرات چلے گئے تھے۔ پھر وہیں مستقل طور سے رہائش اختیار کر لی تھی اور درس و افادہ میں معروف ہو گئے تھے۔ وہاں طویل عرصہ تک لوگوں کو درس دیتے رہے اور اس اثنا میں بے شمار تشنگان علوم نے ان سے استفادہ کیا جن میں شیخ حسین بن خالد ناگوری ایسے فاضل اجل بھی شامل ہیں۔

۷ ار ذی القعدہ ۸۳۵ھ کو اور ایک روایت کے مطابق ۸۵۸ھ کو احمد آباد میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے [۱۵۶]

۷۸۔ شیخ کبیر الدین ملتانی

شیخ کبیر الدین بن اسماعیل بن محمود بن حسین حسینی بخاری اوچی ملتانی، ارض ہند کے صالح عالم دین، نامور فقیہ اور مشہور شیخ تھے۔ اوچ میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ اپنے جد امجد کے عم محترم شیخ صدر الدین محمد بن احمد حسینی بخاری سے اخذ علم اور کسب فیض کیا اور طویل عرصہ تک ان سے منسلک رہے، تا آنکہ علم و معرفت میں کامل دسترس حاصل کی۔ شیخ صدر الدین محمد کی وفات کے بعد مسند مشیخت کو زینت بخشی۔ خود ان سے ان کے دو بیٹوں۔ عبد الشکور اور عبد الغفور۔ نے استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ شیخ سماء الدین ملتانی اور خلق کثیر نے ان سے علم طریقت کی دولت حاصل کی۔

شیخ کبیر الدین ملتانی نے ۸۲۵ھ کو وفات پائی [۱۵۷]

---

[۱۵۶] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۲۱، بحوالہ مجمع الابرار۔ تذکرہ علمائے ہند (فارسی)، ص ۲۷۳۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ)، ص ۵۸۷۔

[۱۵۷] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۲۱، ۱۲۲۔ بحوالہ سیر العارفین

۷۹- قاضی کمال الدین ناگوری

شیخ کمال الدین بن قوام الدین ناگوری پٹنی، عظیم المرتبت عالم و فقیہ تھے طریقت سے بھی قلبی لگاؤ رکھتے تھے اور مشائخ چشتیہ میں سے تھے۔ شیخ یعقوب پٹنی سے فیض یافتہ تھے۔ ان کو فصوص الحکم سنائی اور خاصی مدت تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔ علاقہ گجرات (کاٹھیاواڑ) کے خواص و عوام میں انھیں بڑی مقبولیت اور عظمت حاصل تھی۔ اس فقیہ و شیخ سے شیخ برہان الدین عبداللہ بن محمود حسینی بخاری اور علماء و مشائخ کی بہت بڑی تعداد نے اخذ فیض کیا۔[۱۵۸]

م

۸۰- شیخ مبارک بنارسی

شیخ مبارک بن حمید حنفی صوفی بنارسی، شیخ صالح اور فقیہ نامدار تھے۔ کبار مشائخ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور کئی سال بنارس میں یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ساتھ ہی مجاہدۂ نفس اور سلوک و ریاضت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ پھر جون پور تشریف لے گئے اور شیخ محمد بن عیسیٰ جون پوری سے اخذ طریقت کیا اور خاصا عرصہ ان کی صحبت میں گزارا۔ جون پور سے پھر عازم بنارس ہوئے اور وہاں کمال قناعت و عفاف اور توکل و استغنا کے ساتھ زہد و عبادت میں مصروف ہو گئے اور دنیا سے منقطع ہو کر یادِ الٰہی کو وظیفۂ حیات قرار دے لیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تدریسِ علوم اور افادۂ عام کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ توکل و قناعت کا یہ عالم تھا کہ کسی سے کوئی ہدیہ یا تحفہ قبول نہ کرتے، البتہ کھانے کی کوئی چیز پیش کی جاتی تو لے لیتے۔ مگر وہ بھی اسی قدر اپنے پاس رکھتے جس قدر

---

[۱۵۸] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۲۳۔

عبادت اور تدریس کے لیے کافی ہو، باقی تلامذہ میں تقسیم کر دیتے۔ تمام عمر گھر نہیں بنایا اُن جھونپڑیوں اور خیموں میں زندگی بسر کرتے جو شاگردوں کے لیے بنائی تھیں۔ سالِ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ صرف اتنا پتا چلا ہے کہ دسویں شوال کو وفات پائی۔[۱۵۹]

۸۱۔ شیخ محمد بن ابوبکر دمامینی

شیخ محمد بن ابوبکر دمامینی کا شجرہ نسب یہ ہے: محمد بن ابوبکر بن عمر بن ابوبکر بن محمد بن سلیمان بن جعفر بن یحییٰ بن حسین بن محمد بن احمد بن ابوبکر بن یوسف بن علی بن صالح بن ابراہیم البدر القرشی المخزومی الاسکندری ثم ہندی گجراتی۔ ان کا لقب بدرالدین تھا اور ابن الدمامینی المالکی النحوی الادیب کے نام سے معروف تھے۔ امام عصر، شیخ وقت اور علامۂ زمان تھے۔ مسلکاً مالکی تھے اور فقہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ پر کامل عبور رکھتے تھے۔

۷۶۳ھ میں اسکندریہ میں پیدا ہوئے۔ ایک قریبی رشتہ دار عالم سے، جو شیخ بہار ابن دمامینی کے نام سے موسوم تھے، سماعت علم کی اور اپنے دورِ طالب علمی کے آخری شیوخ و علما میں سے شیخ عبدالوہاب قروی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ حصولِ علم کے لیے مختلف بلاد و امصار میں گھومے پھرے۔ قاہرہ میں سراج ابن الملقن وغیرہ اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، مکہ مکرمہ میں قاضی ابوالفضل شویری سے تحصیل کی اور خود اپنے شہر اسکندریہ میں متعدد فضلائے دہر کے حضور دو زانو ہو کر بیٹھے، جہاں گئے وہاں کے علما کی صحبتوں سے استفادہ کرتے اور علم و ادراک کی نعمت سے دامنِ طلب بھرتے رہے۔ فقہ و ادب کی دولتِ بے پایاں حاصل کرنے میں بڑی محنت کی اور علم نحو، نظم و نثر، خوش خطی اور اس کے متعلقات و لوازم کی معرفت میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اسکندریہ کے مختلف مدارس میں کتب فقہ اور دیگر

---

۱۵۹ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۲۵۔ بحوالہ گنج ارشدی

علوم میں باقاعدہ درس و تدریس کے فرائض انجام دیے اور قاضی ابن التنیسی کے نائب قاضی کی حیثیت سے منصب قضا پر فائز رہے۔ اسکندریہ سے قاہرہ کے لیے رخت سفر باندھا۔ وہاں کے اساتذہ سے سماعت علم بھی کی، نائب قاضی بھی رہے اور مسند تدریس کو بھی زینت بخشی۔ وہاں کے دوران قیام میں علم و تحقیق کی راہوں پر خوب گام فرسائی کی، ترقی و تقدم کی بہت سی منزلیں طے کیں اور ایک ماہر فن استاذ کی حیثیت سے طلبا کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل علم کی محفلوں اور ارباب تحقیق کی مجلسوں میں ان کی شہرت پھیل گئی۔ وہ جامعہ ازہر میں شعبہ علم نحو کے صدر مدرس مقرر ہوئے اور طلبا انتہائی شوق اور کثرت کے ساتھ ان کے حلقۂ درس میں شریک ہونے لگے۔

بلاشبہ وہ رفیع المرتبت محقق، لائق استاذ، بہترین مدرس اور متنوع علوم کے ماہر اور عالم تھے لیکن ان کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مزاج میں استقلال نہ تھا، طبیعت سکون اور ٹھہراؤ سے محروم تھی اور پاؤں سفر اور گردش کے خواہاں رہتے تھے۔ کہیں جم کر اور دل لگا کر کام کرنے کے وہ عادی نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جامعہ ازہر کے اس منصب جلیلہ کو چھوڑ کر پھر اسکندریہ کا رخ کیا، اور وہاں بیک وقت تین کام شروع کیے۔

اوّل۔ طلبا کو پڑھانے کا۔

دوم۔ عدل و انصاف کا۔

سوم۔ تجارت اور کاروبار کا۔

ظاہر ہے یہ تینوں کام اپنی اپنی جگہ نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور وہ کام ہیں، جن کا ایک ساتھ چلنا مشکل ہے۔ ان میں سے ہر کام الگ ذہن، مستقل ذمہ داری، کامل مصروفیت، ہمہ وقتی توجہ اور پورے غور و فکر کا طالب ہے۔ اگر تدریس اور عدالتی امور سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی جائے گی تو تجارت کے لیے وقت نہیں ملے گا اور اگر تجارت میں انہماک ہوگا تو تدریس اور عدالتی معاملات کی انجام دہی

میں حرج واقع ہوگا۔ یہ اجتماعِ اضداد ہے۔

اب کچھ عرصہ بعد انھوں نے پھر قاہرہ کا قصد کیا۔ چوں کہ اصحابِ علم اور ارکانِ حکومت کے حلقوں میں اچھی طرح متعارف ہو چکے تھے، ان کی شخصیت کے علمی گوشے نکھر کر سامنے آگئے تھے اور خوبیاں نمایاں طور سے لوگوں کے علم و مطالعہ میں آگئی تھیں لہٰذا اب کی بار قاہرہ گئے تو حکومت کی طرف سے منصبِ قضا پیش کیا گیا لیکن انھیں یہ منصب راس نہ آیا اور ان کے ذہن نے، جو خاص قسم کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، اس منصب سے زیادہ عرصہ تک وابستہ رہنے سے انکار کر دیا اور چند ہی روز میں اس سے دستبردار ہو گئے۔

قاہرہ میں بھی زیادہ مدت تک ٹھہر نہ سکے۔ وہاں سے دل اچاٹ ہوا تو علاقہ شام میں چلے گئے اور ۸۰۰ھ میں اپنے چچا زاد بھائی کے ساتھ دمشق جا پہنچے۔ دمشق سے حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے اور پھر اپنے آبائی شہر اسکندریہ کو لوٹے۔ اسکندریہ میں انھیں دو منصب پیش کیے گئے۔ ایک جامع مسجد کی خطابت کا دوسرے نائب قاضی کا۔ انھوں نے نائب قاضی کا منصب تو قبول نہ کیا، البتہ خطابت پر رضامند ہو گئے اور یہ سلسلہ شروع کر دیا۔

کچھ عرصہ بعد ذہن نے ایک اور پلٹا کھایا۔ امورِ دنیا اور کاروبار کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی اور کپڑے بننے کا فن سیکھا اور اس کا ایک اچھا خاصا کارخانہ بھی قائم کر لیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اللہ کو یہ بھی منظور نہ تھا، گھر کو آگ لگی اور مال و اسباب کا بہت بڑا حصہ نذرِ آتش ہو گیا۔ اب وہاں سے بھاگے اور جنگل کی راہ لی۔ قرض خواہ پیچھے دوڑے اور سخت اہانت آمیز انداز سے پکڑ کر انھیں قاہرہ لے آئے۔ مگر شیخ تقی الدین بن حجت اور ناصر الدین البارزی کے پرائیویٹ سیکریٹری ان کی امداد کے لیے قرض خواہوں کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ انھوں نے ان کی اعانت کی اور معاملہ سلجھ گیا۔

اس واقعہ کے بعد وہ ملک المؤید کے دربار میں حاضر ہوئے، اس نے ان کو مالکیہ کے منصبِ قضا پر متعین کر دیا مگر یہ منصب بھی انھیں راس نہ آیا۔ پھر وہ ۸۱۹ھ

میں عازمِ حجاز ہوئے اور حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ مناسکِ حج ادا کرنے کے بعد ۸۲۰ھ میں بلادِ یمن میں داخل ہوئے، وہاں تقریباً ایک سال مقیم رہے اور اس اثنا میں جامع زبید میں تشنگانِ علوم کے لیے سیرابیٔ علم وادراک کے سامان فراہم کرتے رہے۔ مگر یہ فضا بھی ان کے ذہن و فکر سے ہم آہنگ نہ ہوسکی اور اپنی زندگی کا جو نہج انھوں نے بنایا تھا، وہ وادیٔ یمن سے موافقت پیدا کرنے اور اس سے تعلقات استوار کرنے میں کامیاب نہ ثابت ہوا۔

ورودِ ہند

سالہا سال کی گردش لیل و نہار کی بے شمار کروٹوں کے بعد اب انھوں نے اپنے مستقبل کو ایک اور تجربے کے حوالے کرنے کی ٹھانی اور سرزمین ہند میں آنے کا قصد کیا۔ چنانچہ اواخر شعبان ۸۲۰ھ میں داخلِ ہند ہوئے۔ ارضِ گجرات میں قیام کیا اور پھر اسی کو مستقل وطن قرار دے لیا۔ اس زمانے میں گجرات (کاٹھیاواڑ) اور احمد آباد وغیرہ کے علاقے پر سلطان احمد بن محمد بن مظفر گجراتی کا پرچم اقتدار لہرا رہا تھا اور اس نواح کے اکثر بلاد و امصار اور قصبات و دیہات کو علما و مشائخ کے مسکن کی حیثیت حاصل تھی اور اہلِ علم اور اصحابِ طریقت و تصوف کو انتہائی وقار و تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اربابِ حکومت کے نزدیک بھی ان کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی اور رعایا کے تمام طبقات میں بھی وہ معزز و محترم تھے۔ شیخ ابن الدمامینی مالکی کو بھی یہاں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی، بدرجہ غایت گرم جوشی سے ان کا خیر مقدم کیا گیا اور علم و تحقیق کی محفلوں میں ان کو بڑا عروج نصیب ہوا۔ لوگ ان کی طرف دوڑے اور ہر شخص نے ان کی تعظیم میں دوسرے سے سبقت لے جانے کی سعی کی۔ جواب میں انھوں نے بھی دریا دلی کا مظاہرہ کیا اور پوری وسعت قلب سے لوگوں کے لیے اپنے علم و فضل کے دروازے کھول دیے جس میں سے ہر ایک نے بقدرِ ظرف اپنا حصہ وصول کرنے کی کوشش کی۔ جب انھوں نے علم کے خزانے لوٹائے۔ اور دین کی اشاعت کا اہتمام کیا تو دنیا بھی ان کے قدموں میں آگری، اس نے اپنا شامیانہ ان پر پھیلا دیا اور ان کا شمار زمرۂ اہلِ علم کے ساتھ ساتھ، اربابِ دولت

اور اصحابِ جاہ میں بھی ہونے لگا۔

تصنیفات

یہ جلیل القدر اور مالکی المسلک فقیہ متعدد علمی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف اور شارح ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

شرح التسہیل: یہ ابن مالک الطائی کی تصنیف التسہیل کی شرح ہے جو گوناگوں اور متنوع مسائل کا حسین امتزاج ہے۔ اس کا آغاز اللّٰھم ایاک نعبد علی نعم ما توجہت الآمال...... الخ کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ یہ شرح، وہ اسکندریہ کے دورانِ قیام میں ضبطِ تحریر میں لائے تھے اور اپنے ساتھ ہی اسے ہندوستان لے آئے تھے۔ اس کے آغاز میں واردِ ہند ہونے کے بعد بطور مقدمہ کے بعض چیزوں کا اضافہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں اواخر شعبان ۸۲۰ھ میں ملکِ ہند کے شہر گجرات آیا تو میں نے دیکھا کہ یہاں میری اس کتاب سے کوئی شخص آگاہ نہ تھا۔ میں نے یہ کتاب بعض طلبا کو دکھائی تو وہ اس کے مضامین سے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے اس کی شرح بھی کی۔ مقدمہ کتاب میں انھوں نے اس زمانے کے فرمانروائے گجرات سلطان ابوالفضل احمد شاہ کا ذکر بھی کیا ہے اور اس حصۂ کتاب کو تاریخ الفرائد کے نام سے موسوم کیا۔

مصابیح الجامع: یہ صحیح بخاری کی شرح ہے۔ اس کا آغاز: الحمد للّٰہ الذی فی خدمۃ السنۃ النبویۃ اعظم سیادۃ۔ الخ سے ہوتا ہے صحیح بخاری کی یہ شرح انھوں نے گجرات آکر لکھی۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب وہ سلطان احمد شاہ کے لیے معرضِ تحریر میں لائے ہیں۔ اس میں انھوں نے بخاری شریف کے کئی ابواب کی تعلیق کی ہے۔ بعض مقامات بڑے عمدہ ہیں، جن میں اعراب نحوی کے نقطۂ نظر سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر امور و مسائل کو بھی منقح کیا گیا ہے۔

عین الحیوٰۃ: یہ دمیری کی کتاب حیوٰۃ الحیوان الکبریٰ کا اختصار ہے۔ یہ کتاب الحمد للّٰہ الذی اوجد بفضلہ حیوٰۃ الحیوان۔ الخ سے شروع

ہوتی ہے۔ اسی طرح حیٰوۃ الحیوان الکبریٰ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مصنف علام کی یہ کتاب احکام شرعیہ، اخبار نبویہ، مواعظ نافعہ، فوائد بادعہ، عمدہ امثال بہترین اشعار بعض نادر امور اور عجیب و غریب اسرار و رموز کو محتوی ہے، لیکن بڑی طویل المقال اور وسیع الذیل ہے اور اس میں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں، جن سے کتاب کی افادی حیثیت مجروح ہوتی ہے اور محاسن و اوصاف سے خالی دکھائی دیتی ہے، اس لیے اس کو مختصر کر دیا گیا ہے اور عین الحیٰوۃ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کی ترتیب و اختصار سے وہ ۸۲۳ھ میں فارغ ہوئے اور اس کو انھوں نے سلطان احمد شاہ کی خدمت میں بطور ہدیہ کے پیش کیا۔

تحفۃ الغریب فی شرح مغنی اللبیب: یہ کتاب ابن ہشام نحوی کی مشہور تصنیف مغنی اللبیب کی شرح ہے۔ مغنی پر تحشیہ و تعلیق تو انھوں نے مصر ہی میں لکھ دیا تھا اور یہ بڑا نفیس حاشیہ تھا، مگر اس کو باقاعدہ تصنیف اور شرح کے قالب میں ارض ہند میں ڈھالا۔ اس کا جو حصہ انھوں نے مصر میں مکمل کیا، اس کو حاشیہ بمنیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو ہند میں لکھا، اسے حاشیہ ہندیہ کا نام دیا جاتا ہے۔

شرح الخزرجیہ:

جواہر البحور: یہ کتاب علم عروض سے متعلق ہے۔

الفواکہ البدریہ۔ یہ ان کے حصۂ نظم پر مشتمل ہے اور مجموعہ اشعار کی حیثیت رکھتی ہے۔

مقاطع الشرب:

الغیث الذی انسجم فی شرح لامیۃ العجم: یہ صلاح الدین صفدی کے لامیۃ العجم کی شرح ہے۔

اس کے علاوہ وہ اور بھی متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔

ادبی ذوق اور شعر و شاعری

شیخ محمد بن ابو بکر دمامینی علوم ادب اور فن شعری کا عمدہ ذوق رکھنے اور اس کے ناقد تھے۔ اصحاب فن کا کہنا ہے کہ وہ نثر کے ساتھ نظم اور قصائد و مقاطع

میں بھی بہت آگے نکلے ہوئے تھے اور پاکیزہ شعر کہتے تھے۔ ابنِ ناہض نے حاکمِ مصر مؤید کی سیرت لکھی تو انھوں نے اس پر تنقید و تقریظ کی۔

ایک شخص نوروز حافظی نے شام میں مؤید کی نافرمانی کی اور اس کے خلاف بغاوت کا مرتکب ہوا تو محمد بن ابو بکر دمامینی نے مؤید کو مخاطب کر کے یہ اشعار کہے:

یا ملک العصر و من جودہ — فرض علی الصامت واللافظ

اشکو الیک الحافظ المعتدی — بکل لفظ فی الدجی غائظ

وما عسی اشکو وانت الذی — صح لک البغی من الحافظ

اے شاہِ زمانہ اور اے وہ جس کی سخاوت ہر خاموش رہنے والے اور بات کرنے والے پر فرض ہو چکی ہے

میں تم سے اس ظالم حافظ کے خلاف تمام غصہ دلانے والے الفاظ سے تاریکی میں شکوہ کرتا ہوں۔

میں تم سے اس لیے شکوہ کرتا ہوں کہ تم ہی وہ شخصیت ہو، جس کا حافظ کی زیادتی کے بارے میں کوئی اقدام کرنا صحیح ہوگا۔

یہ اشعار بھی ان ہی کے ہیں:

رمانی زمانی بما ساءنی — فجاءت نحوس وغابت سعود

واصبحت بین الوری بالمشیب — علیلا فلیت الشباب یعود

زمانے نے مجھ پر ایسے چرکے لگائے، جنھوں نے مجھے بہت تکلیف پہنچائی، اس کے نتیجے میں نحوستیں، ہجوم کر آئیں اور سعادتیں رخصت ہو گئیں۔

اور میں لوگوں کے درمیان بڑھاپے کی وجہ سے بیمار ہو گیا۔ پس اے کاش کہ جوانی لوٹ آتی۔

یہ دو شعر بھی ان ہی کے ہیں:

قلت لہ والدجی مول — ونحن بالانس فی التلاقی

قد عطس الصبح یا حبیبی — فلا تشمتہ بالفراق

جب تاریکی رخصت ہو رہی تھی اور ہم ملاقات سے لطف اندوز ہو رہے تھے تو میں

نے اس سے کہا۔ اے میرے محبوب! وہ پھٹ گئی ہے مگر تو اس کا جواب فراق کی صورت میں نہ دینا۔

ان کے اشعار میں سے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں:

یا عذولی فی مغن مطرب　　حرک الاوتاد لما سفرا

کم یهزالعطف منه طربا　　عند ما تسمع منه وترا

جو گانے والا مطرب روز روشن میں تاروں کو چھیڑتا ہے، اس کے بارے میں مجھے ملامت کرنے والو، جب تم اس کا ایک تار بھی (بجتے) سنو تو وہ تمھیں جوش میں لاکر کام کے لیے ابھارتا ہے۔

برہان محلی تاجر کے لیے ان کے یہ دو شعر لائق ملاحظہ ہیں:

یا بحر یا معروفه لیس یحصی　　ورئیسا زکا بفرع و اصل

مذ علا فی الوری محلک عزا　　قلت هذا هو العزیز المحلی

اے وہ نہر، جس کے فیضان کا کوئی شمار نہیں اور اے وہ رئیس، جس کی فرع اور اصل دونوں عمدہ ہیں۔

جب سے تیرے محل (مقام) کا اعزاز لوگوں میں بلند ہوا ہے۔ (تب سے) میرا کہنا ہے کہ عزیز محلی تو یہ ہے۔

شہاب فاروقی کی سخاوت وجودت کے بارے میں یہ دو شعر بھی پڑھتے جائیے:

قل للذی اضحی یعظم حاتما　　ویقول لیس بجوده من لاحق

ان قسته بسماح اهل زماننا　　اخطأ فیاسک مع وجود الفارق

جو شخص حاتم کی عظمت بیان کرتا ہوا یہ کہتا ہے کہ اس کے بعد اس جیسی سخاوت کہیں نہیں، اس سے کہہ دو کہ

اگر تم ہمارے دور کے فیاض لوگوں پر اسے قیاس کرو گے تو قیاس مع الفارق کی غلطی کرو گے۔

مصر کی تعریف میں ان کے یہ دو شعر سنیے:

رعی الله مصرا اننا فی ظلالها　　نروح ونغدو سالمین من النکد

ونشرب ماء النیل منها براحة　　واهل زبید یشربون من الکد

اللہ اس شہر کی نگرانی کرے، جس کے زیرِ سایہ ہم لوگ تھکاوٹ اور تکلیف سے محفوظ رہ کر رات اور دن گزارتے ہیں۔

اور دریائے نیل کا پانی راحت کے ساتھ پیتے ہیں اور زبید کے باشندے کد (کاوش) کے ساتھ پیتے ہیں۔

یہ دو شعر بھی سنیے:

قالت وقد فتحت عیونا نعسا ترمی الوری بالجود فی الاحکام

احذر ہلالک فی زبید فاننی لذوی الغرام فتحت باب سہامی

اس نے اپنی نیند سے بھری ہوئی آنکھیں کھول کر کہا کہ لوگوں پر ظالمانہ احکام کے تیر برسائے جاتے ہیں۔

مگر تم زبید میں ان کی بوچھاڑ سے چوکس رہو، اس لیے کہ میں نے اہلِ عشق کے لیے اپنے تیروں کا دروازہ کھول دیا ہے۔

ہندی علماء سے مخاطب ہو کر چند اشعار میں علمِ نحو کا ایک سوال پوچھتے ہیں:

ایا علماء الہند انی سائل فمنوا بتحقیق بہ یظہر السر

فما فاعل قد جر بالخفض لفظہ صریحا ولا حرف یکون بہ جر

ولیس بذی جر ولا بمجاور لذی الخفض والانسان للجر یضطر

فمنوا بتحقیق بہ استفیدہ فمن بحرکم ما زال یستخرج الدر

اے علمائے ہند! میں ایک سوال پوچھتا ہوں، مہربانی کر کے اس کا ایسا تحقیقی جواب دیجیے کہ جس سے وہ عقدہ کھل جائے۔

کوئی فاعل ایسا نہیں جو لفظاً صریح طور مجرور ہو، درآں حالیکہ کوئی ایسا حرف بھی موجود نہیں جو اسے جر دے۔

کوئی دوسرا عامل جار بھی نہیں اور مجرور کے لیے اعراب جوار بھی نہیں کہ انسان جر کے لیے بے تاب ہو۔

تو از راہِ عنایت ایسی تحقیق سے بتایے کہ میں اس سے مستفید ہو سکوں، کیوں کہ آپ کے

دریا سے تو ہمیشہ موتی ہی نکالے جاتے ہیں۔

یہ شعر بھی ملاحظہ ہو:

بجفان نعتری نادبنا وسدیف حین ھاج الصنبر[۱۶۰]

ہولئے سرما میں، جب ہیجان پیدا کرنے والی روانی پیدا ہوتی ہے، تو ہماری قوم بڑے بڑے پیالوں اور کوہان کی چربی کے گرد جمع ہو جاتی ہے۔

انتقال

علامہ محمد بن ابو بکر دمامینی نے ماہ شعبان ۸۲۷ھ کو گلبرگہ میں وفات پائی۔

ایک روایت کے مطابق انھیں انگور میں زہر دے دیا گیا تھا، زہر کے تھوڑا عرصہ بعد ان کا انتقال ہو گیا[۱۶۱]

۸۲۔ شیخ محمد بن ابو البقاء حسینی نقوی کرمانی

شیخ محمد بن ابو البقا کا سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن ابو البقا بن موسیٰ بن ضیاء الدین بن شجاع بن منظر بن منصور بن غیاث بن محمود بن علی بن احمد بن عبد اللہ بن علی نقی حسینی کرمانی، فاضل اور علامہ تھے۔ اصلاً کرمان کے باشندے تھے۔ ان کے جد امجد ضیاء الدین

---

[۱۶۰] یہاں مولانا سید عبد الحی حسنی لکھنوی نزہۃ الخواطر میں حضرت مولانا ابو عبد اللہ محمد بن یوسف سورانی کے حوالے سے تم طراز ہیں کہ ابن جنی (نحوی، سر الصناعۃ و اسرار البلاغۃ) میں کہتے ہیں کہ لفظ صنبو میں "ر" حالت رفعی میں ہے، اس لیے "ب" کو مضموم ہونا چاہیے لیکن یہاں فعل بمعنی مصدر کی طرف اضافت مقدر ہے۔ گویا وہ "حین ھیج الصنبر" کہنا چاہتا ہے مطلب یہ ہے کہ ظرف در اصل مصدر کی طرف مضاف ہوتا ہے اور یہاں حین (ظرف، فعل (ھاج) کی طرف مضاف ہے پس لفظ "صنبر" مجرور اس لیے ہے کہ یہ فعل بمعنی مصدر کی طرف مضاف ہے۔ اس لیے یہ اسم اگرچہ فاعل ہونے کی وجہ سے حالت رفعی میں ہے لیکن یہاں (مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے) مجرور ہے۔ (نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۳۰ حاشیہ)

[۱۶۱] الضوء اللامع ـــــــ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۲۵ تا ۱۳۱۔

بن شجاع الدین کرمان سے ہندوستان آئے اور دہلی میں قیام پذیر ہوئے۔ دہلی سے لکھنؤ گئے اور پھر وہیں سکونت اختیار کرلی۔ محمد بن ابو البقاء کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی، وہیں پرورش پائی اور حصولِ علم میں مشغول ہوگئے۔ وہاں سے جون پور گئے جو اس زمانے میں علم و علما کے مرکز کی حیثیت سے ہند اور بیرونِ ہند میں مشہور تھا۔ جون پور میں شیخ ابوالفتح بن عبدالحی بن قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی دہلوی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان سے کتبِ درسیہ کی تکمیل کی۔ ظاہری علوم سے فراغت کے بعد ان ہی سے اخذِ طریقت بھی کیا۔ جب دونوں قسم کے علوم کی تحصیل کرچکے تو مراجعت فرمائے لکھنؤ ہوئے اور ایک عرصہ تک درس و تدریس اور افادۂ عام میں مصروف رہے۔ اس اثنا میں شیخ محمد بن قطب الدین لکھنوی، قاضی سعدالدین خیرآبادی اور خلقِ کثیر نے ان سے کسبِ علم کیا۔

خیرالزماں لکھنوی، اپنی کتاب باغ بہار میں رقم طراز ہیں کہ شیخ محمد بن ابوالبقا کرمانی کے ایک لڑکے کا نام احمد تھا اور ایک شاگرد بھی احمد کے نام سے موسوم تھے۔ شیخ نے ان دونوں کے ساتھ حجاز کا سفر کیا، مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ تینوں حضرات درہم و دینار سے تہی کیسہ تھے اور زادِ راہ کے لیے انھوں نے توکل علی اللہ اور توفیقِ ذاتِ الٰہی کو کافی سمجھا۔ حج بیت اللہ کی نعمت سے سرفراز ہوئے اور چھ سال تک دیارِ حبیب میں مقیم رہے۔ حرمین شریفین میں کبار شافعی المسلک علما و فقہا بھی اقامت گزیں تھے۔ وہاں ان سے ان اہم فقہی مسائل پر مباحثے ہوئے، جو شوافع اور احناف کے درمیان مختلف فیہ ہیں۔ شیخ محمد بن ابوالبقا کی علمی گفتگو اور اسلوبِ بحث سے متاثر ہو کر شافعی علما نے ان کو ''اعظم ثانی''، یعنی امام ابوحنیفہ ثانی کا لقب دیا۔

شیخ وجیہ الدین جندواروی، اپنی تصنیف مصباح العاشقین میں شیخ محمد بن ابوالبقا کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ اپنے عصر کے کبار علما میں سے تھے۔ ان کے علاقے کے لوگ تحقیقِ مسائل اور فتوے کے لیے ان ہی کی طرف رجوع کرتے۔ سلطان ابراہیم شرقی، ان کے علمی فضل و کمال کی وجہ سے ان کا معتقد تھا اور مسائلِ شرعیہ میں ان سے استفتا کرتا تھا۔

صاحب مصباح العاشقین اس کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ سلطان نے اہل کفر کے اس گروہ سے قتال کے لیے ایک لشکر روانہ کیا، جنھوں نے سلطانی احکام سے تمرد اور سرکشی اختیار کرلی تھی۔ مگر اس لڑائی میں بعض وہ کافر بھی قتل کیے گئے اور ان کا مال و دولت بھی غصب و نہب کی زد میں آگیا جو سرکشی اور نافرمانی کے مرتکب نہ تھے۔ یہ بات سلطان کے علم میں آئی تو اس نے شیخ محمد کی طرف رجوع کیا اور ان سے استفتا کیا کہ یہ صورتِ حال پیش آگئی ہے، اس ضمن میں شرعی احکام کیا ہیں؟ شیخ نے جواب دیا کہ ان سے قتال مباح ہے، کفارِ ہند سب کے سب دشمن اسلام ہیں۔ وہ مسلمانوں سے لڑائی کے لیے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ لہٰذا ان کا قتل کرنا اور ان کے اموال کو غنیمت قرار دینا جائز ہے۔

مفتی سلطان حسن بریلوی، غایۃ التقریب میں تحریر فرماتے ہیں کہ شیخ محمد دیگر علوم کے ساتھ ساتھ منطق میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے منطق کی اشکالِ اربعہ کو اشعار کی صورت میں ڈھال دیا ہے۔ ان اشعار میں موجبہ کلیہ کو ا، سالبہ کلیہ کو ب، موجبہ جزئیہ کو ج اور سالبہ جزئیہ کو د کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ ان کے وہ اشعار فارسی میں ہیں اور درج ذیل ہیں:

کل و لا شیٔ و بعض و لیس الکل دور باد از رخ تو دشمنۂ دل
سورہائے سوراست شمار ابجد آمد نشان آن ہر چہار
اا اب جا جب نخستین راست اب و باجب ود لیس بر خاست
ااا ب جا جب دا ج د ا د سیومین راست خذو لا تطعن
اا ج ب ا ب ا ب د د ا ادبج شکل چار مین راہن

شیخ محمد بن ابوالبقا کرمانی نے ۱۲ر شوال ۸۷۰ھ کو لکھنؤ میں وفات پائی اور انھیں شہر کی جانب مغرب میں دریائے گومتی کے کنارے دفن کیا گیا۔ بعد ازاں لوگوں نے وہاں اونچی اونچی عمارتیں تعمیر کرلیں۔ پھر حاکم لکھنؤ آصف الدولہ نے اس کے قریب "حسینیہ" کے نام سے ایک آبادی قائم کی تو اس نے شیخ محمد کے مقبرہ کو منہدم کر دینے کا حکم دیا۔

چنانچہ لوگوں نے ان کی قبر کھود دی، اس میں سے ہڈیاں نکالیں اور انھیں لکھنؤ کی ایک اور آبادی میں جس کا نام مفتی گنج ہے، دفن کر دیا[۱۶۲]

۸۳- شیخ محمد بن احمد حسینی بخاری اوچی

شیخ محمد بن احمد بن حسین بن علی حسینی بخاری، مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید جلال الدین حسین بخاری اوچی کے چھوٹے بھائی تھے۔ ظاہری و باطنی علوم میں یکتا اور جلالتِ قدر کے مالک تھے۔ صدر الدین لقب تھا اور لوگوں میں شیخ صدر الدین اوچی ملتانی راجو قتال کے نام سے معروف تھے۔ پنجاب کے شہر اوچ میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی، اور اپنے والد بزرگوار شیخ احمد بن حسین بخاری اور برادرِ کبیر شیخ جلال الدین حسین بن احمد بخاری اوچی سے اخذِ علم اور کسبِ فیض کیا۔ ان ہی سے خرقۂ تصوف پہنا اور ان کے بعد مسندِ مشیخت پر متمکن ہوئے۔

شیخ صدر الدین محمد جلیل القدر عالم دین، عظیم المرتبت فقیہ اور زاہد شب زندہ دار تھے۔ اولیائے سالکین احد اصحابِ مجاہدہ و ریاضت میں سے تھے۔ ان کی ولایت و جلالت پر لوگوں کا اتفاق ہے۔

ان کے تلامذہ اور ان سے فیض یافتہ حضرات کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں شیخ کبیر الدین بن اسماعیل بخاری بھی شامل ہیں۔ ایک روایت کے مطابق ان سے اتنی کثیر تعداد میں لوگوں نے استفاضہ کیا کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔

ان کے چار بیٹے تھے۔ ابو الخیر، ابو اسحاق، شیخ جلال الدین اور روح اللہ۔ ان کے بعض اعقاب و اخلاف سرہند میں جا بسے تھے۔

منقول ہے کہ ان کی نظر بڑی تیز، مؤثر اور مرعوب کن تھی۔ جس شخص پر جلال میں آکر نگاہ ڈالتے، فوراً بے ہوش ہو کر گر پڑتا اور جان دے دیتا۔ اس قسم کے متعدد واقعات

---

[۱۶۲] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۳۱ تا ۱۳۲ بحوالہ باغ بہار۔

تذکروں میں مرقوم ہیں۔

ان کی محبتِ اسلام، فقہی حیثیت اور عظمت و جلالت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرشتہ لکھتا ہے کہ جب مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو ایک کافر جس کا نام نواہون تھا اور سلطان فیروز شاہ باربک کی طرف سے اوچ کا حاکم تھا، مخدوم جہانیاں کی عیادت کو آیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات گرامی کو ختم الاولیا بنایا ہے، جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ختم الانبیا تھے۔ خدا تعالیٰ آپ کو صحت عاجلہ و کاملہ عطا فرمائے۔ نواہون کی زبان سے یہ الفاظ سن کر سید جلال الدین حسین اپنے بھائی شیخ صدر الدین محمد کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا، اس شخص نے آنحضرت کی نبوت کا اقرار کیا ہے، لہٰذا شریعت کی رُو سے اب یہ مسلمان ہوگیا ہے۔ تم اور حضّارِ مجلس اس کے گواہ ہو، اسے اب باقاعدہ زمرۂ مسلمین میں شامل کرو۔

نواہون نے یہ بات سُنی تو وہ قبولِ اسلام کے خوف سے بھاگ گیا اور سلطان فیروز شاہ سے سارا واقعہ بیان کیا۔ فیروز باربک کے نزدیک نواہون بڑی عزت کا مالک تھا اور وہ اس کو دوست سمجھتا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس نے نواہون سے کہا کہ اگر تم نے فی الواقع یہ الفاظ کہے ہیں تو بلاشبہ تو مسلمان ہوا۔ سید جلال الدین حسین بخاری تو وفات پا گئے اور معاملہ سید صدر الدین محمد بخاری کے سپرد ہوا۔ انھوں نے اپنے بڑے بھائی کی تجہیز و تدفین وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد نواہون کے معاملے کے گواہوں کو ساتھ لیا۔ اور فیصلے کے لیے عازم دہلی ہو گئے۔ شہر کے قریب پہنچے تو سلطان نے ان کے استقبال کا اہتمام کیا اور علمائے دہلی کو جمع کر کے ان سے نواہون کے بارے میں استفسار کیا۔ اس زمانے میں دہلی کے اہل علم میں سے قاضی عبدالمقتدر کے بیٹے شیخ محمد، علم و فہم اور جودتِ طبع میں مشہور تھے۔ انھوں نے سلطان کو مشورہ دیا کہ سید صدر الدین محمد کے استقبال کے لیے جانا چاہیے اور پھر وہیں مجلس میں ان سے یہ سوال کیا جائے کہ کیا آپ اس کافر کے سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟ اگر وہ یہ کہیں کہ ہاں اس کافر ہی کے لیے آیا ہوں تو یہ خود ان ہی کی زبان سے اس کے کفر کا اقرار ہوگا اور ہم ان سے اس مسئلہ سے متعلق بات نہ کریں گے۔

بحث کریں گے۔ چنانچہ سلطان نے ان کی فہمائش اور تجویز کے مطابق پہلی ہی مجلس میں سید صدر الدین محمد سے پوچھا کہ آپ اس کافر کے سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟ فرمایا اس مسلم کے سلسلے میں آیا ہوں۔ اب شیخ محمد بن عبدالمقتدر سامنے آئے اور کہا۔ "اے سید! اس لفظ کی وجہ سے، جو اس نے زبان سے نکالا، اس پر اسلام لازم نہیں آتا۔" سید نے فرمایا۔ اے مخدوم زادہ! آپ کی اس بات سے بوئے دیانت نہیں آتی۔ اپنے کفن کی فکر کرو۔ یہ کہہ کر ان کی طرف تیز نظر سے دیکھا اور فوراً ان کے پیٹ میں شدید درد پیدا ہوا، گھر گئے اور جا کر لیٹ گئے۔ ان کے والد قاضی عبدالمقتدر اس مجلس میں موجود تھے، وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور عزت و تعظیم بجالا کر سید کی خدمت میں عرض پرداز ہوئے کہ میرا یہی ایک لڑکا ہے، میری عجز و انکساری پر رحم کرکے اس کو معاف کر دیجیے۔ فرمایا۔ وہ تو مر چکا ہوگا، لیکن آپ کا وہ بچہ جو شکم مادر میں ہے، اہل تقویٰ میں سے ہوگا۔ چنانچہ شیخ محمد تو اس درد کی شدت سے وفات پا گئے اور قاضی عبدالمقتدر کو اللہ نے ایک اور لڑکا عطا فرمایا جس کا نام انھوں نے ابوالفتح رکھا۔ [۱] اور وہ فی الواقع متقی و پرہیزگار اور عالم و فقیہ ہوئے۔ انھوں نے جون پور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔

اس گفتگو کے بعد فیروز شاہ باربک نے نواہون کو سید صدرالدین محمد کے سپرد کیا اور کہا کہ اس کے بارے میں شریعت کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے۔ سید موصوف نے نواہون

---

[۱] یہاں مورخ فرشتہ کو سہو ہو گیا ہے، شیخ ابوالفتح، جو شیخ ابوالفتح جون پوری کے نام سے معروف ہیں، قاضی عبدالمقتدر کے بیٹے نہ تھے بلکہ ان کے پوتے تھے اور قاضی عبدالمقتدر کے فرزند عبدالحی کے بیٹے تھے۔ ملاحظہ ہو، اخبار الاخیار، ص ۱۷۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۳۔ حدائق الحنفیہ، ص ۳۲۲۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۶۰۳ تا ۶۰۵۔

یاد رہے یہ وہی قاضی عبدالمقتدر تھانیسری شریحی کندی ہیں، جو مشہور عالم و فقیہ تھے۔

سے فرمایا کہ تو مسلمان ہوگیا ہے، اپنے آپ پر شعارِ اسلام ظاہر کر، لیکن اس نے انکار کیا تو اس کو قتل کر دیا اور پھر اپنے وطن اوچ تشریف لے گئے اور مدت مدید تک اپنے برادرِ کبیر مخدوم جہانیاں سید جلال الدین حسین بن احمد بخاری کے خلیفہ کی حیثیت سے دعوت و ارشاد میں مشغول رہے۔

شیخ صدرالدین محمد بن احمد حسینی بخاری اوچی نے ہفتہ کی رات ۱۶ رجمادی الاخریٰ ۸۲۷ھ کو اوچ میں وفات پائی اور اپنے آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے [۱۶۴]۔

۸۴۔ شیخ محمد بن حسین پٹنی

شیخ محمد بن حسین علوی حسینی سندھی ثم گجراتی، علم حدیث اور فقہ کے عالم تھے اور مشہور مشائخ میں سے تھے۔ دراصل یہ ارضِ سندھ سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق ملتان کے باشندے تھے اور سید خدابخش بن سید حسین کے نام سے معروف تھے، وہیں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی اور اپنے والد بزرگوار شیخ حسین علوی اور شیخ صدرالدین محمد بن احمد حسینی بخاری سے علم حاصل کیا۔

یہ وہ عالم دین تھے، جو حدیث، فقہ اور تصوف میں یگانۂ روزگار تھے۔ نہایت صحیح العقیدہ اور مبنی بر صحت فکر و خیال کے حامل صوفی تھے۔ شیخ عبداللہ بن محمود حسینی بخاری کی والدہ مکرمہ سعادت خاتون کے ساتھ گجرات کے لیے رختِ سفر باندھا اور پھر وہیں اقامت پذیر ہو گئے۔

۵ رجمادی الاخریٰ ۸۴۷ھ کو شہر پٹن میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے [۱۶۵]۔

---

[۱۶۴] تاریخ فرشتہ، ج ۲، ص ۶۸۸ تا ۶۹۰۔ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۹۳۳ء۔ اخبار الاخیار، ص ۱۵۴۔ نیز ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۳۳، ۱۳۴۔

[۱۶۵] تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۳۵۔ بحوالہ مرآۃ احمدی۔

۸۵۔ شیخ محمد حسین ٹھٹھوی

شیخ محمد حسین بن احمد بن محمد حسینی ٹھٹھوی سندھی، صالح عالم دین اور فقیہ تھے۔ معروف مشائخ اور اصحابِ فضل و صلاح میں سے تھے۔ ۸۳۱ھ میں فتح خاں بن اسکندر سندھی کے عہدِ حکومت میں پیدا ہوئے اور وہیں کے علما سے فیضِ علم و معرفت حاصل کیا اور مسندِ رشد و ہدایت پر فائز ہوئے۔ ان سے بے شمار لوگوں نے استفاضہ کیا۔ محمد حسین صفائی نے ان کے حالات میں ایک کتاب تصنیف کی، جس کا نام تذکرۃ المراد رکھا۔

اس نامور عالم و فقیہ اور عظیم شیخ نے باسٹھ ۶۲ سال عمر پا کر ۸۹۳ھ میں وفات پائی۔[۱۶۶]

۸۶۔ شیخ محمد بن رفیع الدین بخاری

شیخ محمد بن رفیع الدین کا نسب نامہ یہ ہے۔ محمد بن رفیع الدین بن محمد بن عبد الوہاب بن محمد بن حسین بن محمد بن حسین حسینی بخاری اُوچی۔ شیخ صالح اور فقیہ تھے اور معروف رجال فضل و صلاح میں سے تھے۔ سرزمین سندھ میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ اپنے والد گرامی قدر سے علم فقہ حاصل کیا اور ان ہی سے درسِ طریقت لیا یہ شیخ عبد الوہاب ابو محمد حسینی بخاری دہلوی کے والد تھے۔

شیخ محمد بن رفیع الدین کی وفات ۸۸۱ھ میں ہوئی۔[۱۶۷]

۸۷۔ شیخ محمد بن عبد اللہ حسینی بخاری گجراتی

شیخ محمد بن عبد اللہ بن محمود بن حسین حسینی بخاری گجراتی، شیخ محمد زاہد کے نام سے

---

۱۶۶ تحفۃ الکرام، ص ۔ نزہۃ الخواطر ج ۳، ص ۱۳۵، ۱۳۶

۱۶۷ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۳۶۔ بحوالہ تذکرۃ السادۃ البخاریہ از علی اصغر گجراتی

معروف تھے۔ علم وفقاہت، اتقاء و صالحیت اور زہد و عبادت کے اوصاف سے متصف تھے۔ ان کی تاریخ ولادت ۹ رجب ۸۸۴ھ ہے۔ جلیل القدر علمائے عصر سے اخذِ علم اور کسبِ فیض کیا اور اونچے مرتبے کو پہنچے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود بھی مسندِ تدریس آراستہ کی اور اپنے فیوض علم و تصوف سے خلقِ کثیر کو مستفیض فرمایا۔
اس عظیم فقیہ اور بلند مرتبہ صوفی نے ۶ شعبان ۹۸۲ھ کو وفات پائی۔ ان کی قبر قریہ بٹوہ میں ہے۔[۱۶۸]

۸۸۔ شیخ محمد بن علاء الدین منیری

شیخ محمد بن علاء الدین بن قاضی عالم بن قاضی جمال الدین ہاشمی ترہتی ثم منیری یہ شیخ قاضن کے نام سے معروف تھے۔ طریقہ شطاریہ کے کبار مشائخ میں سے تھے۔ زہد و عبادت میں بے مثال تھے اور علوم متداولہ و متعارفہ، بالخصوص علمِ فقہ میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ تمام طرقِ تصوف کے ماہر تھے۔ طریقہ فردوسیہ اپنے والد شیخ علاء الدین سے اخذ کیا تھا۔ اس ضمن میں ان کا سلسلۂ سند شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری تک پہنچتا ہے۔ طریقۂ سہروردیہ کے لیے شیخ رکن الدین جونپوری سے کسبِ فیض کیا۔ ان کے اس سلسلۂ سند میں پانچویں بزرگ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ہیں طریقہ چشتیہ کے لیے شیخ زاہد بن بدر الدین چشتی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ یہ سند شیخ نظام الدین اولیا بدایونی سے ملتی ہے۔ سلسلۂ قادریہ میں ان کے مرشد شیخ عبدالوہاب بن عبدالرحمٰن بن جمال الدین صدیقی ہیں۔ طریقہ مداریہ میں شیخ حسام الدین اصفہانی جونپوری سے بیعت ہیں جو براہِ راست امام طریقہ مداریہ شیخ معمر بدیع الدین المدار سے بیعت تھے۔ طریقہ شطاریہ میں بغیر کسی واسطے کے امام طریقہ شطاریہ شیخ عبداللہ بن حسام الدین شطاری نوی صدیقی بخاری سے مستفیض ہوئے۔

---

۱۶۸ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۳۹، ۱۴۰، بحوالہ مرأت احمدی

خود اس جلیل القدر عالم، نامور فقیہ اور عظیم صاحب طریقت و تصوف کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا، جن میں ان کے لڑکے شیخ ابو الفتح ہدیۃ اللہ منیری، شیخ حمید الدین گوالیاری اور بہت سے لوگ شامل ہیں۔

انھوں نے ۳ صفر ۸۹۲ھ میں وفات پائی اور جون پور میں دفن کیے گئے۔ ۱۶۹ھ

۸۹- شیخ محمد بن عیسیٰ جون پوری

شیخ محمد بن عیسیٰ بن تاج الدین بن بہاء الدین حنفی صوفی جون پوری، عالم کبیر، امام وقت اور شیخ زمان تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت محمد بن ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے ماہ صفر ۸۰۷ھ میں دار السلطنت دہلی میں پیدا ہوئے اور حملۂ تیمور کے زمانے میں اپنے والد بزرگوار شیخ عیسیٰ کے ساتھ دہلی سے نکلے اور جون پور پہنچے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے تحصیل علم کی۔ قاضی موصوف ان سے بدرجہ غایت محبت رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب وہ ان سے علم حاصل کرتے اور اصول بزدوی کا درس لیتے تھے تو انھوں نے اپنے اس عزیز شاگرد کے لیے مبحث امر تک اصول بزدوی کی شرح لکھی۔ شیخ محمد نے ان ہی سے تمام علوم حاصل کیے اور بعد از اں خود بھی طویل عرصہ تک فرائض تدریس انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں ان سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا۔ پھر ایک دور ایسا آیا کہ علمی بحث و اشتغال کا سلسلہ ترک کر دیا اور شیخ فتح اللہ اودھی کے حلقہ بیعت میں داخل ہو گئے۔ اس باب میں یہاں تک آگے بڑھے کہ تمام وقت اللہ کی یاد میں بسر ہونے لگا اور ذکر الٰہی کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ کہتے ہیں پورے بارہ سال قیام و سجود میں رہے اور زمین پر بیٹھ نہیں لگائی۔ ہر آن اپنے حجرے میں بیٹھے رہتے۔ پانچ وقت کی نمازوں کے سوا بالکل باہر نہ نکلتے۔ نہ کسی کے پاس جاتے اور نہ کسی کے لیے اپنا دروازہ کھولتے۔ کامل چالیس برس ترک و

۱۶۹ھ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۴۱ ۱۴۲۔ بحوالہ الانتصاح۔

تجرید کی زندگی اختیار کیے رکھی۔ سلاطین و امراء میں سے کسی کا ہدیہ اور نذر قبول نہ کرتے۔ زیادہ تر یہ اشعار پڑھتے :

من دلقِ خود بافسر شاہاں نمی دہم
من فقرِ خود بملک سلیمان نمی دہم
از رنج فقر در دل گنجے کہ یافتم
ایں رنج را براحت شاہاں نمی دہم

منقول ہے کہ سلطان ابراہیم شرقی اور اس کا بیٹا سلطان محمود شرقی ان کے بے حد عقیدت مند تھے، ان کے فضل و کمال کے معترف تھے، وہ ہمیشہ اس بات کے متمنی رہے کہ شیخ کبھی ان سے بطور ہدیہ و تحفہ کے کوئی شے قبول فرمائیں لیکن وہ اس سے گریزاں رہے اور کبھی کوئی چیز قبول نہ کی۔

شیخ محمد بن عیسیٰ سے شیخ بہاء الدین جونپوری، شیخ مبارک بنارسی اور بہت سے لوگوں نے اخذ فیض اور کسب علم کیا۔ اس معروف عالم دین اور صاحب سلوک و طریقت بزرگ نے ۱۴ ربیع الاول ۸۷۰ھ کو انتقال کیا۔ بعض حضرات نے ''سلطانِ طریقت'' سے تاریخ وفات نکالی ہے۔[۱۷۰]

۹۰- مولانا محمد بن عین الدین بیجاپوری

مولانا محمد بن عین الدین بیجاپوری، فاضلِ وقت، شیخ زمان اور کبار علمائے عصر میں سے تھے۔ اپنے والدِ مکرم شیخ عین الدین سے اخذِ علم کیا اور طویل عرصہ تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔ ان کی رفعتِ علمی اور مرتبہ فقاہت کا یہ عالم تھا کہ سلطان محمد شاہ بن علاء الدین حسن بہمنی کے دورِ حکومت میں گلبرگہ کے مفتی اکبر مقرر ہوئے اور افتا کی اس مسند پر خاصی مدت تک فائز رہے۔ یہ ۷۵۶ھ یا اس سے لگ بھگ۔

---

[۱۷۰] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۴۳، ۱۴۴۔ بحوالہ گنج ارشدی

کا واقعہ ہے۔ ۸۰۰ھ میں سلطان فیروز شاہ بہمنی کے زمانے میں منصب شحنہ پر فائز ہوئے۔[۱۷۱]

۹۱- شیخ محمد بن قاسم اودھی

شیخ محمد بن قاسم بن برہان الدین اودھی، عالم وفقیہ، مردِ صالح اور شیخ کامل تھے۔ تصوف وطریقت میں بہرۂ وافر حاصل تھا۔ طریقہ چشتیہ، طریقۂ مداریہ اور طریقۂ سہروردیہ کے اکابر مشائخ میں سے تھے۔ ان کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے یہ تو لکھا ہے کہ وہ علمِ فقہ کے عالم تھے لیکن اس موضوع سے متعلق ان کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ طریقت وسلوک کے بارے میں ان کی ایک کتاب کا ذکر کیا گیا ہے جو آداب السالکین کے نام سے موسوم ہے۔ کہتے ہیں اپنے موضوع میں یہ ایک بہترین اور مفید کتاب ہے۔

ان کی وفات سلطان سکندر بن بہلول لودھی کے عہد میں جمعرات کے روز ۷ محرم ۹۲۶ھ کو ہوئی۔[۱۷۲]

۹۲- شیخ محمد بن قطب الدین لکھنوی

شیخ محمد بن قطب الدین بن عثمان صدیقی لکھنوی، شیخ مینا کے نام سے معروف تھے لکھنو میں پیدا ہوئے اور وہیں شیخ قوام الدین عباسی کے ہاں تربیت پائی۔ فقہ حنفی کی مشہور کتابیں ہدایہ اور شرح وقایہ قاضی فرید الدین سے پڑھیں۔ ابھی جوانی کی منزل میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ شیخ قوام الدین وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد خرقۂ تصوف شیخ سارنگ سے حاصل کیا، جو شیخ قوام الدین کے تلامذہ میں سے تھے۔ عوارف المعارف شیخ محمد بن ابوالبقا لکھنوی سے پڑھی۔ اللہ نے ان کو زہد وعبادت اور قناعت واستغنا کی دولتِ بے پایاں سے نوازا اور امورِ دنیا سے منقطع ہو کر یادِ الٰہی میں مصروف ہو گئے۔

---

[۱۷۱] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۴۵

[۱۷۲] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۴۵، ۱۴۶، بحوالہ مسالک السالکین۔

اور تقویٰ و صالحیت کے اس درجہ اونچے مقام پر پہنچے کہ اس میں ان کے عصر اور شہر کا کوئی شخص ان کا حریف نہ تھا۔ جو ریاضات شاقہ انھوں نے کیں اور ذکر الٰہی کی جن مشقتوں سے یہ گزرے وہاں ہر انسان نہیں پہنچ سکتا۔ یوں سمجھیے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ذکر و فکر میں فنا کر دیا تھا۔ دن کو روزہ رکھتے، رات کو قیام کرتے۔ نہ ان کی آنکھیں بند ہوتیں، نہ سر کے نیچے تکیہ رکھتے، نہ ٹیک لگاتے، نہ فرش اور بستر پر آرام کرتے کہ کہیں نیند نہ آجائے۔ سخت جاڑوں کے موسم میں رومال اور ٹوپی ٹھنڈے پانی سے بھگو کر سر پر رکھتے اور پانی گرم ہو جاتا تو سرد رات میں غسل خانے میں جاتے اور ٹھنڈے پانی سے نہانا شروع کر دیتے تاکہ نیند کے جھونکے عبادت میں خلل انداز نہ ہوں۔ اس طرح پوری رات ذکر و مراقبہ میں مشغول رہنے اور وضو کا التزام رکھتے۔ بارہا ایسا ہوتا کہ متواتر چالیس دن کے روزے رکھتے مگر کوئی مہمان یا دوست آجاتا تو اس کو کھانا پیش فرماتے اور خود بھی اس کے ساتھ ہی افطار کر لیتے۔ دوبارہ پھر یہ سلسلہ شروع کرتے، مگر کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے کہ روزے سے تھے۔

کوئی درپے آزار ہوتا اور اذیت پہنچاتا تو خوشی اور مسرت سے برداشت کر لیتے۔ نہ اس کو طعن و تشنیع کرتے اور نہ لعن و ملامت کا اظہار کرتے۔ اس کا ذکر بہتر اور اچھے الفاظ سے کرتے۔ ایسے مواقع پر بارہا یہ اشعار پڑھتے۔

ہر کہ مارا یار نبود ایزد او را یار باد
ہر کہ مارا رنج دادہ راحتش بسیار باد
ہر کہ اندر راہِ ما خارے نہد از دشمنی
ہر گلی کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

شیخ سعد الدین خیر آبادی اپنے بعض رسائل میں لکھتے ہیں کہ میں بیس سال ان کی صحبت و رفاقت میں رہا۔ میں نے ان کو ہمیشہ اس انداز سے قبلہ رُو بیٹھے ہوئے پایا کہ گویا نماز میں ہیں۔ اس طویل مدت میں نہ تو ان کو پاؤں پھیلاتے ہوئے دیکھا اور نہ پاؤں کھڑا کیے ہوئے۔ نہ کھانے کے کوئی چیز طلب کرتے سنا اور نہ عمدہ لباس پہنے ہوئے دیکھا۔

ہمیشہ قبلہ رخ بیٹھتے اور مستغرقِ عبادت رہتے۔

اس جلیل القدر عالم دین اور صاحبِ طریقت و تصوف بزرگ نے ۲۳ ذی القعدہ باختلاف روایات ۸۷۴ھ، ۸۸۴ھ یا ۸۸۸ھ کو وفات پائی اور لکھنؤ میں دفن کیے گئے۔[172]

۹۳- شیخ محمد بن یوسف حسینی دہلوی

شیخ محمد بن یوسف کا شجرۂ نسب یہ ہے: محمد بن یوسف بن علی بن محمد بن یوسف بن حسین بن محمد بن علی بن حمزہ بن داؤد بن زید بن ابوالحسن الجنیدی بن حسین بن ابوعبداللہ بن محمد بن عمر بن یحییٰ بن حسین بن زید الشہید بن علی اصغر زین العابدین بن حضرت حسین بن حضرت علی بن ابوطالب ـــــ ان کی کنیت ابوالفتح اور لقب صدرالدین تھا۔ حلقۂ اہلِ علم میں شیخ ابوالفتح صدرالدین محمد دہلوی کے نام سے معروف تھے مگر عام طور پر انھیں خواجہ بندہ نواز اور خواجہ گیسو دراز کہا جاتا ہے۔

خاندان اور ولادت

شیخ محمد بن یوسف کے آباواجداد اصلاً ہرات کے رہنے والے تھے۔ ان کے بزرگوں میں سے کوئی صاحب دہلی آئے اور پھر وہیں اقامت گزین ہو گئے۔ دہلی اس زمانے میں مسلمان حکمرانوں کا دارالسلطنت تھا۔ شیخ محمد اسی شہر میں ۴ رجب ۷۲۱ھ کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد مکرم سید یوسف بن علی کو دہلی کے عوام و خواص میں سید راجا کہا جاتا تھا اور وہ شیخ نظام الدین اولیا کے مرید تھے۔ جوامع الکلم میں خود شیخ محمد کہتے ہیں:

پدر من زیارانِ شیخ نظام الدین بود۔[173]

یعنی میرے والد شیخ نظام الدین کے ارادت مندوں میں سے تھے

---

[172] اخبار الاخیار، ص ۱۵۶- نیز دیکھیے، ص ۱۹۳ (در ذکر شیخ سعد الدین خیرآبادی) نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۴۶ تا ۱۴۸۔

[173] جوامع الکلم، ص ۳۸

دہلی سے دولت آباد

سلطان محمد تغلق نے ایک مرتبہ دہلی کے بجائے دولت آباد کو اپنا دارالسلطنت بنایا تھا جس کو دیوگیر بھی کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں اس کے حکم سے بہت سے علما و مشائخ اور امرا و زعما نے دہلی کی سکونت ترک کر کے دولت آباد میں اقامت اختیار کر لی تھی اس وقت شیخ محمد کی عمر صرف چار سال تھی۔ ان کے والدین بھی دولت آباد چلے گئے تھے۔ وہاں کے صوبہ دار شیخ محمد کے ماموں ملک الامرا سید ابراہیم مستوفی تھے۔ شیخ محمد بن یوسف کے نانا بھی شیخ نظام الدین اولیا سے تعلقِ ارادت رکھتے تھے۔[۱۷۵]

تعلیم

والدِ مکرم اور جدِ امجد نے بچپن ہی میں ان کو حصولِ علم کی راہوں پر لگا دیا تھا اور پہلے پہل خود ہی تعلیم دینا شروع کی تھی۔ ان بزرگوں کی تربیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ سال کی عمر میں ان کی طبیعت دینیات کی طرف مائل ہو گئی اور وہ وضو اور نماز وغیرہ امورِ دینیہ میں مشغول رہنے اور دلچسپی لینے لگے۔ دس سال کے ہوئے تو ۷۳۱ھ میں والدِ مکرم دولت آباد میں انتقال کر گئے۔

والد کے انتقال کے بعد تعلیم و تربیت کی ذمہ داری نانا پر آ پڑی اور درسیات کی ابتدائی کتابیں ان ہی سے پڑھیں لیکن مصباح اور قدوری کا درس ایک اور استاذ سے لیا۔

پھر دہلی میں

والد کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد ان کی والدہ کو اپنے بھائی ملک الامرا سید ابراہیم مستوفی سے کسی معاملے میں اختلاف پیدا ہو گیا اور وہ ان سے خفا ہو کر ۷۳۶ھ میں دولت آباد سے دہلی چلی گئیں۔ اس وقت سید محمد کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ دہلی میں وہ سلطان قطب الدین کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے گئے تو وہاں شیخ نصیر الدین محمود

---

[۱۷۵] سیر محمدی، ص ۹

چراغ دہلی کو دیکھا، ان سے بہت متاثر ہوئے اور ۱۶ رجب ۷۳۶ھ کو اپنے بھائی سید چندن کے ساتھ ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

حصولِ علم کی تلقین

چراغ دہلی سے بیعت کے بعد ذکر و فکر اور مراقبہ و مکاشفہ میں مشغول رہنے اور لذت محسوس کرنے لگے تو ظاہری علوم کی تحصیل میں دلکشی باقی نہ رہی۔ اس زمانے میں قاضی عبدالمقتدر کے حلقہ تلمذ میں شامل تھے۔ مرشد کی خدمت میں حاضر ہو کر ترکِ تعلیم کا ارادہ ظاہر کیا اور علومِ باطنی میں مشغول رہنے کے لیے عرض گزار ہوئے، مگر مرشد کو یہ بات ناگوار گزری اور علوم ظاہری کی تکمیل کی تلقین فرمائی اور حکم دیا کہ ہدایہ، اصولِ بزدوی، رسالۂ شمسیہ، کشاف اور مصباح خوب غور سے پڑھو۔ چنانچہ مرشد کے حکم کے مطابق تعلیم کا سلسلہ بدستور جاری رکھا اور انیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ درسیات کی کچھ کتابیں مولانا سید شرف الدین کیتھلی سے، کچھ مولانا تاج الدین مقدم سے اور کچھ مولانا قاضی عبدالمقتدر بن رکن الدین شریحی کندی دہلوی سے پڑھیں۔ بلکہ زیادہ تر کتابیں قاضی عبدالمقتدر سے پڑھیں یہاں تک کہ علم و فضل کے اونچے درجے پر پہنچے اور فتویٰ و تدریس کی اہلیت سے بہرہ ور ہوئے۔

گیسو دراز کے لقب کی وجہ

سید محمد بن یوسف کا لقب گیسو دراز کیوں پڑا؟ اس سلسلے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار میں اور مفتی غلام سرور لاہوری خزینۃ الاصفیا میں رقم طراز ہیں کہ ایک مرتبہ دیگر مریدوں کے ساتھ اپنے مرشد شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کی پالکی اٹھائے جا رہے تھے، ان کے بال بڑے بڑے تھے جو پالکی کے پایہ میں الجھ گئے۔ پالکی کو کندھے پر لے کر دور تک نکل گئے۔ پایہ میں بال الجھ جانے سے تکلیف ہوتی رہی لیکن مرشد سے بے پناہ محبت اور بدرجہ غایت تعظیم کی وجہ سے زبان سے کوئی لفظ نہ نکالا اور پالکی اٹھائے ہوئے اسی حالت میں دور تک چلے گئے۔ شیخ نصیر الدین چراغِ دہلی کو اس کا علم ہوا تو مرید کی اس عقیدت اور جذبۂ محبت سے بہت خوش ہوئے اور یہ شعر پڑھا:

ہر کہ مرید سید گیسو دراز شد　　واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

اس واقعہ کے بعد سے گیسو دراز مشہور ہو گئے۔[۱۷۶]

فقاہت

مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی ان کی علمیت و فقاہت کے بارے میں نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں:

الشیخ الامام الکبیر العلامۃ الفقیہ الزاھد ...[۱۷۷]

کہ (شیخ محمد بن یوسف) شیخ وقت، امام کبیر، علامہ، فقیہ اور زاہد و عابد تھے۔

آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

وبرز فی الفضائل و تأھل للفتوی والتدریس وجمع بین العلم و العمل والزھد والتواضع وحسن السلوک، ووضع اللہ سبحانہ لہ المحبۃ فی قلوب عبادہ لما اجتمع فیہ من خصال الخیر...[۱۷۸]

یعنی ان میں بہت سے فضائل و اوصاف آشکارا ہو گئے، افتا و تدریس کی خوبیاں پیدا ہو گئیں، علم و عمل کی نعمت سے نوازے گئے۔ زہد و تقویٰ، تواضع اور حسنِ سلوک ان کی ذات میں جمع ہو گئے اور خصالِ محمودہ کے حامل ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت ڈال دی۔

مولانا مرحوم ان کے علم و فضل سے متعلق مزید رقم طراز ہیں:

وکان عالما کبیرا عارفا، قوی النفس، عظیم الھیبۃ، جلیل الوقار، جامعا بین الشریعۃ والطریقۃ، ورعا، تقیا، زاھدا، غواصا فی بحار الحقائق و المعارف، لہ مشارکۃ جیدۃ فی الفقہ والتصوف والتفسیر و فنون اخری...[۱۷۹]

وہ بہت بڑے عالم، عارف باللہ، قوی النفس، بہت بارعب، بے حد باوقار، جامع

---

[۱۷۶] اخبار الاخیار، ص ۱۳۲۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۳۸۱۔

[۱۷۷] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۵۲۔ [۱۷۸] ایضاً، ص ۱۵۳ [۱۷۹] ایضاً، ص ۱۵۴

شریعت وطریقت، زیور ورع وتقویٰ سے مزین، زاہد وعابد، حقائق ومعارف کے غواص اور تفسیر، فقہ، تصوف اور دیگر علوم وفنون میں اونچے مرتبہ پر فائز تھے.....

افضلیت صحابہ رضوان اللہ علیہم

شیخ محمد بن یوسف صحابہ کرام اور خلفائے اربعہ رضوان اللہ علیہم کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے؟ اس سلسلے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی خود ان ہی کے الفاظ نقل فرماتے ہیں:

فرمود چوں در مسائل کلامیہ سخن در فضل صحابہ افتد من ہیچ مباحثہ شروع نکنم۔ اما بر مخلصان اصحاب وقتے اگر بحثے کردہ ام، بعد از تاکید سوگند عقیدۂ من بدل راست است کہ افضل صحابہ ابوبکر، ثم عمر، ثم عثمان، ثم علی۔ اما بحث لفظی ہر آنچہ آمد گفتہ می شود و با خلق بیگانہ ایں قدر بہم نہ کردہ ام۔[۱۸۰]

یعنی (سید محمد بن یوسف) فرماتے ہیں، جب کبھی افضلیت صحابہ کا ذکر چھڑا تو میں نے کسی بحث میں حصہ نہیں لیا۔ البتہ مخلص لوگوں سے دوران بحث میں بخدا یہ ضرور کہا ہے اور اب بھی صدق دل سے کہتا ہوں کہ صحابہ میں سب سے افضل حضرت ابوبکر، ان کے بعد حضرت عمر، ان کے بعد حضرت عثمان اور ان کے بعد حضرت علی ہیں، رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ البتہ لفظی بحث بوقت ضرورت بہر حال کی جاتی ہے اور میں ان کبار صحابہ کی گوناگوں برکتوں اور ان کے نوع بنوع کارناموں سے لوگوں کو بے گانہ و ناشناس نہیں رکھ سکتا۔

تصنیفات

شیخ محمد بن یوسف متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ایک روایت کے مطابق مختلف عنوانات و مسائل سے متعلق عربی اور فارسی میں انھوں نے ایک سو پچیس کتابیں تصنیف کیں۔[۱۸۱] ان میں سے چند اہم تصنیفات یہ ہیں۔

۱۔ تفسیر قرآن مجید: یہ تفسیر انھوں نے تفسیر کشاف کے انداز پر لکھنا شروع

۱۸۰؎ اخبار الاخیار، ص ۱۳۳ ۱۸۱؎ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۵۵۔

کی تھی لیکن مکمل نہ ہو سکی۔ صرف پانچ پاروں تک ہی لکھ پائے تھے کہ یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

۲۔ ملتقط: یہ صوفیانہ رنگ میں قرآن مجید کی تفسیر ہے۔

۳۔ حواشی کشاف: یہ تفسیر کشاف پر حواشی ہیں۔

۴۔ شرح مشارق: یہ حدیث کی مشہور کتاب مشارق الانوار کی شرح ہے۔

۵۔ ترجمہ مشارق: یہ مشارق الانوار کا فارسی ترجمہ ہے۔

۶۔ رسالہ سیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

۷۔ شرح فقہ اکبر: عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہے۔

۸۔ شرح تعرف: یہ شیخ ابوبکر محمد بن ابراہیم بخاری کی تصنیف تعرف کی شرح ہے۔

۹۔ معارف: یہ تصوف کے موضوع پر شیخ شہاب الدین سہروردی کی معروف تصنیف عوارف المعارف کی شرح ہے۔

۱۰۔ ترجمہ عوارف: یہ عوارف المعارف کی فارسی زبان میں شرح ہے۔ مگر ترجمہ عوارف کے نام سے معروف ہے۔

۱۱۔ شرح آداب المریدین: یہ شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی کی مشہور تصنیف آداب المریدین کی عربی زبان میں شرح ہے۔

۱۲۔ شرح آداب المریدین: یہ بھی اسی کتاب کی شرح ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

۱۳۔ شرح فصوص الحکم: یہ شیخ محی الدین ابن عربی کی مشہور تصنیف فصوص الحکم کی شرح ہے۔

۱۴۔ شرح تمہیدات عین القضاۃ ہمدانی: یہ شیخ ابوالمعانی عبداللہ المعروف بہ عین القضاۃ کی تصوف سے متعلق معروف کتاب تمہیدات کی شرح ہے۔

۱۵۔ ترجمہ رسالہ قشیریہ: یہ شیخ ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری کے رسالہ کا فارسی ترجمہ ہے۔

۱۶۔ حواشی قوت القلوب: یہ شیخ ابوطالب محمد بن ابوالحسن بن علی کی مشہور تصنیف قوت القلوب پر حواشی ہیں۔

۱۷۔ رسالہ استقامت الشریعت بطریقۃ الحقیقت : اس میں شریعت، طریقت اور حقیقت کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ اس کا ذکر انڈیا آفس لائبریری کے فارسی مخطوطات میں بھی موجود ہے۔

یہ تو اُن کی چند تصنیفات ہیں۔ ان کے علاوہ بھی وہ بہت سی کتابوں کے مصنف، شارح اور مترجم تھے۔ ان کتابوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنے بڑے عالم تھے اور عربی اور فارسی کے مختلف علوم و فنون پر ان کی نظر کتنی گہری تھی۔

اولاد

سیّد محمد گیسو دراز کی شادی چالیس سال کی عمر میں سید احمد بن مولانا جمال الدین مغربی کی صاحب زادی بی بی رضا خاتون سے ہوئی۔ ان سے دو لڑکے سیّد حسین عرف سیّد محمد اکبر حسینی اور سید یوسف عرف سید محمد اصغر حسینی تولد ہوئے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ دونوں لڑکے جلیل القدر عالم دین تھے۔ اور معقولات و منقولات کی تعلیم دہلی کے نامور اساتذہ قاضی عبد المقتدر شریحی کندی دہلوی، مولانا خواجگی نحوی، مولانا محمد بغرا اور مولانا نصیر الدین قاسم سے حاصل کی تھی۔

سید محمد بن یوسف اپنے بڑے لڑکے سید حسین عرف سید محمد اکبر کے ظاہری اور روحانی کمالات سے بہت متاثر تھے۔ فرمایا کرتے، اگر محمد اکبر میرا لڑکا نہ ہوتا تو میں اس کے لیے لوٹے میں پانی بھر بھر کر لاتا۔

سید محمد اکبر متعدد عربی اور فارسی کتابوں کے مصنف بھی تھے جن میں سے چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں :

۱۔ شرح ملتقط : یہ ان کے والد بزرگوار کی قرآن مجید کی تفسیر ملتقط کی شرح ہے۔
۲۔ معارف : یہ علم نحو پر عربی زبان میں ایک رسالہ ہے۔
۳۔ رسالہ علم صرف : یہ علم صرف سے متعلق ایک رسالہ ہے۔
۴۔ رسالہ مسئلہ زبان فارسی :
۵۔ اپنے والد مکرم شیخ محمد بن یوسف کے ملفوظات کے دو مجموعے مرتب کیے جن

میں سے ایک کا نام جوامع الکلم ہے اور یہی زیادہ مشہور ہے۔

سیّد محمد اکبر ۸۱۱ھ میں اپنے والد کے خلیفہ مقرر ہوئے لیکن سات مہینے بعد گلبرگہ میں وفات پاگئے۔ والد نے اپنے ہاتھ سے ان کو غسل دیا اور خود ہی تجہیز وتکفین کی۔

دوسرے صاحب زادے سید یوسف عرف سید محمد اصغر حسینی اپنے والد کے خلیفہ و جانشین ہوئے، انھوں نے ان کے انتقال کے بعد گلبرگہ میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔

گلبرگہ میں قیام

سیّد محمد گیسو دراز تقریباً چوالیس سال دہلی میں اقامت گزیں رہے اور ۸۰۱ھ میں حملۂ تیمور کے زمانے میں دہلی سے گلبرگہ تشریف لے گئے، اس وقت ان کی عمر تقریباً اسّی برس کی تھی۔ انھوں نے برصغیر پاک و ہند کے متعدد ملوک و سلاطین کا دور دیکھا، جن میں سلطان محمد تغلق، سلطان فیروز شاہ تغلق، فرماں روائے دکن فیروز شاہ بہمنی اور احمد شاہ بہمنی شامل ہیں۔ یہ حکمران ان کے زہد واتقا اور علم وفضل سے بے حد متاثر تھے۔

وفات

سیّد محمد بن یوسف ۸۰۱ھ میں دہلی سے چلے اور مختلف بلاد وقصبات سے ہوتے ہوئے گلبرگہ پہنچے۔ اس زمانے میں دکن کے تخت حکومت پر فیروز شاہ بہمنی متمکن تھا۔ اس نے ان کی بدرجہ غایت پذیرائی کی اور بہت ہی عزت واحترام سے پیش آیا۔ سیّد موصوف قیام گلبرگہ کے دوران میں عرصے تک درس وتدریس کی خدمات انجام دیتے اور لوگوں کی علمی وروحانی تربیت کا اہتمام کرتے رہے۔

اس عظیم عالم وفقیہ اور برصغیر پاک و ہند کے نامور صوفی نے ایک سو چار برس عمر پاکر ۱۶ ذی القعدہ ۸۲۵ھ کو سلطان احمد شاہ بہمنی کے دورِ حکومت میں گلبرگہ میں وفات پائی۔ وفات کے موقع پر ان کے خلیفہ شیخ ابوالفتح نے کہا:

این مصیبت دین است

ان کی تاریخ وفات "مخدوم دین و دنیا" سے نکلتی ہے۔[۱۸۲]

۹۴۔ قاضی محمد ساوی

علامہ قاضی محمد بن ابو محمد صوفی ساوی حنفی المسلک تھے۔ جید عالم، فقہ، اصول فقہ اور علوم عربیہ میں ماہر کامل تھے۔ بحر تصوف و طریقت کے شناور تھے۔ ظاہری علوم سے تعلق اور قلبی لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ زندگی بھر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ بہت سے لوگوں نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

سلوک و تصوف میں سلسلۂ چشتیہ سے منسلک تھے اور اس سلسلے کے کبار مشائخ میں سے گردانے جاتے تھے۔ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی سے مستفیض تھے۔ ایک عرصے تک ان کی صحبت و ملازمت کا شرف حاصل کیا اور علم و معرفت کی بلندیوں تک پہنچے۔ خود ان سے شیخ اختیار الدین عمر ایرجی اور خلق کثیر نے استفاضہ کیا۔

ان کی وفات ۸۰۱ھ کو ہوئی۔ ایک روایت کے مطابق ۱۴ محرم ۸۰۹ھ کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے اور شہر ایرج میں دفن کیے گئے۔[۱۸۳]

۹۵۔ شیخ محمد بن ابو محمد دریابادی

شیخ محمد بن ابو محمد قدوائی دریابادی اپنے زمانے کے نامور عالم و فقیہ اور معروف شیخ تھے۔ آب کش کے نام سے مشہور تھے۔ قاضی عبدالکریم قدوائی اودھی کی نسل سے تھے۔ شیخ ابو الفتح بن عبدالحی بن عبدالمقتدر کندی جون پوری کے شاگرد تھے۔ ان کی تدریسی مساعی کا سلسلہ بہت وسیع تھا، جس سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا اور علم و تحقیق کی

۱۸۲ھ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ اخبار الاخیار، ص ۱۳۱ تا ۱۳۶۔ تاریخ فرشتہ، ج ۱ و تذکرہ سلطان احمد شاہ بہمنی۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۲۸۱-۲۸۳۔ بزم صوفیہ ۴۸۳ تا ۵۲۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۱۵۲ تا ۱۵۶۔ سیر محمدی، جوامع الکلم۔

۱۸۳ھ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۵۶، ۱۵۷۔ بحوالہ مہر جہاں تاب۔

دولت سے مالا مال ہو گئے۔ اس عالم دین نے ۸۰۴ھ میں وفات پائی [۱۸۴]

۹۶- قاضی محمد اکرم گجراتی

قاضی محمد اکرم گجراتی عالم و فقیہ اور شیخ وقت تھے۔ حنفی المسلک تھے۔ ان کی علمی فراوانیوں کا یہ عالم تھا کہ گجرات (کاٹھیاواڑ) کے علاقے میں فقہ اور اصول فقہ میں مرجع انام تھے۔ نہروالا میں قاضی القضاۃ کے منصب بلند پر فائز تھے۔ مفتی رکن الدین ناگوری (مصنف فتاوی حمادیہ) نے فتاوی حمادیہ کے مقدمہ میں ان کے مرتبہ علمی کی بہت تعریف کی ہے۔ اور "الامام العالم و نعمان الثانی و ناقد المعقول والمنقول"، وغیرہ بلند القاب کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے [۱۸۵]

۹۷- شیخ محمود بن عبداللہ بخاری

شیخ محمود بن عبداللہ بن محمود بن حسین حسینی بخاری۔ ان کا لقب ناصر الدین تھا اور کنیت ابوالحسن تھی۔ شیخ ناصر الدین ابوالحسن گجراتی کے نام سے معروف تھے۔ ۲۲ رمضان المبارک ۸۰۹ھ کو علاقہ گجرات کے مردم خیز شہر پٹن میں پیدا ہوئے۔ والدہ ماجدہ کا نام سلطان خاتون تھا جو خداوند خاں گجراتی کی بیٹی تھیں۔

شیخ محمود کے والد شیخ عبداللہ بھی جید عالم تھے۔ انھوں نے اپنے والد سے کسب علم کیا اور فقہ کے جلیل القدر عالم ہوئے۔ علم کے علاوہ تقویٰ و صالحیت میں بھی بہت بڑھے ہوئے تھے اور تصوف سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ ارض گجرات کے مشہور شائخ میں سے تھے۔ ان کے والد گرامی قدر بھی راہرو سلوک و طریقت تھے۔ یہ والد کی وفات کے بعد ان کی جگہ مسند مشیخت پر متمکن ہوئے۔ خلق کثیر نے ان سے کسب فیض اور اخذ علم کیا۔ ماہ ذی قعدہ ۸۸۰ھ میں ایک گاؤں بٹوہ میں وفات پائی [۱۸۶]

---

[۱۸۴] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۵۷۔ بحوالہ مہر جہاں تاب۔

[۱۸۵] مقدمہ فتاوی حمادیہ و نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۷۵ نیز ملاحظہ ہو برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ ص ۱۲۷۔

[۱۸۶] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۵۹، ۱۶۰۔ بحوالہ مرآت احمدی۔

۹۸- شیخ محمود بن علاء الدین نصیر آبادی

شیخ محمود بن علاء الدین بن قطب الدین حسنی حسینی نصیر آبادی، امیر کبیر بدر الملت شیخ الاسلام قطب الدین محمد بن احمد حسنی مدنی کی اولاد سے تھے۔ عالم و فقیہ اور شیخ زمان تھے۔ مہد علم میں پیدا ہوئے اور مشیخت و سلوک کی گود میں تربیت پائی۔ ان کے والد بزرگوار شیخ علاء الدین بھی نامور عالم دین تھے اور نصیر آباد کے قاضی تھے۔ ان کی وفات کے بعد ۸۰۷ ہجری میں نصیر آباد کے منصب قضا پر فائز ہوئے۔ علم فقہ میں بدرجۂ غایت مہارت رکھتے تھے۔ فقہ کے علاوہ انھیں دیگر علوم و فنون میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ ۸۶۸ھ میں نصیر آباد میں فوت ہوئے[۱۸۷]

۹۹- شیخ محمود بن محمد دہلوی

شیخ محمود بن محمد دہلوی کا لقب سعد الدین تھا اور کنیت ابو الفضائل تھی۔ شیخ ابو الفضائل سعد الدین کے نام سے معروف تھے۔ عالم کبیر اور علامہ دہر تھے حنفی المسلک تھے اور اکابر فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ فقہ اور اصول فقہ میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ اصول فقہ سے متعلق حافظ الدین نسفی یعنی شیخ ابو البرکات عبد اللہ بن احمد المعروف بہ حافظ الدین نسفی متوفی (۷۱۰ھ) کی مشہور تصنیف المنار کی شرح سپرد قلم کی اور اس کا نام افاضۃ الانوار فی اضاءۃ اصول المنار رکھا۔ یہ کتاب الحمد للہ الذی الہمنا معالم الاسلام الخ کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ اس عالم و فقیہ نے ۸۹۱ھ میں انتقال کیا[۱۸۸]

۱۰۰- شیخ مودود بن محمد گجراتی

شیخ مودود بن محمد بن یوسف بن سلیمان عمری اجودھنی۔ یہ شیخ رکن الدین ابو المظفر

۱۸۷ھ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۶۰ بحوالہ مآثر السادات۔

۱۸۸ھ کشف الظنون، ج ۲، ص ۱۸۲۳، ۱۸۲۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۶۷۔

نہروالی گجراتی کے نام سے شہرت رکھتے تھے۔ ۷۰۵ھ میں پیدا ہوئے۔ شیخ کبیر، عالم اجل، عابد و زاہد اور فقیہ عصر تھے۔ شیخ فرید الدین مسعود اجودھنی کی اولاد سے تھے اور کبار مشائخ چشتیہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ ریاضت و مجاہدہ، قناعت و توکل، خشیت الٰہی اور زہد و ورع میں اپنی مثال آپ تھے۔ گلزار ابرار میں مرقوم ہے کہ ۲ شوال ۸۱۱ھ کو علاقہ گجرات کے شہر پٹن میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے لیکن مرآت احمدی کی روایت کے مطابق تاریخ وفات ۲۲ شوال ۸۴۲ھ ہے۔[۱۸۹]

یہ وہ عالم و فقیہ ہیں، جن کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔ غالباً یہ مسائل فقہ میں مہارت تو رکھتے تھے، لیکن مصنف نہ تھے۔

ن

۱۰۱- مولانا نجم الدین گلبرگوی

مولانا نجم الدین گلبرگوی حنفی المسلک تھے۔ عالم و فاضل، فقہ، اصول فقہ اور علوم عربیہ میں ماہر تھے۔ سلطان احمد شاہ بہمنی کے عہد میں فوجی ٹھکانوں کے مفتی اور اس کے مقرب و ندیم تھے۔ نہایت جرأت مند، دلیر، عاقل اور صاف گفتار تھے۔ سچ بات کہنے میں کسی قسم کی ملامت اور خوف کو دامن گیر نہ ہونے دیتے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ جب احمد شاہ نے ہوشنگ شاہ سے لڑائی کے لیے مندوہ کا قصد کیا تو انھوں نے اس کو اس اقدام سے روکا اور لڑائی سے باز رہنے کی تاکید کی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو آپس میں نہیں لڑنا چاہیے۔ مگر ہوشنگ شاہ آگے بڑھا اور قریب تھا کہ لڑائی شروع ہو جائے لیکن احمد شاہ بہمنی نے قدم روک لیے اور لڑائی کا ارادہ ترک کر کے اپنے علاقے میں واپس آ گیا۔[۱۹۰]

---

۱۸۹ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۷۰، ۱۷۱

۱۹۰ تاریخ فرشتہ، ج ۱، ص ۵۰۰، ۵۰۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۷۵۔

۱۰۲۔ قاضی نصیر الدین گنبدی

قاضی نصیر الدین دہلوی جون پوری یا گنبدی دار السلطنت دہلی میں پیدا ہوئے اور قاضی عبد المقتدر بن رکن الدین شریحی کندی سے علم حاصل کیا۔ قاضی ممدوح ان پر انتہائی شفقت فرماتے اور بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ وہ اپنے اس شاگرد کی ذہانت و قابلیت سے بہت متاثر تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد دہلی میں مسند تدریس بچھائی اور طویل عرصے تک اس پر متمکن رہے۔ پھر حملۂ تیمور کے زمانے میں جون پور چلے گئے اور وہاں کے منصبِ قضا پر فائز ہوئے۔ عرصے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ علامۂ زمان، فاضل عصر اور شیخ وقت تھے۔ فقہ، اصولِ فقہ، علم نحو اور دیگر علومِ عربیہ میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ دہلی میں بھی اپنے علم و فضل کی وجہ سے مرجع علما و طلبا تھے اور جونپور میں بھی بلند علمی مقام اور منصبِ قضا پر متعین ہونے کی بنا پر مرکز خلائق کی حیثیت حاصل تھی۔ مگر جون پور میں ایک ایسا وقت آیا کہ مسندِ قضا ترک کر دی، لوگوں سے علیحدگی اختیار کر لی، حکومت کی خدمت سے دستبردار ہو گئے اور سب سے منقطع اور الگ ہو کر اپنے حجرے میں بیٹھ گئے اور زہد و عبادت کو زندگی کا اصل مقصد قرار دے لیا۔

ان کے علم و فضل کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے جون پور میں علمِ نحو کی کتاب، الارشاد تصنیف کی تو ان کی خدمت میں لائے اور اس کو داخلِ نصاب کرنے اور طلبا کو باقاعدہ پڑھانے کی درخواست کی۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ کتاب علمی حلقوں میں پھیل جائے گی اور لوگوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔ قاضی نصیر الدین نے کتاب دیکھی تو اس کی تحسین کی اور فرمایا۔ یہ کتاب کسی تعارف و مقبولیت کے لیے داخلِ نصاب ہونے کی محتاج نہیں ہے۔ ان الفاظ سے مقصد یا تو فی الواقع کتاب کی تحسین و توصیف تھا یا وہ اس کے کچھ مباحث سے اختلاف رکھتے تھے اور اس کا اظہار ضروری نہ سمجھتے تھے، لہٰذا اس مسئلے میں بحث و نزاع میں جانا مناسب

نہ سمجھا اور اتنی سی بات کہہ کر مزید گفتگو کا دروازہ بند کر دیا۔

ان سے کسب فیض اور اخذ علم کرنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور ان کے تلامذہ اپنے آپ کو زنجیروں میں باندھ کر اور ان کا سہارا لے کر ان کے دروازے پر کھڑے رہتے تاکہ بھوک اور نقاہت کی وجہ سے زمین پر گرنے نہ پائیں۔

اس عظیم المرتبت عالم دین نے ۳، صفر ۸۱۷ھ کو جون پور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔[۱۹]

غالباً یہ کسی کتاب کے مصنف نہ تھے، البتہ فقہ و اصول اور دیگر علوم میں ماہر کامل تھے۔

۱۰۳۔ قاضی نظام الدین غزنوی

قاضی نظام الدین غزنوی کا سلسلۂ نسب یہ ہے: نظام الدین بن صدر الدین حسین بن احمد بن محمد بن احمد بن علی بن محمد بن حسین بن حسن زینبی مدنی غزنوی۔ ان کا سلسلۂ نسب علی بن عبداللہ بن جعفر ہاشمی زینبی تک پہنچتا ہے۔ ان کے اجداد میں سے حسین بن حسن مدنی، سلطان ابراہیم بن مسعود کے عہد حکومت میں غزنی آئے تھے۔ شیخ نظام الدین غزنی میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی اور اپنے والد مکرم شیخ صدر الدین حسین اور دیگر علمائے عصر سے علم حاصل کیا۔ ان کے والد غزنی کے قاضی القضاۃ تھے جو تمام عمر اس منصب پر فائز رہے۔ غالباً ۸۱۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ والد کے انتقال کے بعد شیخ نظام الدین غزنی سے وارد ہند ہوئے اور جون پور میں آئے۔ وہاں قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے ملاقات ہوئی تو وہ ان کی گوناگوں علمی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں سلطان ابراہیم شرقی کے پاس لے گئے۔ اس نے اُن کو مچھلی شہر کا قاضی مقرر کر دیا۔ بہت بڑے عالم اور شیخ تھے اور فقہ، اصول فقہ اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان ان

---

[۱۹] اخبار الاخیار، ص ۱۸۱۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۳۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۷۲، ۱۷۳۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۶۲۷، ۶۲۸۔

ابراہیم شرقی اور علما و عظام ان کی بے حد قدر کرتے تھے۔ مستقل سکونت مچھلی شہر میں اختیار کر لی تھی۔ ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ان کی اولاد و احفاد پھیلی اور علمی اعتبار سے بڑے اثر و رسوخ کی حامل ہوئی[۱۹۲]

اس جلیل القدر عالم دین اور معروف فقیہ کی نہ تو تاریخ وفات کا علم ہو سکا ہے اور نہ ان کی کسی تصنیف کا پتہ چلا ہے۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ یہ نویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند کے عظیم اور معتمد عالم دین تھے۔

۱۰۴۔ مولانا نور الدین ظفر آبادی

مولانا نور الدین بن اسد الدین[۱۹۳] بن تاج الدین حسینی واسطی ظفر آبادی کی کنیت ابو محمد تھی۔ ۱۶ ذی الحجہ ۷۴۴ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ فقہ، اصول فقہ اور صرف، نحو مولانا قیام الدین ظفر آبادی سے حاصل کیے، ان سے ایک ہزار چالیس احادیث بھی حفظ کیں۔ علم تفسیر بھی ان ہی سے پڑھا۔ علم حدیث کی تحصیل کے لیے مولانا نظام الدین علامی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اپنے وقت کے نامور فاضل اور شیخ تھے۔ علم و تقویٰ میں ممتاز تھے۔ اس زمانے کے علما و فقہا کو تصوف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ چنانچہ یہ بھی راہِ سلوک کے مسافر ہوئے اور اپنے والد ماجد شیخ اسد الدین سے جو علم طریقت کے ماہر تھے، اخذ طریقت کیا۔ علاوہ ازیں تصوف کے موضوع پر ان سے فصوص الحکم

---

[۱۹۲] نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۷۶، ۱۷۷۔

[۱۹۳] شیخ اسد الدین ۲۹ رجب ۷۶۱ھ کو واسط میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والدین کے ساتھ وارد ہند ہوئے۔ کچھ دن دہلی میں مقیم رہے۔ پھر کڑہ مانک پور تحصیل منجھن پور ضلع الٰہ آباد (یو۔پی، ہند) میں قیام پذیر ہوئے۔ بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے حافظ قرآن اور قاری ہفت قرأت تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ کے متبحر عالم تھے۔ طریقت و تصوف سے بھی لگاؤ تھا۔ ۱۲ جمادی الاولیٰ ۷۹۴ھ کو وفات پائی۔ (تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۹۲ تا ۹۴)

اور عوارف المعارف کا درس لیا۔ بعدازاں سلسلۂ تدریس شروع کیا اور افادۂ طلبا میں مشغول ہو گئے۔ اپنے شیوخ و اساتذہ کی طرح بہت کم سوتے، کم کھاتے اور کم گفتگو کرتے۔ یعنی تقلیل منام، تقلیل طعام اور تقلیل کلام کے عادی تھے۔ ۲۴ صفر ۸۲۶ کو ظفر آباد میں سلطان حسین شرقی کے عہد میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے[۱۹۴]

ی

۱۰۵۔ یوسف شاہ بنگالی

یوسف بن باربک شاہ بن ناصر الدین بھنگرہ، شاہِ بنگالہ سلطان شمس الدین بھنگرہ (متوفی ۷۵۱ھ) کی نسل سے تھے۔ اپنے والد سلطان باربک شاہ کی وفات کے بعد ۸۷۹ھ میں بنگال کے تختِ حکومت پر متمکن ہوئے۔ نہایت عادل، نیکوکار، کریم النفس، فاضل اور عالم بادشاہ تھے علم اور عمل دونوں خوبیوں کے جامع تھے۔ ان کی نیک شہرت سے اثر پذیر ہو کر ہر ناحیہ ملک کے علما ان کے پاس آ گئے تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا اصول حکومت تھا۔ یہ بادشاہ کم اور عالم دین زیادہ تھے۔ ان کے دائرۂ مملکت میں کوئی شخص مے نوشی اور حدودِ شرع سے باہر قدم رکھنے کا مجاز نہ تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ملک کے قضات و صدور کو جمع کر کے ان کو عدل و احسان کی تلقین کرتے۔ علم فقہ کے بہت ماہر تھے۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ کسی فقہی مسئلہ سے متعلق فیصلہ دینے میں قضات عاجز یا متحیر ہو جاتے تو سلطان یوسف فوراً اس فقہی مسئلہ کو حل کر دیتے۔ سات سال چھ ماہ حکومت کر کے ۸۸۷ھ میں فوت ہوئے[۱۹۵]

---

[۱۹۴] تاریخ شیراز ہند، جون پور، ص ۱۵۹۔ نزہۃ الخواطر ج ۳، ص ۱۷۷، ۱۷۸۔ بحوالہ تجلی نور

[۱۹۵] تاریخ فرشتہ، ج ۲، ص ۴۷۶ (طبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۳۲ء)۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳ ص ۱۸۰، ۱۸۱۔

ان کا ذکر فقہا و علما کے ضمن میں اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ بادشاہ ہونے کے ساتھ نامور فقیہ اور عالم دین بھی تھے۔ اور نویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند میں فقہی اعتبار سے ان کو اونچا مقام حاصل تھا۔

مراجع و مصادر

اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا:

۱- ابجد العلوم - نواب صدیق حسن خاں - مطبع صدیقیہ بھوپال - ۱۲۹۵ھ -

۲- ابنِ خلدون اینڈ تیمور لنگ (انگریزی) والٹر جے - فشل - کیلیفورنیا یونیورسٹی ۱۹۵۲ء -

۳- اتحاف النبلاء - نواب صدیق حسن خان - مطبع نظامی - کان پور -

۴- اخبار الاخیار (فارسی) شیخ عبدالحق محدث دہلوی - مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۳۲ھ -

۵- اخبار الاخیار (اردو ترجمہ از مولانا اقبال الدین احمد) دارالاشاعت کراچی - ۱۹۶۳ء -

۶ ادبی دنیا - کشمیر نمبر لاہور - شمارہ مارچ، اپریل ۱۹۶۶ء -

۷- اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۳ کتاب ۱۵ - زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب - لاہور -
مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی پریس لاہور، ۱۹۶۱ء -

۸- ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون - اسماعیل پاشا - مطبع بہیہ استنبول،
۱۹۴۵ء - ۱۳۶۴ھ -

۹- برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ - محمد اسحاق بھٹی - ناشر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور -

۱۰- بزم تیموریہ - سید صباح الدین عبدالرحمٰن - دارالمصنفین اعظم گڑھ -

۱۱- بزم صوفیہ - " " "

۱۲- تاریخ تحفۃ الکرام جلد اول، دوم، سوم مطبع حسینی اثنا عشری - محلہ فراش خانہ وزیر گنج
لاہور، ۱۳۰۴ھ و مطبع ناصری واقع دلہاتی -

۱۳- تاریخ فرشتہ (فارسی)، محمد قاسم فرشتہ - مطبع نول کشور لکھنؤ -

۱۴- " " طبع بمبئی

۱۵- " " (اردو ترجمہ) مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۹۳۳ء

۱۶- تاریخ فیروز شاہی - ضیاء الدین برنی، مطبوعہ - ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۶۲ء

۱۷- شمس سراج عفیف، مطبوعہ حیدرآباد دکن - ۱۹۳۸ء

۱۸۔ تاریخ مبارک شاہی یحییٰ بن احمد سرہندی۔ تصحیح۔ محمد ہدایت حسین۔
ناشر: ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۹۳۱ء
۱۹۔ تاریخ معصومی۔ میر محمد معصوم بھکری۔ ناشر: سندھی ادبی بورڈ۔ کراچی۔
۱۳۸۴ھ۔ ۱۹۶۴ء
۲۰۔ تاریخ طاہری۔ سید طاہر محمد نسیانی ٹھٹھوی۔ ناشر: سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ
۱۳۸۴ھ۔ ۱۹۶۴ء
۲۱۔ تاریخ کشمیر اعظمی۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری۔ ناشر: غلام محمد نور محمد تاجران کتب۔ سری نگر۔
۲۲۔ تاریخ شیراز ہند جون پور۔ سید اقبال حسین۔ ناشر: ادارہ شیراز ہند، پبلشنگ ہاؤس۔ جون پور، ۱۹۶۳ء۔
۲۳۔ تحفۃ الکرام۔ میر علی شیر قانع۔ ناشر: سندھی ادبی بورڈ۔ کراچی۔
۲۴۔ تذکرہ صوفیائے بنگال۔ اعجاز الحق قدوسی۔ ناشر: مرکزی اردو بورڈ لاہور۔
۲۵۔ تذکرہ عالم، جلد ۱، بلاقی داس۔ میور پریس دہلی۔ ۱۹۰۸ء
۲۶۔ تذکرہ علمائے ہند (فارسی) مولوی رحمان علی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء۔
۲۷۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ از محمد ایوب قادری) ناشر: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی۔
۲۸۔ تزک بابری۔ فارسی ترجمہ، از خان خاناں، بیرم خاں۔ مطبوعہ بمبئی۔ ۱۳۰۸ھ۔
۲۹۔ تزک تیموری، مطبع فتح الکریم بمبئی۔ ۱۳۰۷ھ۔
۳۰۔ تزک تیموری، مطبع کریمی، بمبئی۔ ۱۳۲۶ھ۔
۳۱۔ تزک تیموری (اردو ترجمہ از سید ابوالہاشم ندوی) سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۲۵ء۔
۳۲۔ تمدن ہند پر اسلامی اثرات۔ ڈاکٹر تارا چند۔ ترجمہ: محمد مسعود احمد۔ ناشر: مجلس ترقی ادب لاہور۔
۳۳۔ جامع ترمذی۔ امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ۔
۳۴۔ جوامع الکلم ملفوظات سید محمد بندہ نواز گیسو دراز مطبوعہ حیدرآباد (دکن)

۳۵ - حدائق الحنفیہ - مولوی فقیر محمد جہلمی - مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۳۲۴ھ - ۱۹۰۶ء -

۳۶ - خزینۃ الاصفیاء - مفتی غلام سرور لاہوری - مطبع نول کشور، لکھنؤ -

۳۷ - خزینۃ الاصفیا (جلد اول) اردو ترجمہ - از مفتی محمود عالم ہاشمی و علامہ اقبال احمد فاروقی - ناشر: مکتبۂ المعارف لاہور - ۱۳۹۲ھ -

۳۸ - رودِ کوثر - شیخ محمد اکرام - ناشر: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور -

۳۹ - سبحۃ المرجان فی آثارِ ہندوستان - میر غلام علی آزاد بلگرامی -

۴۰ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات - خلیق احمد نظامی - ناشر: ندوۃ المصنفین دہلی -

۴۱ - سیر المتاخرین - غلام حسین طباطبائی - ترجمہ بنام مرآۃ السلاطین - گوکل پرشاد - مطبع نول کشور لکھنؤ - ۱۲۹۱ھ - ۱۸۷۴ء -

۴۲ - سیر العارفین (قلمی) پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور -

۴۳ - الضوء اللامع - حافظ سخاوی -

۴۴ - طبقاتِ اکبری - خواجہ نظام الدین احمد - تصحیح و تنقیح - بی - ڈی - ایم - اے - آئی، سی، ایس - ناشر: ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۵ء -

۴۵ - ظفر نامہ - از شرف الدین علی یزدی - تصحیح و تحشیہ - مولوی محمد الٰہ داد - ناشر: ایشیاٹک سوسائٹی بنگال - مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۸۷ء

۴۶ - قضاء الارب من ذکر علماء النحو و الادب - ذو الفقار احمد - مطبع فیض منبع عالم آگرہ - ۱۳۱۶ھ

۴۷ - کشف الظنون - حاجی خلیفہ - مطبع بہیہ استنبول، ۱۹۴۱ء - ۱۳۶۰ھ -

۴۸ - گلزار ابرار - مصنفہ: محمد غوثی بن حسن بن موسیٰ شطاری - ترجمہ از فضل - مطبع مفید عام آگرہ - ۱۳۲۶ھ

۴۹ - مآثر الکرام - میر غلام علی آزاد بلگرامی - ناشر: مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ لاہور، ۱۹۷۱ء -

۵۰ - مرآتِ سکندری - سکندر بن محمد عرف منجھو ابن اکبر - تصحیح و تنقیح - ڈاکٹر ستیش چندر مصرا و محمد لطف الرحمٰن - جامعہ مہاراجہ سیاجی راؤ بڑودہ - مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی پریس بڑودہ ۱۹۶۱ء -

۵۱۔ ماہنامہ المعارف، کلب روڈ، لاہور۔ شمارہ فروری، ۱۹۶۷ء

۵۲۔ محبوب الوطن تذکرہ سلاطینِ دکن۔ ابو تراب محمد عبد الجبار ملکاپوری۔
مطبع نامی فخر نظامی۔ حیدر آباد (دکن)

۵۳۔ نزہۃ الخواطر۔ جلد ثالث۔ علامہ سید عبد الحی حسنی لکھنوی۔ دائرۃ المعارف
حیدر آباد (دکن) ۱۳۷۱ھ۔ ۱۹۵۱ء۔

۵۴۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے۔ سید صباح الدین
عبد الرحمن۔ دار المصنفین۔ اعظم گڑھ۔

۵۵۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے۔ ناشر: دار المصنفین
اعظم گڑھ۔

اسی مصنّف کے قلم سے

فقہائے ہند (جلد اول)

یہ کتاب پہلی صدی ہجری سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک کے فقہائے ہند کے حالات پر مشتمل ہے اور اس دور میں برصغیر پاک و ہند کے مختلف محدثین و فقہا نے جو علمی کوششیں کیں ، ان کا یہ بہترین مرقع ہے ۔ اس دور کے سلاطین و ملوک اور علمائے کرام کے درمیان جو ربط و تعلق تھا ، اس کی بھی وضاحت کی گئی ہے ۔

الفہرست

یہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور محقق محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق کی تصنیف ہے جو علوم و فنون ، سیر و رجال اور کتب و مصنفین کی مستند تاریخ ہے اور اس موضوع سے متعلق بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی کتابوں ، قرآن مجید ، نزولِ قرآن ، جمعِ قرآن اور اس کے مختلف قراء ، فصاحت و بلاغت ، ادب و انشا ، حدیث و فقہ ، علم نحو ، منطق و فلسفہ ، ریاضی و حساب ، سحر و شعبدہ بازی ، طب اور صنعتِ کیمیا اور ان تمام علوم کے علما و ماہرین ، کے حالات اور تصنیفات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے ۔

برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ

اس میں سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ) سے لے کر سلطان اورنگ زیب عالمگیر (۱۱۱۸ھ) کے عہد تک کی تمام فقہی کاوشوں کا احاطہ کیا گیا ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ برصغیر پاک و ہند علمِ فقہ سے کس طرح روشناس ہوا ۔

فاضل مصنّف نے مقدمۂ کتاب میں فقہ کی تعریف ، اس کی ضرورت و اہمیت اور قرآن و حدیث سے اس کے بنیادی تعلق کی صراحت کی ہے ۔ نیز برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی ابتدا اور قدیم دور کے بعض فقہا کا تذکرہ بھی کیا ہے ۔

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

کلب روڈ ، لاہور

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام (مرحوم) کی تصانیف

آبِ کوثر

اس کتاب میں سرزمین پاک و ہند میں اسلام کی آمد (۷۱۱ء) اور فتحِ سندھ یعنی محمد بن قاسم سے لے کر خاندان لودھی تک (۱۵۲۶ء) کے عہد بعہد حالات بیان کیے گئے ہیں - آٹھ سو سال کے اس طویل عرصے میں برصغیر پاک و ہند میں جو علما و فقہا اور صوفیا و اولیا پیدا ہوئے اور انھوں نے جو خدمات انجام دیں اس کتاب میں ان کا مفصّل تذکرہ ہے - پھر ان ادوار کے ملوک و سلاطین سے ان کے تعلقات و مراسم کی بھی وضاحت کی گئی ہے -

رودِ کوثر

اس میں عہدِ مغلیہ سے لے کر سرزمین برصغیر پاک و ہند پر انگریزوں کے قابض ہونے تک کے واقعات معرضِ تحریر میں لائے گئے ہیں - ہر مغل حکمران کے عہد میں علما و مشائخ اور صوفیا نے جو خدمات انجام دیں اور ان سے جو نتائج برآمد ہوئے ، ان کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں -

موجِ کوثر

اس میں مسلمانانِ برصغیر کی ان علمی اور فکری مساعی کو اُجاگر کیا گیا ہے جو انھوں نے انگریزی حکومت کی گرفت میں آنے کے بعد مختلف انداز میں انجام دیں - اس سلسلے میں حضرت سید احمد شہید اور ان کے رفقائے عظام کی تحریک جہاد ، سید احمد خاں کی تعلیمی کاوشوں ، جامعہ ملیہ کے قیام ، ندوۃ العلما کی تاسیس اور دارالعلوم دیوبند کے علمی کارناموں کو خصوصیت سے بیان کیا گیا ہے - پھر مولانا ابوالکلام آزاد ، مولانا شبلی نعمانی ، علامہ اقبال اور مولانا عبیداللہ سندھی اور دیگر علما و زعما کی علمی تگ و تاز پر روشنی ڈالی گئی ہے -